اِصلاحُ الشیعہ

مولانا محمد حسین ممتاز الافاضل لکھنویؒ

آفاق برادرز اردو بازار لاہور

مصنف

مولانا محمد حسین ممتاز الافاضل لکھنوی (مرحوم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب .... اصلاح الشیعہ

مصنف .... مولانا محمد حسین ممتاز الافاضل لکھنوی

ناشر .... آفاق برادرز اُردو بازار لاہور

مطبع .... ناصر پرنٹنگ پریس لاہور

اشاعت اول .... جولائی 2009ء

قیمت .... 200 روپے

عرضِ ناشر

ادارہ ھذا کی تشکیل کے بنیادی مقاصد میں اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا، عوام الناس کو اسلام کی آفاقیت اور اس کے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے سے روشناس کروانا شامل ہے۔ گذشتہ نو سالوں سے ہم اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ہمیں بہت کامیابیاں حاصل ہوئیں انشاءاللہ جلد ہم اپنی منزل کو پالیں گے۔

دوسروں تک دعوتِ اسلام پہنچانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً اس کارواں میں شامل افراد کی بھی اصلاح کی جائے۔ تاکہ وہ صحیح اسلامی اصولوں کو سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہو سکیں اور انھیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوتا رہے۔ زیرِ نظر کتاب "اصلاح الشیعہ" بھی اسی ضمن کی ایک کڑی ہے۔ کہ جس میں نجابتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ علیہم سلام کو یاد دہانی کے طور پر بنیادی عقائد کو واضح کیا گیا ہے اس کتاب میں بہت نازک اور حساس مسائل کو بھی نہایت احسن طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام کما حقہٗ اس سے استفادہ فرمائیں گے۔

ہماری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ ہم ان کتب کی اشاعت کو اوّلیت دیں جو روزمرہ زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کا تعاون بہر حال ہمیں درکار ہے۔ اُمید ہے کہ اس ادارہ کے فروغ اور علوم محمدؐ و آلِ محمدؐ علیہم سلام کی تشہیر کے لیے دامے درمے سخنے و قلمے ہمارے ساتھ تعاون فرماتے رہیں گے۔ ادارہ بہرحال آپ کا ممنون احسان ہے۔

آپ کی آراء و تجاویز کا منتظر

ادارہ

حصہ اوّل

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ وَاَمِیْنِ وَحْیِہٖ اَشْرَفِ الْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰی خَاتَمِ النَّبِیّٖنَ وَعَلٰی اٰھْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ۔ رَبِّ یَسِّرْ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَتَمِّمْ بِالْخَیْرِ رَبَّکَ نَسْتَعِیْنُ ہ

اصلاح الشیعہ

اصلاح "صَلَاحٌ" سے نکلا ہے۔ صلاح کا معنی ہے درستی، صحیح حالت۔ "عربی لغت کی کتاب المنجد" میں ہے۔ صَلُحَ (باب ف۔ ن) صَلَاحًا، صُلُوْحًا وَصَلَاحِیَةً۔ درست ہونا، ٹھیک ہونا، خرابی کا دور ہونا۔ صلاح کے مقابلہ میں لفظ فساد ہے۔ فَسَدَ (باب ن۔ ض) بگڑ جانا، خراب ہونا۔ لفظ صلاح جس چیز کے متعلق ہو اس کا مطلب یہ ہے کسی چیز کا اپنی طبعی حالت پر کامل ہونا۔

اور فساد کا مطلب ہے کسی چیز کا طبعی حالت پر برقرار نہ رہنا۔ اس میں خرابی و بگاڑ کا پیدا ہو جانا۔ یہ دونوں لفظ مجرد ہیں اور معنی کے لحاظ سے لازم ہیں۔ اور جب یہ دونوں باب افعال کے سانچے میں ڈھل جاتے تو متعدی بن جاتے ہیں۔ صلاح جب اصلاح بن گیا تو معنی ہوا درست کرنا، صحیح کرنا۔ اس سے اس کا اسم فاعل آتا ہے۔ مُصْلِحٌ، اصلاح کرنے والا۔ یہ لفظ باعتبار معنی نہایت عظیم المرتبہ اور رفیع الشان ہے۔ یہی حیاتِ طیبہ کی آن اور یہی پاکیزہ

معاشرہ کی جان ہے اور ہر دور میں اس مسعود و مبارک ہستی کا وجود باعث سلامتی و امان ہے۔ اس کے مقابلہ میں فساد ہے جو باب افعال میں جاکر "افساد" بن جاتا ہے اور متعدی معنی دیتا ہے۔ یعنی خراب کرنا، بگاڑنا۔ اس کا اسم فاعل "مفسد" فساد برپا کرنے والا۔ نہایت نحوست بھرا لفظ ہے اور اسی بدبخت کا ہر دور میں غلبہ رہا ہے۔ اور مادی دنیا میں اس کا سکہ جما ہوا۔ مصلح کا حلقہ اثر محدود ہے۔ جب کہ مفسد کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اور اس کے پاس مادی وسائل بھی ہر آن بکثرت موجود رہتے ہیں۔ اس کی ایک پل کی مذموم حرکت کا اثر مٹانے کے لئے "مصلح" کو برسوں کی محنت درکار ہوتی ہے اور مصلح کی سالہا سال کی کمائی کو یہ مفسد منحوس ایک ساعت میں برباد کر دیتا ہے۔

صلاح و فساد کا تعلق ہر شئے کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ جاندار ہو یا بے جان اجسام ہوں یا اغراض، اعیان ہوں یا معانی و مفاہیم نظریات و عقائد ہوں یا اقوال و اعمال۔

لیکن ہمارا موضوع اس کتاب میں قوم شیعہ کے نظریات و عقائد اور اعمال و مراسم ہیں ہم اپنی قوم کے عقائد اور ان کے اقوال و اعمال کی اصلاح کے لئے یہ سطور تحریر کر رہے ہیں۔

اصلاح کی ضرورت

اصلاح کا مفہوم سمجھانے کے بعد اس کی اہمیت و ضرورت بیان کرتے ہیں۔ کسی چیز کی اصلاح کی ضرورت اس وقت درپیش ہوتی ہے۔ جب وہ اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہی ہو اس میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہو۔ فساد اور خرابی آگئی ہو۔

کسی مرکب اور مجموعہ میں خرابی اس وقت رونما ہوتی ہے جب اس کے اجزاء خراب ہو جائیں یا ان میں باہم تناسب اور ربط نہ رہے اپنے اصلی مقام سے ہٹ جائیں ناکارہ ہو جائیں اپنی افادیت کو کھو بیٹھیں۔ اجزاء کی خرابی مرکب

و مجموعہ کی خرابی کا باعث بنتی ہے۔

قوم افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ بہت سے افراد ایک جماعت گروہ اور قوم کہلاتے ہیں۔ اگر ہر فرد اپنے مقام پر صحیح ہو اور قوم کا جزو ہونے کی حیثیت سے دوسرے افراد کے ساتھ بھی مناسب تعلق اور صحیح ربط رکھے تو ایسے افراد صحیحہ کا مجموعہ یعنی قوم بھی صحیح اور صالح ہو گی۔ اور اگر فرد اپنے مقام پر صحیح نہ ہو نہ خود صحیح ہو اور نہ دوسرے افراد کے ساتھ اس کا رابطہ صحیح ہو تو ایسے افراد پر مشتمل قوم غیر صحیح اور غیر صالح قرار پائے گی۔ جس طرح کسی مشین کی درستی اس کے کل پرزوں کی صحت پر موقوف ہے۔ اسی طرح کسی قوم کی اصلاح اس کے افراد کی اصلاح پر موقوف ہے۔ لہٰذا قوم کے ہر فرد کو یہ سوچنا چاہئے کہ میں صحیح ہوں؟ میں درست ہوں؟ مجھ میں کوئی خرابی و بگاڑ تو نہیں؟ اور اگر کوئی خرابی ہے تو اسے درست کروں اور کیونکر درست کروں میرا اصلی مقام کیا ہے؟ اور مجھے کس طرح رہنا چاہئے؟

جس قوم کے افراد میں ان امور کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ افراد بحیثیت قوم بلند، قابل رشک اور قوموں کی قائد قوم ہوتی ہے۔ اور جس بدنصیب قوم کے افراد بگڑے ہوئے ہوں معرض فساد و خرابی ہوں۔ بیماری کو بیماری اور خرابی کو خرابی نہ سمجھیں اپنا مقام اور اپنا فرض سوچنے سمجھنے سے عاری ہوں ایسے افراد کا مجموعہ پست، ذلیل اور پسماندہ قوم کہلاتی ہے ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا

جس دل میں ہمدردی کا جذبہ موجود ہو اور جس شخص کی طبیعت مائل بکرم ہو وہ کسی ایسی چیز کی خرابی و بربادی نہیں دیکھ سکتا جس کے ساتھ اس کا کسی قسم کا تعلق اور رابطہ ہو۔

کسی مشینری کا خراب ہو جانا۔ کسی آباد زمین کا بنجر بن جانا۔ کسی تندرست کا بیماری کی لپیٹ میں آجانا کسی اہلِ دل کو گوارا نہیں ہوتا۔ اگر اس کا مالک ان

کی اصلاح کیجانب استطاعت رکھتا ہوگا اور صاحب قدرت و اختیار ہوگا تو ضرور ان کی اصلاح کی جانب متوجہ ہوگا اور اگر بے بس ہوگا۔ اختیار و قدرت سے محروم ہوگا۔ تو ان کی ابتری اور بربادی کو حسرت و یاس کی نظر سے دیکھ کر خون کے گھونٹ پی کر اور آنسو بہا کر دعا ضرور مانگے گا۔ درد کی لہر اس کے دل میں اٹھے گی اور مضطرب و بیقرار رہے گا۔

اسی طرح ایک شخص ایک مقام پر بیٹھا ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ ایک نابینا جارہا ہے اور راستے میں ایک گہرا کنواں ہے۔ نابینا محروم بصارت ہے اور کنوئیں میں گر کر ہلاک ہوجائے گا۔ اس شخص کا فرض ہے کہ نابینا شخص کا ہاتھ پکڑ لے اور کنوئیں سے بچالے اگر وہ اس وقت یہ اصلاحی کام کرے گا تو اپنے فرض کو ادا کرنے کے ساتھ لوگوں کی نظروں میں ممدوح قرار پائے گا اور اگر بے حسی اور بیدردی کے سائے تلے خاموش بیٹھا تماشا دیکھتا رہا اور اندھا بے چارہ کنوئیں میں گر کر لقمہ اجل بن گیا تو اس بے حس سنگدل ظالم نے حق معاشرہ اور آنکھوں ایسی نعمت کا شکریہ ادا نہیں کیا اور وہ معاشرہ کا بد ترین فرد قرار پائے گا کم ازکم زبان سے تو رہنمائی کردیتا۔ اسی مضمون کو ایک شاعر اپنے شعر میں یوں ادا کرتا ہے ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

اگر میں دیکھوں کہ ایک اندھا ہے اور اس کے سامنے کنواں ہے۔
اگر میں خاموش بیٹھا رہوں تو یہ ایک گناہ ہے۔

بسا اوقات زمانہ فساد کی زد میں آجاتا ہے اور قومیں زوال اور ذلت کی پستی میں گر پڑتی ہیں۔ اپنے اصل مقام سے ہٹ کر منزل سے دور سیدھی راہ سے بھٹک اور تھک کر چور پاؤں شل اور آنکھیں بے نور ہوجاتی ہیں تو ان کی زندگی برائے نام ہوتی ہے۔ درحقیقت وہ مردہ ہوتی ہیں۔ دل و دماغ سوچنے سمجھنے سے، آنکھیں دیکھنے سے، کان سننے سے معذور ہوجاتے ہیں۔ ایسے میں خالق علیم و حکیم

ان کی اصلاح اور کار آمد زندگی کے لئے ہادی اور رہبر مبعوث فرماتا ہے۔ جن کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کو صحیح راہ پر چلا کر آشنا منزل کریں۔ ان کو اپنے صحیح مقام سے آگاہ کریں۔ عقل و شعور کو بصیرت اور قلب و ذہن کو جلا بخشیں۔ غلط اور صحیح میں پہچان کھوٹے اور کھرے میں تمیز کی میزان قائم کریں، خامیوں سے آگاہ کر کے خوبیوں کی طرف رجحان پیدا کریں۔ اگر افراد اور اقوام میں فساد و خرابی نہ پیدا ہوتی اپنی صحیح حالت پر قائم دائم رہتیں تو اصلاح کی ضرورت نہ پیش آتی۔ مگر مفسد ہر دور اور ہر قوم میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مصلح کم اور مفسد زیادہ ہوتے ہیں۔ اصلاح دشوار اور ناخوشگوار ہے۔ اور افساد و بگاڑ سہل و آسان اور فوری ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ اور عظیم جرم فساد اور بگاڑ پیدا کرنا ہے اور سب سے بڑی نیکی اور بڑی بندگی "اصلاح" ہے۔ اصلاح جتنی بڑی اور بلند خوبی ہے۔ اتنی دشوار ناگوار اور تلخ ہے۔ سب سے بڑا کارنامہ معاشرہ اور قوم کی اصلاح ہے۔ خوشا حال ان رہبرانِ قوم اور بزرگانِ ملّت کا جو نازک حالات اور پر خطر مقامات میں بگڑے ہوئے معاشرہ اور بھٹکی ہوئی قوم کی اصلاح کرتے رہتے تھے۔ سچی ہمدردی اور خلوص کے ساتھ قوم کی بھلائی چاہتے ہیں دشنام طرازی اور سنگ باری کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قوم کی بھنور و گرداب میں مبتلا کشتی کو ساحل صلاح پر پہنچانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور مفسدین کی تیز و تند شرارتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے میدان میں نکل آتے ہیں۔ قوم ان کی برائی چاہتی ہے۔ مگر وہ قوم کی بھلائی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ قوم اُن کو مفسد قرار دیتی ہے حالانکہ یہی قوم کے مصلح اور مخلص ہوتے ہیں۔ یہ قوم کی زندگی چاہتے ہیں۔ اور قوم ان کی موت طلب کرتی ہے۔ مفسدین اپنے میٹھے لفظوں سے قوم کو منزل سے دُور اور شراب غفلت سے مخمور رکھتے ہیں۔ اور مصلحین اپنے تلخ بیانوں سے ان کی بصیرتوں کو پُر انوار اور ان میں آگہی اور شعور کو بیدار کرتے ہیں۔

مفسدین کا کام آسان ہے کہ وہ نشہ آور تقریروں سے ان کو گراتے ہیں اور مصلحین کا کام بہت دشوار ہے کہ یہ حقیقت بیانی سے ان کو سنبھالتے ہیں ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

قوم شیعہ

اس وقت ہمارا موضوع ہے "قوم شیعہ کی اصلاح" نظریات و عقائد میں اقوال و افعال میں تنظیم و ضبط میں، اخلاق و عادات اور مراسم و عبادت میں،

گو یہ موضوع بہت تلخ اور چبھنے والا ہے آزاد طبیعتیں اور شوخ افراد اس سے نفرت کریں گے بلکہ لکھنے والے کو حقارت اور بغض کی نظروں سے دیکھیں گے کیونکہ دستور ہے کہ عام لوگ اپنی مرضی اور طبیعت کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے اگرچہ کہنے والا سچا اور سننے والے غلط ہوں۔ غلط ہونے کے باوجود اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتے اور کہنے والے ہی کو ان کی طعن و تشنیع اور قولِ قبیح کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ تاہم "لومۃ لائم" سے نہ ڈرنے والے اور قدم صدق اور حق بات پر اٹھنے والے اس مادی دنیا میں رہے ہیں۔ گو قلیل تعداد میں رہے لیکن زمانہ اُن سے خالی نہیں رہا وہ کلمہ حق کی ادائیگی اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے رہے۔ اور گالیاں سن سن کے پتھر کھا کھا کے اذیتیں سہہ سہہ کے خلوص دل اور سچی ہمدردی سے نصیحت و اصلاح کا فریضہ ادا کرتے رہے ؎

وہ جفا کرتے رہے اور یہ وفا کرتے رہے
اپنے اپنے فرض کو دونوں ادا کرتے رہے

میں بھی ایسے پیکرانِ وفا، رہنمایانِ رشد و ہدیٰ، سالکانِ جادۂ صدق و صفا ساقیانِ محبت و ولا، ناصحانِ ملت و بیضا، مصلحانِ اہلِ دنیا کی پیروی میں اس وادیٔ پُرخار زار میں قدم رکھتا ہوں۔ اصلاح ایک بہت بڑا عظیم عمل اور شریف

مقصد ہے اور قوم کے ساتھ سچی ہمدردی اور خیر خواہی کا بلند ذریعہ ہے۔

قوم کی زبوں حالی اخلاقی پستی عقائد و اعمال اور تنظیم و رسوم میں بے اعتدالی دکجروی اور غلط خیالی، نظم و ضبط کا فقدان، مخلص اور صحیح قیادت سے حرمان دیکھ کر اصلاح کی ذمہ داری قبول نہ کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور ذہنی صلاحیت کے باوجود قلمی جہاد نہ کرنا جرم عظیم ہے۔

قرآن مجید اور احادیث صحیحہ فریضہ تبلیغ و اصلاح کی اہمیت پر واضح روشنی ڈالتی ہیں اور اس فریضہ کی ادائیگی سے کوتاہی کرنے والوں کی پر زور مذمت کرتی ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ

(سورہ بقرہ) وہ لوگ جو چھپاتے ہیں ان روشن دلیلوں اور ہدایت کو جو ہم نے اُن پر نازل کی ہیں بعد اس کے کہ ہم نے وہ کتاب میں بیان کر دی ہیں خدا ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے لوگ بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔

اصول کافی میں جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے۔ حضور فرماتے ہیں جب میری امت میں بدعات اور منکرات ظاہر ہو جائیں، تو عالمِ دین پر فرض ہے کہ ان کو روکنے کے لئے اپنے علم کا اظہار کرے ورنہ اس پر خدا کی لعنت ہو گی۔

ایک اور حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ میری امت ہمیشہ خیر و عافیت میں رہے گی جب تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا) نیکی پر باہم تعاون کا فریضہ انجام دیتی رہے گی اور جب یہ فریضہ چھوڑ دے گی تو ان سے برکتیں سلب ہو جائیں گی اور وہ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کریں گے۔ آسمان اور زمین میں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خدا کا راستہ اور صالحین کا شیوہ ہیں یہ بہت بڑا فریضہ ہیں جس کیساتھ

فرائض قائم کئے جاتے اور مذاہب مامون و محفوظ رہتے ہیں۔

بسند معتبر جناب امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت شعیا پیغمبر علیہ السلام کو وحی کی کہ میں تمہاری قوم کے چالیس ہزار بدکاروں اور ساٹھ ہزار نیکوکاروں کو ہلاک کرنے والا ہوں۔ جناب شعیا علیہ السلام نے عرض کی پالنے والے نیکوں کو کس وجہ سے ہلاک کرے گا۔ فرمایا کہ انہوں نے گنہگاروں اور بدکاروں کی خوشامد و چاپلوسی کی اور میرے غضب کی وجہ سے ان پر غصہ نہ کیا۔ اور ان کو برائیوں سے روکنے کی کوشش نہ کی۔

دوست اور دشمن میں تمیز

اے قوم شیعہ! اللہ پاک آپ کو دنیا اور آخرت میں باسعادت و باکرامت رکھے۔ کبھی آپ نے سوچا کہ آپ کا دوست کون ہے اور دشمن کون؟

آئیے میں آپ کو ان دونوں کی پہچان کراتا ہوں۔

دوست آپ کا وہ ہے جو آپ کی خیر خواہی کرے آپ کو عذاب قبر اور عذاب جہنم سے بچانے کی کوشش کرے۔ آپ کو خالق کریم کے قریب کرے اس کے غضب اس کی ناراضگی اور اس کی لعنت سے محفوظ رکھے۔

آپ کا دوست وہ ہے جو آپ کو آپ کی خامیوں سے آگاہ کرکے وہ خامیاں دور کرنے کی کوشش کرے اور خوبیوں کی طرف مائل کرکے خوبیوں سے آپ کو آراستہ دیکھنے کی خواہش کرے۔

آپ کا دوست وہ ہے جو آپ کی دین و دنیا کی زندگی سنوارنے کی کوشش کرے۔

آپ کا دوست وہ ہے جو آپ کو رحمت خداوندی اور اس کے انعام واکرام کا مستحق بنائے۔

آپ کا دوست وہ ہے جو آپ کا مال حلال اور پاک کرے اور آپکو پاکیزہ

اور حلال مال کھانے کی ترغیب دے اور حرام خوری سے آپ کو بچائے رکھے۔

آپ کا دوست وہ ہے جو آپ کو معاشرہ میں قابل عزت و ستائش بنا دے کہ لوگ آپ کا تذکرہ مدح و عزت کے ساتھ کریں دنیا میں احترام کی نگاہ سے دیکھیں اور مرنے کے بعد عقیدت کے پھول آپ کی قبر پر نچھاور کریں اور آپ کی موت سے سخت افسوس کریں۔

آپ کا دوست وہ ہے جو آپ کو وقت مرگ خنداں و فرحاں دیکھے۔ قبر کے ہول اور محشر کی سختی سے آزاد دیکھے۔ بہشت کے باغوں میں حور عین کے ساتھ سیر کرتا اور کوثر و تسنیم کے چشموں سے سیراب ہوتے دیکھے۔

اے قوم شیعہ! تمہارا دوست وہ ہے۔ جو تمہیں حقوق بندگان کے بوجھ تلے کراہتا ہوا نہ دیکھے۔ اپنی نصیحتوں اور ہدایتوں سے تمہیں ایسا بنا دے کہ تمہارا جنازہ اُٹھے تو کسی کا حق تمہارے ذمہ نہ ہو۔ مخلوق خدا میں سے کوئی فرد تمہارے مظالم کا فریادی نہ ہو اور مرنے کے بعد زمانہ برسوں تمہیں یاد کر کے روتا رہے۔

اس مقام پر ایک بات سناتا ہوں کہ ایک دفعہ محاذ حسینی قصبہ ساہیوال سے بچی ہوئی رقم کے فیصلہ کے لئے ایک مختصر سی میٹنگ ہوئی جس میں دو چار مقامی رؤسا شریک تھے ان میں جناب میاں سلطان علی ننگیانہ مرحوم و مغفور (اللہ سبحانہ ان کو جوار رحمت و مقام فردوس میں جگہ دے) بھی شامل تھے۔ ایک رئیس صاحب نے ان کے سامنے میرا شکوہ کیا کہ یہ سخت اور تند باتیں کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ان کی (علمائے کرام) سخت اور تند باتیں عذاب قبر اور عذاب آخرت سے بہتر ہیں اگر ان کی ایسی سخت باتوں سے ہم نیک بن جائیں اور برائیاں چھوڑ دیں، تو یہ ہمارے حق میں نہایت ہی بہتر ہے۔ لہٰذا ایسی ناصحانہ تلخ باتیں جن کا انجام شیریں اور ثمر میٹھا ہو اور ایسی میٹھی اور چکنی چپڑی باتوں سے بہتر ہیں جن کا انجام برا اور ثمر تلخ ہو۔

ناظرین کرام! اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت با کرامت رکھے۔ دوست کی علامات

تو آپ نے سن لیں۔ اور امید ہے کہ آپ میرے ہم خیال بن گئے ہوں گے۔ اب دوست نما دشمن کی علامات بھی سن لیں۔

یہ آپ کو علم ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے قرآن مجید میں نیک عقیدہ اور نیک عمل لوگوں کے لئے راحت ابدی جنت کا اور بد عقیدہ اور بد عمل لوگوں کے لئے جہنم کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اور سوائے توبہ و ندامت کے بخشش کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ اور اللہ وعدہ خلافی بھی نہیں کرتا۔

تو جو شخص آپ کا غلط عقیدہ اور بُرا عمل دیکھ کر آپ کو اس سے باز رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ ایسی برائیوں میں مشغول دیکھ کر خوش یا خاموش رہے گویا وہ آپ کو جہنم کے طبقات اور قبر کے ہولناک عذاب میں دیکھنا چاہتا ہے وہ آپ کا دوست نہیں بلکہ دوست نما دشمن ہے۔

آپ غاصب حقوق ہیں، ظالم ہیں، لوگوں کے اموال ظلم و جور سے ضبط کر لیتے ہیں۔ آپ کا کوئی عالم مہربان کوئی دوست رازدان کوئی خطیب خوش بیان یا کوئی ذاکر خوش الحان آپ کو ایسے ناجائز امور سے نہیں روکتا اور ان مظالم میں آپ کی حوصلہ شکنی نہیں کرتا اور آپ کو جہنم کی اس بھڑکتی آگ میں جلتا دیکھ کر خاموش رہ جاتا ہے یا چند جملے خوشامد اور چاپلوسی کے بیان کر کے اپنی جیب نذرانہ کے نوٹوں سے بھر کر چلا جاتا ہے اس نے آپ کی دوستی کا حق ادا نہیں کیا۔ اس نے اپنی خیر خواہی کی ہے آپ کی خیر خواہی نہیں کی، لہذا وہ آپ کا دوست نہیں دوست نما دشمن ہے۔

آپ کا مہربان دوست فقیہ ہو خطیب ہو ذاکر ہو مقرر ہو کوئی ہو آپ کو خوبیوں سے دور اور خامیوں سے بھرپور دیکھتا ہے لیکن وہ آپ کو ان خامیوں اور خرابیوں سے آگاہ نہیں کرتا نہ وہ ان خرابیوں کو آپ سے دُور کرتا ہے اور نہ خوبیوں کی طرف متوجہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ میں خامیاں رکھنا چاہتا ہے اور آپ کو ایسی بُری حالت میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ خوبیوں

سے محروم رکھنا چاہتا ہے وہ آپ کا خیر خواہ نہیں ہے آپ کی بھلائی نہیں چاہتا لہذا وہ آپ کا دوست نہیں ہے۔

جو آپ کے حرام کمانے حرام کھانے حرام میں زندگی بسر کرنے پر راضی ہے اور آپ کی حرام ہی کی کمائی سے نذرانہ وصول کر کے آپ کو اسی حالت میں چھوڑ جاتا ہے اور حرام زندگی سے منع نہیں کرتا اس نے آپ کو شیطان کے جو "عدو مبین" ہے کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی لہذا وہ آپ کا دوست نہیں دوست نما دشمن ہے۔

قرآن پاک میں عمل کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ صرف ایمان لانے پر جنت کا وعدہ نہیں کیا گیا بلکہ ایمان کے ساتھ "عمل صالح" کی شرط و قید بھی لگائی گئی ہے۔ قرآن پاک میں جہاں لفظ "آمَنُوا" ہے وہاں "وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" بھی ہے۔ اور جا بجا "تقویٰ" کا ذکر ہے۔ جنت کا وعدہ اہل تقویٰ و متقین کے ساتھ ہے

لہذا کوئی ذاکر قصیدہ خوان کوئی مقرر شعلہ بیان آپ کو بغیر عمل صالح کے جنت کی خوشخبری دے تو وہ جہالت وضلالت کی وجہ سے خود فریبی وغیراں فریبی کا شکار ہے وہ آپ کو جنت کی نعمتوں اور ابدی آسائشوں سے محروم رکھنا چاہتا ہے اور جہنم کا ایندھن بنانا چاہتا ہے۔ آپ کو غلط رنگ میں خوش کر کے آپ سے نذرانہ اور معاوضہ کی بھاری رقم تو وصول کرے گا۔ اپنی دنیا بنالے گا مگر آپ کی آخرت تباہ کر دے گا آپ کو چکنی چپڑی باتوں سے بہلا کر آپ کا بھاری نقصان کرے گا۔ دنیا کا نقصان معمولی ہے اور آخرت کا نقصان بہت بڑا اور عظیم خسارہ ہے جس کی تلافی بھی ناممکن ہے۔

بہر حال جو شخص کوئی بھی ہو آپ کو برائیوں سے پاک اور نیکیوں سے تابناک نہیں دیکھنا چاہتا اور آپ کی اصلاح اور حقیقی اخروی خیر خواہی نہیں کرتا۔ وہ آپ کا دوست نہیں بلکہ دوست نما دشمن ہے۔

قوم شیعہ کی خصوصیات

قیادت: ہر قوم اپنے قائد سے پہچانی جاتی ہے۔ جس کا قائد بہمہ صفات موصوف اور قیادت کی جملہ خوبیوں سے مزین ہو وہ جو قوم تشکیل دے گا اور جو گروہ بنائے گا وہ بہترین قوم اور بے مثال گروہ ہو گا۔ اس لحاظ سے شیعہ قوم ایک مثالی قوم ہے اور جس کے قائد معصوم خاندان بنی ہاشم اور خانوادہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چشم و چراغ ہیں۔ علم و فضل، مکارم اخلاق، محاسن عادات، معارف و کمالات میں روئے زمین پر کسی ماں نے ایسا فرزند نہیں جنا۔ اور کسی صاحب کمال نے ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کیا لہٰذا قیادت کی حیثیت سے یہ قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے بلکہ دوسری قوموں کو للکار کر کہہ سکتی ہے۔ ہمارے قائدین ایسے قائد پیش کرو۔ بے شک ایک قوم کے قائد بے نظیر ہیں۔

مَضَتِ الدُّهُورُ فَمَا أَتَيْنَ بِمِثْلِهِ

وَلَقَدْ أَتَى فَعَجَزْنَ عَنْ نُظَرَائِهِ

منشور: نصب العین اور منشور کی جامعیت اور عمدگی کی بنا پر قوموں کو سرفرازی و بلندی حاصل ہوتی ہے۔ اس قوم کا منشور کلام خدا اور احادیث چہاردہ معصومین علیہم السلام ہیں۔ گو مسلمانوں کے دوسرے فرقے بھی یہی منشور پیش کرتے ہیں اور قرآن مجید ہی کی اتباع کا دعوے کرتے ہیں مگر قرآن کی آیات کی تفسیر اور تشریح وہ ان زبانوں سے حاصل کرتے ہیں جو خطا و لغزش اور عصیان و نسیان سے پاک نہیں۔ نہ انہیں خدائے پاک کی طرف سے ترجمانی کے فرائض سونپے گئے اور نہ تشریح آیات کی سند ملی۔

لیکن شیعہ قوم نے آئین اسلام اور منشور پاک کی تشریح و تفسیر ان اذہان و اذہان سے حاصل کی جو حصہ ہائے رسالت و اجزائے نبوت ہیں۔ جن کے دماغ عصمت کے خمیر سے وضع کئے گئے اور جن کی زبانیں آپ طہارت سے دھلی ہوئی

ہیں اُن کی تعلیم عین تعلیم رسولؐ ہے اور ان کی ہدایت عین ہدایت نبیؐ ہے اور خدا اور اس کے پیغمبر کی نمائندگی کا شرف ان کو حاصل ہے۔

لہٰذا قیادت اور منشور و نصب العین میں یہ قوم بے مثال اور باکمال ہے۔

جذبۂ جہاد و قربانی: جہاد و قربانی کا درس اس قوم نے اپنے ائمہ علیہم السلام سے عملی طور پر لیا ہے۔ اس لحاظ سے اس قوم کو بجا طور پر ناز ہے کہ اس جذبۂ جہاد و قربانی میں شیعہ قوم کے رہنما عدیم النظیر و فقید المثال ہیں بدر و احد اور خیبر و خندق کے غزوات شیعوں کے قائد اور امام اوّل امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہی کے فتح کردہ ہیں۔ زمانۂ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم میں تمام جنگوں میں فتحیابی اور ہر محاذ میں کامیابی کا سہرا شیعوں کے امام کے سر ہے۔ دوسرے گروہ اس سرمایہ سے تہی دامن ہیں۔ کسی فرقہ کا پیشوا اس منصب جلیلہ پر فائز نظر نہیں آتا اور نہ کسی گروہ کا لیڈر فاتح یا شہید دکھائی دیتا ہے۔ مجاہد کی شان ہے غازی یا شہید ہونا اس شان کے مالک شیعوں کے امام رہے ہیں۔ دوسرے فرقوں کے پیشوا اس شان سے محروم ہیں۔ فضائے اُحد کے اڑتے ہوئے غبار میں لا فتیٰ الا علی کی صدائے غیروں کی نفی اور ان کے ثبات پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

قربانی کے محاذ پر اس قوم نے کبھی شکست نہیں کھائی اور جس قوم میں قربانی کا جذبہ موجود ہو۔ وہ صفحہ ہستی سے کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اس کی موت بامقصد اور اس کی زندگی بابرکت ہوتی ہے۔ حلال جانور اپنی قربانی کی بدولت کٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں ان کی گردنیں زیر خنجر کٹتی ہیں مگر ان کی نسل روز بروز بڑھتی رہتی ہے۔

دانہ خاک میں مل کر اپنا وجود فنا کر دیتا ہے۔ اس کی قربانی سے اسی کے وجود سے ایک کونپل نکلتی ہے جو پودے کی صورت اختیار کر لیتی ہے وہ پودا اس کی قربانی کی حفاظت کرتے ہوئے سینکڑوں دانے مالک کے سپرد کر دیتا ہے۔ ایک دانہ کی قربانی نے سینکڑوں دانے پیدا کئے اس طرح جذبۂ ایثار و قربانی سے سرشار

قوم نے کلمۂ حق کہنے اور تعلیمات ائمہ علیہم السلام کی حفاظت کرتے ہوئے اور میراث سلف صالحین کو سینوں سے لگائے تختۂ دار پر چڑھ گئے۔ نصب العین میں پختگی اور ارادوں میں عزم اس قدر مضبوط تھا کہ سولی پر لٹکتے اور اعضاء بدن کٹتے ہوئے بھی زبانیں اپنے امام کی مدح و ثنا میں تر رہیں۔ ان کی موت بامقصد تھی ان کی موت ان کی افزائش کا پیغام تھی۔ مقصد و نصب العین کی خاطر موت کے اس طرح مشتاق ہوتا ہے۔ تیروں کی نوکوں کے لئے ان کے سینے برہنہ ہو جاتے تھے اور تلواروں کی باڑ کے نیچے ان کی گردنیں خم ہو جایا کرتیں لیکن اپنے پاک خون کے چھینٹوں سے ارض حقانیت کو سیراب اور شجر شیعیت کو شاداب کرتے رہے۔ صحرائے ظلم میں صبر کے قلعوں کو مضبوط اور غارت کے طوفانوں میں نبیوں کی میراث کو محفوظ کرتے رہے۔

جس طرح کی موت آئی ان کی جبینوں پہ شکن نہ لائی مسکراتے ہوئے لبوں کے ساتھ اسے خوش آمدید کہا اور خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ دیواروں میں زندہ چنے گئے تو آہ نہ کھینچی۔ زہر کے پیالے پلائے گئے تو ہچکی نہ لی۔ زندانوں کی تنگیوں و تاریکیوں سے گھبرائے نہیں اور قوکروں کی اذیت سے بلبلائے نہیں حتیٰ کہ موت بھی تعجب کے عالم میں مرنے والوں کے جوش و خروش پر انگشت بدندان و حیران رہ جاتی۔

یہ قوم تلواروں میں پلی اور زندانوں میں پروان چڑھی ہے۔ جس قدر اس قوم کی دشمن طاقتیں اور مخالف حکومتیں گذری ہیں اور کسی قوم کی نہیں ہیں۔ اگر اس قوم میں حق و صداقت اور جذبۂ قربانی نہ ہوتا کبھی کی صفحۂ ہستی سے مٹ گئی ہوتی۔

لیکن چونکہ بنیاد مضبوط ہے۔ جو حق و صدق پر قائم ہے۔ اور جذبۂ قربانی بیدار ہے جو تربیت اور افزائش کا ذمہ دار ہے۔ اس واسطے بڑھتی رہی۔ شہادت کا سبق پڑھتی رہی۔ بام عروج پر چڑھتی رہی۔

ذوقِ سماعت: قوم شیعہ میں ذوق سماعت بدرجۂ کمال موجود ہے کسی مذہب کا کوئی فرقہ اپنی قوم کے مقررین کو اس اشتیاق ومحبت سے نہیں سنتا جس طرح قوم شیعہ سماعت کرتی ہے۔ مجالس ومواعظ میں اس قوم کے زن ومرد بلکہ اطفال خورد سال تک مقام مجلس میں ذوق وشوق سے شریک ہو کر ذاکر وواعظ کا بیان نہایت رجوع سے سنتے ہیں۔ اس طرح تعلیمات اسلام اور فضائل ومصائب محمد وآلِ محمد علیہم السلام سننے کے مواقع انہیں آئے دن میسر آتے رہتے ہیں اور مجالس ومواعظ بہترین مدارس ہیں جب صحیح طور پر برپا ہوں تو درس لینے کے انہیں بہترین مواقع ملتے ہیں۔ ان کے یہ اجتماع دوسری قوموں پر اچھا اثر ڈالتے ہیں اور باہمی میل جول ملاقاتِ احباب دکھ سکھ کی خبرگیری کا بہت اچھا ذریعہ ہیں۔ اگر مجالس اصلاحی تعلیمی اور تبلیغی رنگ میں منعقد ہوں اور سامعین اسی نقطہ نظر سے سماعت کریں تو اس قوم کی نہایت اچھی طرح تربیت ہوتی ہے۔ معلومات کا ذخیرہ فراہم کرنے اخلاق وعادات کی اصلاح کرنے اور محمد وآلِ محمد علیہم السلام کے فضائل ومصائب سن کر اپنے ایمان کو مضبوط اور تازہ کرنے اور بے حد وحساب ثواب کا سرمایہ اکٹھا کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ گھروں کو تالے لگا کر سردی اور گرمی کی تکلیف سے بے پرواہ ہو کر پروانوں کی طرح شمع تقریر کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کسی اور فرقہ کو حاصل نہیں۔ تاہم ذوقِ سماعت کی اصلاح کی ضرورت ہے جو آئندہ صفحات میں بیان کی جائے گی۔

فیاضی: یہ قوم فیاض ہے سخی ہے۔ مالی قربانی میں بھی سب قوموں سے آگے ہے۔ لاکھوں روپے یہ قوم عزاداری جناب سید الشہداء علیہم السلام پر خرچ کرتی ہے۔ ذاکرین کرام اور واعظین عظام کے ٹھاٹھ باٹھ اور کاریں اس قوم کی فیاضی کا بیّن ثبوت ہیں۔ لاکھوں روپے کی عزاخانوں کی عمارتیں اور ان میں قیمتی سامان اسی قوم کی مالی قربانی اور سخاوت کی مثالیں ہیں۔ مسلمانوں کے دیگر فرقے بھی ہیں مگر اپنے مقررین کی عزت واحترام میں اس قوم سے بہت پیچھے ہیں۔

محاذوں کے مواقع پر اس قسم کی قربانی اور زندگی کا ثبوت نمایاں طور پر ملتا ہے۔
خصوصی اپیلوں کے موقع پر نوٹوں کی بارش نظر آتی ہے۔

قوم شیعہ کی یہ چند خصوصیات ہیں جو ہم نے بقدر اختصار بیان کی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قوم جوہر قابل رکھتی ہے۔ اگر اس کی صحیح تربیت کی جائے تو ایک مثالی قوم بن سکتی ہے۔ نہایت زرخیز زمین ہے اگر اس کی صحیح طور پر آبیاری کی جائے تو اچھی فصل دے سکتی ہے۔ پھلتا پھولتا باغ ہے۔ مگر خزاں سے اس کی حفاظت ضروری ہے۔ روشن چراغ ہے مگر تیز ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اصلاحی فانوس ضروری ہے۔

ہر فرد اور ہر قوم میں خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں مگر اصلاحی رہنما اور سچے ہمدرد و رہبر اہ ہوں جو خامیوں کی نشاندہی کرتے جائیں تو خامیاں دور ہو سکتی ہیں۔

تندرست آدمی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں اس واسطے مہربان معالج اور شفیق طبیب مریضوں کو مرض سے آگاہ کر کے انکا ازالہ کرتے رہتے ہیں۔ مریض کو معالج کی ہدایت پر چلنا پڑتا ہے۔ اور کبھی کبھی تلخ و بدمزہ دوا کے گھونٹ پینا پڑتے ہیں جن کا انجام شفائی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مریض کو اپنے مرض سے انکار اور بے بیماری پر اصرار نہ کرنا چاہئے۔ وہ مریض لاعلاج ہو جاتا ہے جو بیمار ہوتے ہوئے اپنے آپ کو تندرست سمجھے جو مہلک مرض کو آسان اور ہدایت طبیب کو ہذیان سمجھے۔

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

اب ہم اپنی پیاری قوم کو ان کی خامیوں سے آگاہ کرنے اور ان کا ازالہ کرنے کی نصیحت کی بحثیں شروع کرتے ہیں۔ اللہ پاک گواہ ہے کہ ہماری نیت نیک ہے ارادہ پاک ہے۔ دل میں خلوص ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری ناصحانہ روش سے بعض حضرات ناراض ہوں مگر جنہیں حق تعالیٰ نے چشم بینا گوش شنوا طبع سلیم اور قلب

فہیم عطا فرمایا ہے۔ ایک ادنیٰ خدمت گزار کی مخلصانہ پیش کش کو فراخدلی سے قبول فرما کر غور و فکر کریں گے۔ مجھے یہ اصلاحی سطور لکھنے کا حق بھی حاصل ہے کہ قبل ازیں میں اس قوم کی تاریخ اور اس کی حق و صداقت کی کہانیاں دین و مذہب کے لئے ان کی قربانیاں اس کے علم و فضل اور ادب و ہنر، اصول و فروع اس کی اشاعت و ترقی پر مشتمل ایک کتاب بنام "تاریخ الشیعہ" قلمبند کر چکا ہوں جسے قوم نے شرف قبول بخشا ہے۔ اب اس قوم کو میں ان خامیوں سے آگاہ کرتا ہوں جو اس میں موجود اور ان خوبیوں سے مطلع کرتا ہوں جو اس میں مفقود ہیں تاکہ یہ جوہر قابل خرابیوں کی کثافت اور گناہوں کے میل سے پاک و صاف ہو کر حسنات کے ہار اور صالحات کے اُجلے لباس زیب تن کر کے اپنے معصوم اماموں اور پاک پیشواؤں کی پاکیزہ جماعت بن کر دیگر قوموں کی پیشوا بن سکے ؎

کیا عجب میری نوا ہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تیری خاک میں ہے

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ۔

اختلاط و آمیزش

کوئی مذہب اس وقت تک خالص اور صحیح رہتا ہے جب تک اس کی اپنی تعلیمات و ہدایات صحیح خالص اور آمیزش سے پاک رہیں۔ مذہب اسلام جب تک وضعی حدیثوں اور غلط تفسیروں سے پاک رہا اس میں فرقے نمودار نہیں ہوئے۔ مذہب اسلام میں فرقوں کی کثرت کے سبب دو ہیں۔

۱۔ قرآن پاک کی ہدایات سند کے لحاظ سے قطعی اور یقینی تھیں یعنی بے شک اللہ پاک کا کلام ہے لیکن معانی پر دلالت اور مفہوم کی وضاحت میں اس وقت غیر یقینی ہو گئی۔ جب ان کے معانی کی وضاحت اور تفسیر ان زبانوں سے نکلنے لگی

جو خطا و نسیان سے معصوم نہ تھیں اور وہ لوگ قرآن فہمی کے اس پایہ تک نہ پہنچے ہوئے تھے کہ ان کی تفسیر کو یقینی مان لیا جائے۔ یہ مقام صرف جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل تھا جن پر قرآن نازل ہوا یا ان کے اہلبیت جو عصمت و طہارت میں اُن کے ساتھ شریک اور علوم و معارف میں ان کے امانت دار اور وارث تھے اور ان پر حضور پاک کو اعتماد تھا اور اسلامی تعلیمات اور تفسیر آیات الٰہی سے حاصل کرنے کی اپنی امت کو وصیت و تاکید فرما گئے تھے۔ جب ان کے مقابلہ میں غیروں کو ان کا مقام دیا گیا یا شامل کیا گیا جو اس کے اہل نہ تھے، قرآنی آیات کی تفسیر اور اسلام کی تعلیم مخلوط ہو گئی۔ ہر مفسر نے اپنے علم و فہم کے مطابق تفسیر و تاویل کی جو غلط ہو سکتی تھی۔ چونکہ تفسیریں اور تعبیریں مختلف تھیں بلکہ متضاد تھیں۔ اس واسطے ان کے ماننے والے بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

۲۔ احادیث مبارکہ کی دلالت قطعی ہے۔ معانی و مطالب ظاہر ہیں۔ واضح ہیں لیکن سند قطعی نہیں غیر یقینی ہے۔ سب احادیث صحیح نہیں اور سب غلط بھی نہیں احادیث سے انکار بھی گمراہی ہے اور سب کی صحت کا اقرار بھی گمراہی احادیث تمام متفق اور متحد بھی نہیں ان میں باہم سخت اختلاف ہے بلکہ تضاد ہے۔ مطابقت بھی ممکن نہیں۔ لہٰذا ہر حدیث کو صحیح نہیں مانا جا سکتا اور ہر فرقہ اپنے مسلک کی بنیاد تفسیر و حدیث کو قرار دیتا ہے۔

لہٰذا فرقوں کی کثرت اور مسالک کا اختلاف غلط تفسیر اور جھوٹی و جعلی حدیثوں کے سبب ہے۔

مذہب شیعہ کے دو پہلو

اس وقت مذہب شیعہ کے دو رُخ ہیں اور وہ دو قسموں میں منقسم ہے ایک قسم وہ ہے جو آج سٹیجوں پر بیان کی جاتی ہے اور دوسری وُہ جو صحیح اور معتبر کتابوں میں مسطور ہے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اور اختلاف شدید ہے۔

جو رخ سٹیجوں پر دکھایا جاتا ہے وہ اور ہے اور جو کتب میں مرقوم ہے وہ اور ہے قوم شیعہ میں ذوق سماعت تو بہت زیادہ ہے لیکن ذوق کتب بینی بہت کم ہے۔ اس وجہ سے جو کچھ سٹیجوں پر بیان کیا جاتا ہے اکثریت اسی کو قبول کئے ہوئے ہے اور کتابوں والے مذہب سے بیگانہ ہے۔ چونکہ کتابی مذہب سٹیجی مذہب سے مختلف ہے اس واسطے جن لوگوں نے سٹیج سے مذہب اخذ کیا ہے وہ کتابی مذہب کو ماننے کیلئے تیار نہیں۔ علاوہ ازیں اس مذہب کی نشر و اشاعت کرنے والے کچھ غیر ذمہ دار پیر اور ملنگ طبقہ بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنے فرضی خیالات و عقائد لوگوں میں پھیلائے اور کتب معتبرہ سے استفادہ نہ کیا اور نہ وہ علم کے اس پایہ پیر تھے کہ اپنے خیالات کی سند اور اعتبار پیش کرتے۔ سادہ لوح عوام نے انہی غیر ذمہ دار افراد کے بیان کئے ہوئے عقائد اور خیالات کو قبول کر لیا اور انہی کو مذہب شیعہ کی اصل تعلیمات سمجھنے لگے۔ بیان کرنے والوں کو احساس ذمہ داری نہ تھا اور سننے والوں کی ذمہ دار علما تک رسائی نہ تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب کو نہایت غلط رنگ میں پیش کیا گیا۔ اور یہ غلط رنگ عوام شیعہ کے دماغوں میں اس قدر جم گیا اور یہ خیالات ان کے ذہنوں میں اتنے پختہ ہو گئے کہ ان کا ازالہ دشوار ہو گیا۔

اب اگر اس مذہب کی کتابی تعلیمات جو صحیح سچی اور اصل ہیں اور سٹیجی مذہب کے برخلاف ہیں۔ پرانے راسخ خیالات کے حامل افراد کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ تو ان کو نہایت سختی سے ٹھکرا دیا جاتا ہے اور پیش کرنے والوں کو گمراہ بے ایمان منکر فضائل قرار دیا جاتا ہے۔ اور کتب معتبرہ جو ہر مذہب کا اصل سرمایہ اور بنیاد ہوتی ہیں سے اعلان بیزاری کیا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے مذہب کی کتب کو ماننے سے انکار کر دیں۔ ایسے لوگوں کے خیالات کو حق بجانب نہیں کہا جا سکتا۔ جب کہ ان کی سند نہ ہو ثبوت نہ ہو ہر گروہ اپنے عقائد و خیالات اپنی رسوم اور عملیات کو اپنے گروہ کے بانی کی طرف منسوب کرتا ہے کہ یہ ہمارے فرقہ کے بانی کی ہدایات ہیں اور ہم ان پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن ہم میں ایک ملنگ طبقہ جو در اصل ہم میں

ملنگ طبقہ: تو نہیں لیکن امام علیہ السلام کی طرف نسبت رکھنے میں ہمارے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ اپنی کسی رسم عمل اور خیال کو امام علیہ السلام کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جو کچھ ملنگوں کے خیالات عقائد رسمیں اور اعمال ہیں۔ کیا وہ ائمہ علیہم السلام سے ماخوذ ہیں؟ کسی ایک امام علیہ السلام نے ان میں سے کسی چیز پر عمل کیا ہے؟ یا اس کا حکم دیا ہے؟

کیا احکام شریعت سے بیزاری، نماز روزہ کا ترک۔ ہاتھوں میں کپڑے پہننا گلے میں پتھروں کے قلاوے۔ بھنگ نوشی، نشہ آور چیزوں کا استعمال چہاردہ معصومین علیہم السلام میں سے کسی کا معمول رہا؟ یا کسی نے ان چیزوں کا حکم دیا۔ اگر ائمہ علیہم السلام سے منقول اور ماخوذ ہیں تو صحیح ثبوت اور صحیح سند درکار ہے ورنہ ملنگ صاحبان ان چیزوں کو ترک کر دیں یا اپنے مسلک کو ائمہ علیہم السلام کی طرف منسوب نہ کریں اور نہ ان کو اپنا امام قرار دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنے مسلک کا بانی ائمہ علیہم السلام کو بنا کر ان کی سخت توہین اور ان کی تذلیل اور تحقیر کا ارتکاب کرتے ہیں۔ انکے خیالات قرآن وحدیث سے آزاد بے اصل وبے بنیاد اور آوارہ ہیں۔ یہ اپنے مسلک کو کسی معصوم امام ونبی کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔

ہر فرقہ کے پاس اس کے بانی کی تعلیمات وہدایات کی کتاب ہوتی ہے لیکن اس فرقہ کے پاس کوئی اس قسم کی کتاب نہیں نہ آئین نہ قوانین نہ کتاب نہ حساب بس آوارگی ہی آوارگی۔ میں ملنگ صاحبان سے یہ گذارش کروں گا کہ آپ سچے حُب دار اور خالص مولائی بننا چاہتے ہیں تو ائمہ علیہم السلام کی صحیح تعلیمات اور ہدایات حاصل کریں ان پر عمل کر کے دین ودنیا کی بھلائیاں حاصل کریں۔ پہلے سچے امام کی معرفت حاصل کریں پھر ان کی صحیح تعلیمات تلاش کریں۔ پھر اُن پر عمل کر کے ان کے سچے پیروکاروں میں شامل ہو جائیں۔ اور یہ آوارگی اور غلط آزادی ترک کر دیں۔ جب انسان اس دنیا میں آتا ہے تو خالق کی طرف سے

کچھ پابندیاں لے کر آتا ہے نرا آزاد نہیں ہوتا۔ ملنگ صاحبان میں آپ کا بہی خواہ ہو کر آپ کی بھلائی کا خواہش مند ہو کر آپ سے نصیحت کی باتیں کر رہا ہوں۔ اور آپ کو غور و فکر کی دعوت دے رہا ہوں۔

کتاب کی اہمیت و ضرورت

ہر مذہب اپنی تعلیمات و ہدایات کتاب کی صورت میں محفوظ رکھتا ہے۔ جو چیز حیطۂ تحریر میں آجاتی محفوظ ہو جاتی ہے۔ اور وہی دستور و احکام کی کتاب مذہب کی زندگی کا سہارا ہوتی ہے۔ کوئی ایسا مذہب کوئی ایسا فرقہ نہیں کہ جس کے بانی کی تعلیمات کتابی صورت میں اس کے پاس موجود و محفوظ نہ ہوں۔ وہ مذہب تمام مذاہب میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے جس کے پاس علمی سرمایہ کتابوں کی صورت میں موجود ہو اور وہ قوم دوسری قوموں پر فوقیت رکھتی ہے جس کے دامن سے علوم کے چشمے اور معارف کے دریا بہیں۔ قومیں دنیا میں بنتی اور مٹتی رہیں مذہب بھی پیدا ہوتے اور مرتے رہے۔ لیکن جس قوم کے پاس علمی سرمایہ ہوتا ہے وہ رہتی اور ترقی کرتی ہے۔ خواہ مادی علوم ہوں یا روحانی۔

کوئی پیغمبر اس وقت تک اپنی قوم میں مبعوث نہیں ہوا جب تک اس کے پاس اس کے رب کی طرف سے کتاب یا کتاب کا حصہ احکام و پیغام کی صورت میں نہیں آیا۔ یا کسی الہامی کتاب کا معلم بن کر آیا ہے یا کسی کتاب کی تعلیمات کا محافظ ہو کر آیا ہے۔ بہر حال یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر نبی کی نبوت اور ہر رسول کی رسالت اور ہر امام کی امامت کا سہارا کتاب خدا ہوتی ہے یا خود اس پر کتاب نازل ہوتی ہے یا کسی نازل شدہ کتاب کا معلم و محافظ ہوتا ہے۔ خود قرآن پاک اس کی اہمیت واضح کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ...

جب اللہ سبحانہ نے نبیوں سے وعدہ لیا میں ضرور تمہیں کچھ کتاب اور حکمت دوں گا۔

اس جگہ تمام انبیاء کا ذکر ہے۔ کلہم اس میثاق میں داخل ہیں اور کلہم کو ان کے مرتبہ کے مطابق کتاب اور حکمت عطا کی گئی۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (سورہ حدید) بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم رہیں۔

اس آیت میں بھی ہر رسول کے ساتھ کتاب کا ذکر ہے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ ؛ سورہ بقرہ۔ رکوع ۲۴) اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب بھی نازل فرمائی۔

اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ ؛ سورہ حدید۔ آیت ۲۶) ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان دونوں کی ذریت میں نبوت اور کتاب رکھی۔

پس معلوم ہوا کہ نبوت اور کتاب لازم و ملزوم ہیں۔ نبی بغیر کتاب کے نہیں آتا اور کتاب بغیر نبی کے یا معصوم کے نہیں رہتی۔

بلکہ خدائے پاک ان لوگوں کی مذمت فرماتا ہے اور ایسے فرقہ کو گمراہ قرار دیتا ہے کہ جس کے پاس علم اور کتاب نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۔ (سورہ لقمان آیت ۱۹) بعض لوگ ایسے ہیں کہ خدا کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر علم و ہدایت کے اور بغیر کسی روشن کتاب کے۔

مذہب اسلام کے پاس اللہ پاک کا کلام کتابی صورت میں قرآن مجید اور جناب خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ احادیث و سنت کی صورت میں کتابوں میں محفوظ ہے۔ اسی طرح شیعہ اثنا عشریہ کے پاس اُن کے مذہب کا سہارا حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام کے فرمودات اقوال اور

اور ان کی سیرت طیبہ کے نمونے کتابوں میں مسطور ہیں موجود ہیں محفوظ ہیں۔ انہی کے سہارے شیعہ من حیث المذہب زندہ ہیں اور انہی کے مطابق ان کے عقائد اور اعمال ہیں۔

احادیث جناب رسالت مآب اور ائمہ معصومین علیہم السلام دراصل کتاب خدا کی تفسیر و تشریح ہیں قرآن مجمل ہے۔ اس کی تفسیر و وضاحت تفصیل و تشریح معصومین کے اقوال و اعمال کرتے ہیں۔ اس لئے جہاں قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا لازمی وہاں احادیث پیغمبر و خلفاء پیغمبر کا ماننا فرض عین ہے۔ اور ان کے اعمال و کردار اور سیرت و گفتار کو مشعل راہ بنانا ان کی پیروی کرنا اور اُن کے مطابق مذہبی زندگی گذارنا بھی ازبس ضروری ہے۔ لہٰذا جس طرح قرآن کا انکار کفر و ضلالت ہے۔ اس طرح کتب احادیث کا انکار بھی کفر و جہالت ہے۔

مَاشَاءَ اللّٰهُ وَبِحَمْدِ اللّٰهِ قرآن مجید کی ائمہ علیہم السلام سے منقول تفسیریں اور انہی حضرات معصومین سے مروی روایات و احادیث کا مذہب شیعہ کے پاس کافی و وافی ذخیرہ موجود ہے۔ جس پر مذہب شیعہ کی بنیاد ہے اور پختہ بنیاد ہے علاوہ ازیں عقائد اور فقہ کے مسائل قرآن و احادیث ہی سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ہمارے عقائد اور ہماری فقہ کی بنیاد بھی قرآن و حدیث پر ہے۔ لہٰذا علماء کرام و فضلاء اعلام کی تصنیف شدہ کتب تفاسیر و احادیث عقائد و فقہ معتبر معتمد اور مستند ہیں انہی کے مطابق شیعہ مذہب زندہ رہا، زندہ ہے اور زندہ رہے گا اسی طرح کوئی مذہب تاریخ سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ گزشتہ انبیاءؑ و امم کے حالات ہمیں کتب تواریخ مہیا کرتی ہیں۔ ملوک و سلاطین اور اقوام و ملل کے حالات کتب تاریخ سے معلوم ہوتے ہیں۔ ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت ان کے واقعات و حالات واقعہ کربلا مظالم و مصائب کے واقعات تاریخ کی کتابوں سے ملتے ہیں

اور تاریخ کے واقعات بھی حضور پاک اور ائمہ اطہار علیہم

الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہیں یا ان سے جن پر ائمہ معصومین کو اعتماد تھا۔

علمائے اسلام رضوان اللہ علیہم : کوئی نبی دنیا سے ہرگز رخصت نہیں ہوتا جب تک اپنے لائے ہوئے دین پھیلائی ہوئی شریعت اور تعلیمات وہدایات کی جامع کتاب کا محافظ و پاسبان مقرر نہ کرلے۔ اذیتوں تکلیفوں سے جو دین پیغمبر اپنی امت تک پہنچاتا ہے۔ اسے بے وارث نہیں چھوڑتا اپنا خلیفہ نامزد کرکے جاتا ہے۔ اسی طرح ہر امام اپنے بعد اس دین اسلام اور شریعت محمدیہ کا معلم و محافظ مقرر کر کے اس دنیا سے رخصت ہوا۔ بغیر جانشین اور بغیر معلم کتاب و محافظ مذہب کے اس دنیا سے چلے جانے کا مطلب ہے۔ دین کو بے یارو مددگار چھوڑ دینا ضائع کردینا نا اہلوں کے سپرد کردینا۔ اس کی پرواہ نہ کرنا۔ لہٰذا ہر امام اپنے بعد آنے والے امام کا تعارف کرا کے گیا اور دین اس کے سپرد کرکے اپنے رب کریم کے پاس جا پہنچا۔

اب بارہویں امام آخری معصوم حجت خدا قائم آل محمد عجل اللہ ظہورہٗ غیبت کبریٰ میں چلے گئے۔

اب میں شیعوں سے پوچھتا ہوں : کہ آپ کے آخری امام بارہویں سرکار امامت دین کو بے وارث چھوڑ کے غیبتِ کبریٰ میں چلے گئے ؟ کیا دین اور شریعت کو کسی کے سپرد کرکے نہیں گئے ؟ کیا یہ امانت کسی امین کے حوالہ نہیں کر گئے ؟ کیا اسلام صرف انہی کے زمانہ تک تھا ؟ کیا ان کے بعد دین ختم ہو گیا ؟ کیا امت کو کتاب خدا اور دین اسلام کی ضرورت نہیں رہی ؟ کیا اسلام صرف دو سو سال کی مدت کے اندر محدود تھا ؟ کیا دین اسلام قیامت تک کے لئے نہیں ہے۔

اسلام کا کوئی فرقہ اس کا قائل نہیں۔ سب کا اتفاق ہے کہ دین قیامت تک رہے گا۔ شیعہ بھی اسی کے قائل ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دین کس کے سہارے چھوڑ گئے ؟ یہ امانت کس کے سپرد کر گئے ؟ اس کا محافظ اور پاسبان کن کو مقرر کر گئے ؟ جن کے سپرد کر کے خود غائب ہوئے اور جن کی حفاظت و نگرانی میں دے

گئے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ سرکار امامت اور حجت معصوم بارہویں امام عجل اللہ ظہورہٗ کے معتمد ہیں ان کے نائب ہیں وہ امین و معتبر ہیں۔ ان پر جناب امام کو اعتبار تھا جب امام پاک کو ان پر اعتماد و اعتبار تھا تو ہم ان کو غیر معتبر کیوں سمجھیں ؟ ہم ان پر اعتماد کیوں نہ کریں ہم ان کے فرمان کو کیوں نہ قبول کریں۔

پس ثابت ہوا کہ ان پر اعتماد خود امام معصوم پر اعتماد ہے اور ان سے انحراف ائمہ علیہم السلام سے انحراف ہے۔ ان کا قبول خود امام کا قبول ہے اور ان کی تردید امام معصوم اور حجت خدا کی تردید ہے۔

اس مضمون و مطلب کو ان دو حدیثوں میں خود امام علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے۔

(۱) امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا ہے : فَاَمَّا مَنْ کَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِنًا لِنَفْسِهٖ حَافِظًا لِدِیْنِهٖ مُخَالِفًا عَلٰی هَوَاهُ مُطِیْعًا لِاَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِ اَنْ یُقَلِّدُوْهُ (احتجاج طبرسی) فقہاء میں سے جو اپنے نفس کو گمراہی سے بچانے والا اپنے دین کی حفاظت کرنے والا خواہشات نفسانی کا مخالف اور اپنے مولا کا فرمانبردار ہو عوام شیعوں کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔

(۲) خود جناب امام آخرالزمان ارشاد فرماتے ہیں : وَاَمَّا الْحَوَادِثُ الْوَاقِعَةُ فَارْجِعُوْا فِیْهَا اِلٰی رُوَاةِ اَحَادِیْثِنَا فَاِنَّهُمْ حُجَّتِیْ عَلَیْکُمْ وَاَنَا حُجَّةُ اللّٰهِ عَلَیْهِمْ (احتجاج طبرسی) میرے بعد واقع ہونے والے امور و حوادث میں اور نئے پیدا ہونے والے مسائل میں ہماری حدیثوں کے بیان کرنے والے علماء کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ میری جانب سے تم پر حجت ہیں اور میں خدا کی جانب سے ان پر حجت ہوں۔

مذہب شیعہ کا صحیح رُخ : ان حدیثوں سے صاف ظاہر ہے کہ بعد از ائمہ طاہرین علیہم السلام دین و شریعت کے وارث مذکورہ صفات کے مالک علماء اعلام رضوان اللہ علیہم ہیں اور انہی کی تصنیف

کی ہوئی کتب مذہب شیعہ کی قلمی تصویریں ہیں۔ اتنے بیان سے ہم نے یہ ثابت کیا ہے۔ کہ مذہب شیعہ وہ ہے جو ان علماء اعلام کی تصنیف شدہ کتب از قسم تفسیر و حدیث عقائد و فقہ اور سیر و تاریخ میں مذکور و محفوظ ہیں۔ اور یہی شیعہ قوم کا مذہبی سرمایہ قومی خزانہ اور دینی ذخیرہ ہیں اور انہی کے مطابق تیرہ سو سال سے مذہب شیعہ چلا آرہا ہے۔ انہی پر اس مذہب کی صداقت کا مدار اور قومی ارتقار کا انحصار رہا ہے۔

ہم نے مذہب شیعہ کے دو رُخ بیان کئے ہیں ایک وہ جو کتابوں میں مسطور ہے۔ دوسرا وہ جو سٹیجوں پر مذکور اور زبانوں پر مشہور ہے۔ ہم نے مذکورہ بالا دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ جو کچھ علماء متقدمین اور سلف صالحین نے کتب معتبرہ اور مستندہ میں رقم فرمایا ہے۔ وہی مذہب شیعہ ہے لہذا سٹیجوں پر جو کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ اگر کتب قدیمہ معتبرہ کے مطابق ہے تو قابل قبول ہے اور اگر اس سے ٹکراتا ہے اور اس کے خلاف ہے تو مردود ہے اور نا قابل تسلیم ہے۔ کیونکہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اگر اس کی کوئی سند نہیں کوئی ثبوت نہیں کوئی اصل نہیں تو کوئی عقلمند اسے کیونکر قبول کرے گا؟ اور کتابیں اس کی تردید کرتی ہیں۔ تو اس کی صداقت کہاں سے ثابت ہو؟

اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا یہ کہ ایسے شعلہ بیانوں اور شیریں لسانوں پر وحی نازل ہوتی ہو ملائکہ انہیں تعلیم دیتے ہوں براہِ راست وہ اللہ تعالے کے شاگرد ہوں۔ یا پبلک کی خوشنودی سامعین سے داد وصول کرنے اور مجلس کامیاب بنانے کے لئے وہ خود ساختہ اور من گھڑت تفسیریں غلط تاویلیں ضعیف وضعی اور بناوٹی روایتیں بیان کرتے ہیں۔

پہلی صورت تو ہر صورت غلط ہے نہ خود قائل ہیں اور نہ غیر قائل تو دوسری صورت قرین قیاس اور قریب ذہن ہے بلکہ لائق تسلیم ہے۔

لہذا ہر شیعہ کا یہ فرض عین ہے کہ مجالس میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے۔

اسے مکمل طور پر قبول نہ فرمالیں بلکہ اس کی سند مانگیں ثبوت پوچھیں کتب کے ساتھ ملائیں اگر کتب ان سنے ہوئے بیانوں کی تصدیق کردیں تو انہیں قبول کرلیں ورنہ بیان کرنے والوں کو وہ سنا ہوا غلط مواد واپس کردیں۔ کانوں کا سنا ہوا دل میں نہ رکھیں۔ ہم آئندہ بیان کریں گے کہ اس وقت شیخ نہایت ہی غیر ذمہ دار اور ناقابل اعتبار ہے۔

ایک اعتراض: کتب شیعہ پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ آخر ان کتب قدیمہ معتبرہ میں بھی تو غلط، وضعی، ضعیف اور خلاف مسلمات شیعہ روایات ہیں۔ ہم انہیں مکمل طور پر کس طرح قبول کرلیں؟ آخر یہ معصوموں کی لکھی ہوئی تو نہیں ان کے لکھنے والوں سے بھی تو غلطیاں سرزد اور خطائیں صادر ہو سکتی ہیں لہذا ہم ان پر مکمل اعتماد کس طرح کر سکتے۔

اس کا حل: ان کا یہ اعتراض سطحی نگاہوں اور ظاہری نظروں میں معقول اور وزنی ہے ہم ان دوستوں اور مہربانوں کو اس کا حل پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اگر نیت حل طلب ہو ارادہ تحقیق کا ہو محض بحث فی جادلم مقصود نہ ہو تو طبیعتیں تسکین پا جائیں گی۔

(۱) اس قسم کی ضعیف اور ناقابل تسلیم و عمل روایات ہر مذہب اور ہر فرقہ میں موجود ہیں۔ جن کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اہل سنت حضرات میں بھی ایسی روایات ہیں اور اہل شیعہ میں بھی۔ مگر نہ ان پر عمل ہے اور نہ انہیں صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔

ایسے علماء محققین گزرے ہیں جنہوں نے درایت و روایت یعنی عقل اور راویان احادیث کے اعتبار و اعتماد کی کسوٹی پر ان کی جانچ پڑتال کی۔ روایات کے راویوں کو دیکھا، حدیث کے مضمون کو پرکھا۔ صحیح، معتبر، موثق، حسن، مرسل، مجہول، ضعیف روایات کا معیار قائم کیا۔ پھر قابل تسلیم اور لائق انکار احادیث و روایات کی تفریق کی۔

میری پیاری قوم کے پیارے افراد! اسمار رجال ایک موضوع ہے جس پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان میں راویانِ احادیث کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں ان کے مذہب ان کی دیانت ان کی علمی قابلیت ان کی ثقاہت (معتبری) ان کی صداقت، کذب بیانی، زہد و تقویٰ، حرص و لالچ، ذاتی مفاد، خواہشات نفسانی سے پرہیز اور ان کی اتباع احافظہ و نسیان وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔

اور پھر اس حدیث و روایت کے مضمون کو قرآن کے آگے پیش کیا گیا ہے۔ اگر قرآن کے مطابق ہو اور راوی بھی معیار پر پورے اترے تو قابل عمل قرار دیا ورنہ ٹھکرا دیا گیا۔

علمائے محققین شیعہ نے جمع شدہ روایات کو مذکورہ معیار پر پرکھا اور اپنی کتب میں امکان بشری کی حد تک ان کی چھان بین کی اور باقاعدہ ان کی تقسیم کی کہ یہ صحیح ہے یہ متواتر ہے یہ حسن کا تلمیح ہے یہ مرسل ہے یہ مجہول ہے یہ موثق ہے یہ ضعیف ہے اور پھر وضاحت کی کہ یہ مقبول ہے اور یہ مردود ہے۔

چنانچہ علامہ مجلسی رحمۃ اللہ نے حدیث کی پہلی کتاب "کافی" کی شرح لکھی ہے۔ جس کا نام "مرآۃ العقول" ہے اس میں ہر حدیث کے متعلق انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ کس قسم کی حدیث ہے۔ چنانچہ انہوں نے کئی احادیث کو ضعیف اور مجہول قرار دیا ہے۔

روایات کی صحت کا معیار ہمارے نزدیک یہ ہے کہ قرآن اور عقل کے خلاف نہ ہو اور راوی سارے سچے اور نسیان سے محفوظ نیک اور دیانت دار ہوں۔ یہ نہیں کہ جو کتب حدیث میں وارد ہو آنکھیں بند کر کے عقل و فہم پر قفل لگا کے بغیر ناقدانہ تبصرہ کے قبول کر لیں۔

انسانی طاقت اور بشری امکان کی حد تک علمائے محققین نے احادیث پر تنقید و تبصرہ کیا ہے اس کے بعد جو صحت و اعتبار کے معیار پر پوری اتری اسے قبول کیا ورنہ رد کر دیا۔ زمانۂ غیر معصوم اور غیبت امام میں اس سے زیادہ اور کچھ

ہو نہیں سکتا اور نہ اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہے۔ اسلام تا قیامت ہے۔ تفسیر و حدیث سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں امام زمانہ تک رسائی نہیں۔ اسلامی زندگی گزارنے کے لئے اس کے سوا قطعاً کوئی اور صورت نہیں۔

ہمیں مفسرین کرام، علماء اعلام و فقہاء عظام و محدثین و مورخین ذوی الاحترام رضوان اللہ علیہم پر اعتماد کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔ زمانہ غیبت میں جب کہ امام معصوم تک رسائی نہیں ان سے بڑھ کر کون ایسا طبقہ ہے۔ جن سے مسائل دینیہ دریافت کریں اور ان کے سوا کون سی ایسی جماعت ہے جن کی طرف دینی امور میں توجہ کریں۔ حکم عقل کے علاوہ جب فرمان معصوم بھی ہے۔

جمع روایات اور تنقید : ہمارے علمائے کرام کا ایک گروہ تو ایسا ہے جس نے نامساعد حالات پر آشوب دور اور تقیہ کے عالم میں روایات جمع کیں۔ حسرت و کلفت کے زمانہ میں جب کہ خوف و خطر کے بادل منڈلاتے رہے۔ تشدد کی آندھیاں چلتی رہیں آزادی کی راحتیں سلب اور قید و بند کی صعوبتیں ہر وقت گرد و پیش رہتی تھیں۔ سفر آسان نہ تھا دور دراز کی مسافت کا کوئی سامان نہ تھا۔ تنگی معیشت تھی ہر منزل پر اذیت تھی۔ تسکین کی فضا معدوم تھی۔ ان صبر آزما حالات میں اور پر ہول ساعات میں ان وارثان انبیاء و ائمہ علیہم السلام نے جہاں گردی کر کے احادیث معصومین کو جمع کیا۔ اس وقت ان کے پیش نظر صرف یہی مقصد تھا کہ جس طرح بن پڑے احادیث کا ذخیرہ جمع کیا جائے اور روایات کا خزانہ فراہم کر کے محفوظ کیا جائے۔ تنقید و تبصرہ کا فریضہ آنے والے علماء کے گروہ کے سپرد کیا جائے کیونکہ پہلے گروہ کو نہ وقت میسر تھا نہ موقع۔

جس طرح کہ پہلے گروہ نے احادیث جمع کرنے کا فریضہ اچھے طریقہ سے انجام دیا۔ یہ نہیں کہ انہوں نے تمام حدیثیں آنکھیں بند کر کے بغیر غور و فکر کے جمع کر لیں انہوں نے بھی سوچ سمجھ سے کام لیا مگر کم۔ ان کی زیادہ تر توجہ جمع کرنے پر رہی۔ اور دوسرے گروہ نے تنقید و تحقیق، جانچ پڑتال کا فرض کما حقہ ادا کر دیا۔

صحیح و غلط قابلِ تسلیم و لائق انکار روایات و احادیث کی وضاحت کر کے یہ دینی خزانہ اور قومی امانت آنے والی شیعہ نسلوں کے لئے کتابوں میں محفوظ کر لی اور یہ مذہبی سرمایہ ضبط تحریر میں لا کر قوم شیعہ کے سپرد کر دیا۔

روایات جمع کرنا اس زمانہ میں نہایت مشکل تھا۔ کتابیں تھی نہیں راویانِ احادیث کے پاس جانا پڑتا تھا۔ اس زمانے کا سفر بھی نہایت دشوار تھا۔ سینکڑوں میلوں طے کرنا پڑتی تھی۔ ان محدثین کرام نے تگ و دو کر کے جہاں سے کوئی حدیث ملی نوٹ کر لی۔ ریگستانوں اور پہاڑوں کے سفر کبھی اونٹ پر کبھی گھوڑے و خچر پر کبھی پیدل۔ پتہ چلا کہ فلاں شہر میں ایک راوی حدیث ہے۔ یہ محدث وہاں پہنچا اس سے حدیث سنی لکھ لی پھر پتہ چلا کہ فلاں شہر میں کوئی آدمی ہے اسے حدیث یاد ہے وہاں پہنچے اس سے حدیث سنی نوٹ کر لی۔ اس طرح مختلف دیار اور متعدد امصار کا رنج و آزار کے ساتھ سفر اختیار کر کے جناب رسالت مآب اور ائمہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات کو جمع کر کے کتابوں کی صورت میں محفوظ کر کے قوم شیعہ کو پیش کیا۔

آج حدیث و تاریخ کی کتاب حاصل کرنا آسان ہے۔ ایک خط لکھ دیا۔ وی، پی، آ گئی۔ پیسے دے کر وصول کر لی اور آرام سے بیٹھ کر پڑھی۔ لیکن کبھی یہ بھی سوچا کہ اس کی تدوین کس طرح ہوئی ؟ یہ احادیث کیسے حاصل کی گئیں؟ کیونکر جمع کی گئیں ؟ محنت کر کے جمع کرنے والوں کو بھی کبھی یاد کیا۔ ان کے لئے کبھی سورہ فاتحہ کے ذریعہ ایصال ثواب کی کوشش کی۔ دعائے مغفرت و رحمت کی بھی کبھی تکلیف گوارا کی ؟

علما متقدمین اور فضلا سابقین کی محنت و کوشش کا ثمرہ ہے جس سے شیعیت کا شجر سرسبز و شاداب ہے اور ان کی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ کتب خانوں کی الماریاں بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ وفادار محبت شعار قومیں ہمیشہ اپنے محسن اسلاف کی یادگار قائم رکھتی ہیں اور عزت و احترام کے ساتھ عقیدت کے تحفے پیش کرتی

ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مذہب کا وہی رُخ اصلی اور صحیح ہے جو کتابوں میں دکھایا گیا ہے۔ سٹیج چونکہ غیر ذمہ دار اور ساقط از اعتبار ہے۔ جیسا کہ آئندہ بحثوں میں تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ اس واسطے سٹیج پر جو رُخ پیش کیا جاتا ہے۔ عموماً کتابوں کے برعکس ہوتا ہے اس واسطے وہ رُخ نازیبا نادرست اور غیر صحیح ہے۔ مذہب شیعہ وہی ہے جو کتب قدیمہ معتبرہ میں مرقوم ہے۔

اگر کوئی شخص ان کتابوں کو تسلیم نہیں کرتا ان کے خلاف ہے ان سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ تو ہم اسے مجبور تو نہیں کر سکتے نہ کوئی دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ نہ اس سے لڑائی کر سکتے ہیں۔ مگر اتنا کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اس شخص کو شیعیت سے کوئی سروکار نہیں اور نہ اسے شیعہ کہلانے کا حق ہے۔ مذہب شیعہ کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں۔ وہ کوئی اور مذہب اختیار کرلے۔ ایسا شخص ذہنی آوارگی کا شکار ہے اور ناجائز آزادی کا دلدادہ ہے۔

انسان کسی مذہب میں داخل ہو تو اس مذہب کی کتب معتبرہ اور اس کی تعلیمات کو قبول کرنا پڑتا ہے اور اس مذہب کی قیود و حدود اور پابندیوں کے اندر رہنا پڑتا ہے۔ اس مذہب کے تعلیمی اثاثہ اور ہدایات کے سرچشمہ سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ اس واسطے جو شخص شیعہ کہلاتا ہے۔ شیعہ مذہب رکھتا ہے اسے شیعہ کتب قدیمہ معتبرہ کے مطابق اعتقاد رکھنا پڑتا ہے اور انہی کے مطابق اعمال کرنے ہوتے ہیں۔

ہاں اگر اس میں علمی استعداد اتنی بلند ہے اور سرمایہ علم اتنا وسیع ہے کہ ثبوت اور دلیل کے ساتھ ان روایات پر تنقید کر سکتا ہے تو یہ اسے حق پہنچتا ہے کہ صحت و ضعف پر بحث کرے لیکن کلیتہً رد کرنے کا اسے کوئی حق نہیں۔

لیکن ایک محروم علم اور جاہل مطلق کا یہ کہنا کہ میں ان کتابوں کو نہیں مانتا مذہب شیعہ کے خلاف بہت بڑی جسارت اور گستاخی ہے اور اپنی جہالت و

ضلالت پر اسے اصرار ہے یا وہ خود امام علیہ السلام سے ملاقات کر کے مسائل دریافت کرتا ہے یا اس پر وحی والہام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی مصلحات کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ خدا ایسے شخص پر رحم کرے اور اسے ہدایت عطا فرمائے۔

کتاب کا معیار: بعض حضرات اپنے من مانے عقائد اور دل پسند روایات کو بعض کتب سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ ایسی کتب کی طرف رجوع کرنے سے پہلے اور اپنے مطالب کو ان سے اخذ کرنے سے قبل اس کتاب کی حیثیت معیار اور اصلیت کو بھی ملاحظہ کریں کہ کتاب حقیقت کے معیار پوری اترتی ہے۔ آیا کتاب معتبر ہے۔ کتابیں تو اور فرقوں کے پاس بھی ہیں وہ بھی کتابیں ہیں۔ لکھی ہوئی چھپی ہوئی ہیں مگر ہم ان سے اپنے عقائد اور اعمال کو اپنے اصول و فروع کو ان غیروں کی کتابوں سے نہیں لیتے اور نہ ان کتابوں کو قبول کرتے ہیں نہ معتبر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے لکھنے والے ہماری نظروں میں معتبر نہیں اسی طرح ہمارے مذہب میں جو حضرات لکھنے والے معتبر نہیں اُن کا علمی پایہ بلند نہیں۔ ان کی صداقت و دیانت یقینی نہیں تو ان کی لکھی ہوئی کتابیں کس طرح معتبر ہو سکتی ہیں۔ جس کی زبان جس کا بیان صحت و صداقت سے خالی ہو اس کا قلم حقیقت آشنا اور اس کی تحریر صداقت پیما کیسے ہو سکتی ہیں جس کی زبان جس کا بیان صحت و صداقت سے خالی ہو اس کا قلم حقیقت آشنا اور اس کی تحریر صداقت پیما کیسے ہو سکتی ہے۔ جب کہ اس کی لکھی ہوئی کتاب علماء اعلام بلند پایہ مصنفین کے خلاف ہو لکھنے والوں کا علمی پایہ اور ان کے پاس دیانت و صدق کا سرمایہ ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں تصنیفات و تالیفات اس وقت تک قابل قبول نہیں جب تک کہ کتب قدیمہ معتبرہ مستندہ ان کی تصدیق نہ کر دیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں لکھنے والا اپنی معلومات کا ذخیرہ کتب قدیمہ سے ہی فراہم کرے گا۔ ان ہی سے استفادہ کرے گا۔ اگر معتبر کتاب سے حوالجات لئے علماء محققین سے مواد اخذ کیا تو اس کی لکھی ہوئی کتاب بے شک معتبر ورنہ پایہ اعتبار سے ساقط تمسک

کے ناقابل اور لائق تسلیم نہیں۔ اسی لئے آج کا مصنف اپنی کتاب میں جو کسی موضوع پر لکھی ہوئی ہو کتب سابقہ معتبرہ کے حوالے دیتا ہے تاکہ پڑھنے والا اسے معتبر سمجھے اور اس کے شکوک وشبہات دور ہو جائیں اور یقین کی دولت سے مالا مال ہو جائے۔

اب ہم اس کتاب میں اغلاط اور آمیزش کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کے ازالہ و اصلاح کی کوشش کرتے ہیں تاکہ شیعہ قوم اپنے مذہب شیعہ کو اصلی اور صحیح شکل میں دیکھ کر اس کے مطابق عقیدہ و عمل قائم کر سکے۔ خالص مذہب کی معرفت حاصل کر کے ان غلطیوں اور ملاوٹوں سے محفوظ رہے جو غیر ذمہ دار جہالت شعار فضلت کردار تحسین و آفرین اور واہ واہ کے محبدار لوگوں کے بیانوں سے اس قوم و مذہب میں راہ پا گئی ہیں۔ مذہب کے محافظین کی کوتاہی سے مذہب کے اندر داخل ہو گئی ہیں اور مذہب کا جزو بن گئی ہیں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ۔

عقائد کی بحث

عقائد۔ عقیدہ کی جمع ہے۔ عقیدہ "عقد" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے "گرہ و پختگی" دماغ میں کوئی ایسا خیال نظریہ اور رائے قائم کرنا جس میں پختگی ہو عقیدہ کہلاتا ہے۔ عقیدہ کا تعلق ہر امر سے ہو سکتا ہے۔ ویسے اصطلاح میں جس رائے اور خیال کا تعلق دین اور مذہب سے ہو وہ عقیدہ اور جس کا تعلق سیاسی قومی اور دیگر امور سے ہو نظریہ کہلاتا ہے۔

اسی سے لفظ "اعتقاد" بنا ہے۔ دینی امور کے بارے میں یقین رکھنا اعتقاد ہے یہ عقیدہ اور اعتقاد حق و باطل دونوں کے متعلق ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ کفار کا بتوں کے متعلق اور اہل اسلام کا توحید کے متعلق ہے۔

دنیوی امور کے متعلق کوئی نظریہ غور و فکر اور تجربات و مشاہدات کے بعد قائم

کیا جاتا ہے۔ اور حالات زمانہ اور تجربات کی بنیاد پر اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے جیسا کہ فلسفیوں، سیاست دانوں اور سائنس دانوں کے نظریات بعد از تحقیق و تجربات بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن اسلامی نظریات جنہیں "عقائد" کہا جاتا ہے اصول دین کے بارے میں لازوال اور غیر متغیر ہیں۔ یعنی توحید، نبوت، امامت، قیامت، ملائکہ، کتب سماوی کے متعلق وہی عقیدہ اب بھی ہے جو ابتداء سے قائم ہوا تھا۔

عقیدہ کا ماخذ: اسلامی عقیدہ کے ماخذ قرآن اور احادیث ہیں اور عقلی تائید توحید نبوت، امامت، قیامت، ملائکہ، کتب سماوی اور ان کے متعلقہ امور کے بارے میں ہر مسلمان کو وہ عقیدہ رکھنا چاہیئے۔ جو قرآن اور حدیث سے ثابت ہو اور رہنمایان اسلام یعنی انبیاء و ائمہ علیہم السلام جس کی تعلیم دیں۔ ایسا عقیدہ رکھنے والا سعادت مند انسان آخرت میں کامیاب ہے وہ عقوبت و سزا سے بچ کر ثواب آخرت اور نعمات الٰہیہ کا حق دار بن سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے عقیدہ ان سے سیکھا ہے جو من جانب خدا ہیں معصوم اور اسلام کے ذمہ دار رہنما ہیں۔ اسلامی عقائد و نظریات کے بارے میں ان سے بڑھ کر اور کوئی قوت و سند نہیں۔

جو شخص اپنا عقیدہ دینی امور کے بارے میں اپنے خیال و قیاس سے وضع کرتا ہے۔ اپنے دل و دماغ کی رہنمائی میں کوئی عقیدہ قائم کرتا ہے یا غیر ذمہ دار افراد شعبدہ باز فریبی و مکار قسم کے لوگ جنہوں نے مذہبی لبادہ اوڑھ رکھا ہو اور انکی تعلیمات قرآن اور حدیث کے خلاف ہوں ان سے عقیدہ حاصل کیا ہو اور قرآن و حدیث اس کی تائید نہ کریں۔ تو ایسا بدنصیب شخص اپنے عقیدہ کا خود ذمہ دار ہے۔ خداوند عالم سے اسے اجر و جزا مانگنے کا کوئی حق نہیں اس کی جزا وہ اپنے آپ سے مانگے یا ضال و مضل مذہبی دوکانداروں مصنوعی و ٹھگ پیروں اور دین فروش مولویوں سے طلب کرے کیونکہ اس کا عقیدہ بنانے والے وہی جعلساز لوگ ہیں جو اپنی دنیا کی خاطر دوسروں کا دین برباد کرتے ہیں اور خالق کی خوشنودی کے بجائے مخلوق کی خوشنودی۔ ایسا فاسد العقیدہ انسان عذاب خداوندی سے بچ نہیں سکتا۔

ایک مشکل اور اس کا حل: آجکل غیبت امام علیہ السلام میں شیعہ کس قدر پریشان ہیں۔ عقائد کی بحث جاری ہے۔ شیعہ قوم دو گروہوں میں بٹ رہی ہے۔ علمار کرام کے بھی دو فرقے ہیں۔ مُوقدین اور غالیین یا عارفین و مقصرین ہر گروہ اپنے کو حق بجانب اور دوسرے کو گمراہ قرار دیتا ہے۔ امام علیہ السلام تک رسائی نہیں۔ علمار پر اعتماد نہیں رہا۔ کتابوں کو عام شیعہ سمجھ نہیں سکتا۔ سٹیج انتہائی غیر ذمہ دار ہو چکی ہے۔ سٹیج مذہب شیعہ کی اشاعت تو کرتی رہی لیکن غیر ذمہ داری کے ساتھ۔

کیا سابقہ عقائد بحال رکھے جائیں: آباؤ اجداد سے جو کچھ سنتے آئے ہیں یا مجالس و محافل میں جو کچھ بیان ہوتا رہا۔ اسی پر قائم رہیں؟ اور ان کے خلاف اگر کچھ کسی عقیدہ کے بارے میں پیش کیا جاوے تو اسے ٹھکرا دیں؟ یہ بھی درست نہیں۔ عقل اور مشاہدہ اس کی تائید نہیں کرتے بلکہ قرآن اس کی تردید کرتا ہے کہ ہر نبی اپنی قوم کے ان سابقہ عقیدوں کو زائل و باطل کرنے کے لئے آیا جو غلط اور مفسد رہنماؤں نے اپنے ذاتی مفاد و وجاہت کے لئے تعلیم کئے تھے۔

معیار حقیقت یہ نہیں کہ قدیمی ہیں اور آباء و اجداد سے آرہے ہیں۔ کیونکہ ہم میں سے اکثر شیعوں کے آباؤ اجداد کا مذہب سُنی تھا اور وہ جعفری نہ تھے بلکہ حنفی و نعمانی تھے۔

اسی طرح جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے آباؤ اجداد کافر و مشرک تھے۔ اگر سابقہ خیالات اور پرانے عقیدوں کو معیار حقیقت قرار دیا جائے تو معاذ اللہ! اصحاب کرام گمراہ اور ان کے آباؤ اجداد حق پر اسی طرح ہم شیعہ گمراہ اور ہمارے سنی آباؤ اجداد حق پر تھے۔ قرآن مجید سابقہ اُمتوں کا قصہ بیان کرتے ہوئے ان کے اسی غلط عقیدہ اور غلط عقیدہ کے قدیمی ہونے کا تذکرہ کرتا ہے۔ اور کفار کی اس دلیل کو باطل کرتا ہے کہ یہ ہمارے

آباؤ اجداد کا پرانا طریقہ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ ٥ (سورہ بقرہ۔ آیت ۱۷۰) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو اس طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو دیکھا۔ اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور نہ وہ راہِ راست پر ہوں۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ٥ وَ کَذٰلِکَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ٥ (سورہ زخرف آیت ۲۱، ۲۲) بلکہ یہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا اور ہم نے اُن کے قدم قدم ٹھیک راہ پر چل رہے ہیں۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ سابقہ عقائد اور پرانے خیالات ہر حال میں غلط ہوں صحیح بھی ہو سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ مدرک اور ماخذ صحیح ہوں صحیح طریقے سے لئے گئے ہوں قرآن و حدیث کے مطابق ہوں۔ مذہب کے ذمہ دار علماء اور معتمد و صحیح ورثا ان کی توثیق و تصدیق کر دیں۔ نئے ہوں یا پرانے مستند اور صحیح ہوں۔

قدیم اور جدید عقائد جب اختلاف کی آماجگاہ بن جائیں۔ عام شخص نہیں سمجھ سکتا ہے کہ قرآن و حدیث کے مطابق ہیں یا مخالف علماء دو گروہوں میں بٹ گئے ہوں۔ جیسا کہ آجکل یہ اختلاف پیدا ہو چکا ہے۔ تو عوام شیعہ اگر اس راہ پر چلنا چاہتے ہیں جو خدائے تعالیٰ رسول پاک اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی بنائی اور بتائی ہوئی ہے اور خوشنودی خالق اور ثواب کا طلب گار ہے نیک نیت ہے خلوص سے دین کا پیرو کار ہے تو ایسے علماء کرام کا دامن پکڑے جو امام علیہ السلام کے بتائے ہوئے معیار پر پورے اُتریں۔

جن کا علمی پایہ بہت بلند ہو۔ کردار بے داغ ہو۔ حریص و طالب دنیا اور

جاہ پسند نہ ہوں۔ زہد و تقویٰ کے بلند درجہ پر فائز ہوں۔ خدا سے ڈرنے والے اور ملامت کرنے والوں کی پرواہ نہ کرنے والے ہوں۔ دروغ گوئی سے پاک اور کلمہ حق ادا کرنے میں بے باک ہوں۔ حق چھپانے والے نہ ہوں۔ سچ کہنے سے گھبرانے والے نہ ہوں ؎

چھاؤں میں تلواروں کی ہم جا کے کہہ آتے تھے حق
غالب آتا تھا نہ ہم پر خوف سلطان و وزیر

ایسے علماء اعلام حق بین حق گو حق شناس حق پرست کا دامن پکڑیں انہی کے فرمودات و تعلیمات کے مطابق مذہبی زندگی از قسم اصول و فروع گزاریں روزِ قیامت عادل کریم اور دربار احکم الحاکمین میں یہ کہہ دیں کہ خالق و مالک غیبتِ معصوم علیہ السلام میں اسلامی تعلیمات اور دینی توضیحات حاصل کرنے کا اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا نہ کوئی اور راستہ تھا۔ امام معصوم علیہ السلام کے فرمان اور عقل کے تقاضا کے مطابق ہم نے ان کی طرف رجوع کیا اور دین و مذہب کی تشریحات ان سے حاصل کیں۔ یہ ایسی حجت ہے کہ جس کا بطلان نہیں اور اس کے حاصل کو کوئی خسران نہیں۔

ہر دور میں مذہب میں بلند پایہ معتمد اور ذمہ دار علماءؒ رہے ہیں جس مذہب میں ذمہ دار علماءؒ و فقہا نہیں وہ مذہب بھی ذمہ دار اور قابل اعتبار نہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں بھی ذمہ دار علماءؒ ہیں اسی طرح ایران و عراق میں بھی ذمہ دار علماءؒ عظام موجود ہیں۔ اگر پاکستان کے شیعوں کو اپنے ملکی علماء پر اعتماد نہیں تو ایران و عراق کے اعلم علماء کرام و جید فضلاء عظام کی طرف رجوع کر کے اس اختلاف کا حل تلاش کریں اور اگر اصلاح چاہتے ہوں تو ان کے فرمان کو بیچون و چرا قبول کر کے اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کر لیں۔ نیت نیک ہو تو کوئی مشکل حل سے محروم نہیں رہتی اور اگر نیت بد ہو تو آسانیوں میں بھی مشکلات پیدا کر لی جاتی ہیں۔ روز قیامت تمہاری طرف سے وہ جواب دہ ہوں گے آپ کو اس بارے

میں کوئی نہ پوچھے گا۔ آپ کی حجت تمام ہو گی ورنہ آپ خود ذمہ دار اور خود ہی جواب دہ ہوں گے۔

توحید

"اللہ سبحانہ، وتعالیٰ کو ذات وصفات اور افعال میں یکتا ولا شریک ماننا"
اسلامی فرقوں میں توحید کے بارے میں شیعہ مذہب سب سے فائق وممتاز ہے۔ اس مذہب نے توحید کی پہچان کی اور اسے خالص رکھنے میں بہت اونچا مقام حاصل کیا۔ کوئی الہامی مذہب توحید کے بارے میں اسلام کے برابر نہیں اور کوئی اسلامی فرقہ اس عقیدہ کے بارے میں شیعہ کے ہم مثل نہیں۔

شیعہ مذہب کے معصوم رہنماؤں بحر معرفت کے غواص عارفوں اور علم لدنی کے حامل اماموں نے اپنے بلیغ بیانوں اور تبلیغی خطبوں میں اللہ سبحانہ، کی وحدانیت اور اس کی ذات وصفات کی احدیت کو نہایت وضاحت وتکرار کے ساتھ پیش کیا ہے دلائل وبراہین کے ساتھ اُسے ذات میں یکتا، صفات میں یکتا اور افعال میں یکتا ثابت کیا ہے۔ اس کے ساتھ کسی قسم کے شرک اور کسی قسم کی برابری کی صاف نفی کی ہے۔ اس کی عظمت وجلالت علو ورفعت اور عیوب ونقائص سے تنزیہ و برأت کو اس شان سے بیان فرمایا ہے کہ عقلمندوں کی لبوب اور عارفین کے قلوب حیران ہو کر پکار اُٹھتے ہیں۔ سبحان اللہ! کہ ان ذوات مقدسہ سے بڑھ کر کسی نے توحید کو پہچانا نہیں اور ان جیسا کسی نے اس کو مانا نہیں اس کی معرفت کرانے کا حق انہوں نے ادا کر دیا۔ سالکین جادہ معرفت ان کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ایسے باکمال اور صاحب کرامت وجلال معصوم ہستیوں کا اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر جبیں سائی کرنا اس کی عظمت وکبریائی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

کسی کاریگر کے کمال کے ثبوت میں اس کی سب سے بلند ایجاد کی ہوئی چیز

پیش کی جاتی ہے۔ جس کی صنعت پر اس کو ناز ہوتا ہے اور کسی ملک کے بلند پایہ صاحبان فن و ہنر اس کے کمال فنی کو مان لیں اور اس کی برتری کا اقرار کریں تو اس کے کمال میں کوئی شبہ نہیں رہتا اور اس کی برتری پایہ یقین پر پہنچ جاتی ہے۔ جس علی و عظیم خالق اور ذوالجلال مالک کو محمد و آل محمد ایسے صاحبان کرامت و عصمت سجدہ کریں اور اس کی بارگاہ میں سر جھکا کر اپنی بندگی کا اقرار کریں اور اس بے مثل و مثال رب بیان کریں۔ اس کی شان کبریائی اور اس کے وجود کی یکتائی میں کیا شبہ رہ جاتا ہے اسی واسطے اس بے مثال کی ربوبیت کا اعلیٰ نمونہ ایسی دعاؤں میں ملتا ہے جن کے آغاز میں آتا ہے۔ "یَارَبِّ مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ" اے محمد و آل محمد کے پروردگار!

دین اسلام کی پہلی اصل توحید ہے اور شیعہ مذہب اس کے خالص سرمایہ سے مالا مال ہے۔ نہج البلاغہ، صحیفہ علویہ اور صحیفہ سجادیہ اس کے مکمل اور بیّن ثبوت ہیں اس کی حفاظت فرض اولین ہے۔

ایک غلطی کا ازالہ: بعض لوگ شیعہ ذاکرین و سامعین اس غلطی کا شکار ہو گئے ہیں کہ جناب ائمہ معصومین خصوصاً پنجتن پاک علیہم السلام اس کی ذات میں تو شریک نہیں مگر صفات میں شریک ہیں۔

انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات حقیقیہ اس کی عین ذات ہیں یعنی وہ ذات پاک ہی صفات حقیقیہ ہیں۔ شیعہ مذہب اور سنی مذہب میں صفات باری تعالیٰ کے بارے میں یہ فرق ہے کہ اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات زائد بر ذات ہیں یعنی ذات کے علاوہ ہیں۔ ذات اور ہے اور صفات اور ہیں لیکن شیعہ خیر البریہ کا اس بارے میں زیر فرامین ائمہ معصومین مسلک یہ ہے کہ ذات خدا اور صفات الگ الگ دو نہیں بلکہ ایک ہی ہیں وہی ذات بھی ہے اور وہی صفات بھی۔ مثلاً عَلِیْمٌ: وہ جب سے ہے علیم ہے، وہ جب سے ہے قدیر ہے وہ جب سے ہے سمیع و بصیر۔ یہ صفات اس کی ذات سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ ہوئیں نہ ہو سکتی ہیں۔

اقسام صفات باری تعالیٰ : مومنین کرام کے ذہن میں آسان پیرائے میں ہم اللہ پاک کی صفات کی قسمیں اور ان کا مفہوم بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اگر مومنین انہیں سمجھ لیں تو کسی قدر معرفت توحید حاصل ہو گی اور شرک کی نفی و تردید میں کوئی الجھن باقی نہ رہے گی۔

حقیقیہ محضہ : یہ صفات باری تعالیٰ ہیں جن کے مفہوم اور واقع و ظاہر ہونے میں غیر کی ضرورت نہیں اور نہ معنی اور تحقق میں غیر کی طرف نسبت کی ضرورت ہے۔ جیسے حیات : زندگی۔ ابدیت : ہمیشہ قائم رہنا۔ وہ حیّ : ابدی ہے۔ کیونکہ اس صفت کا تعلق کسی غیر کے ساتھ نہیں اور نہ اس کا ظہور و وقوع کسی غیر پر منحصر ہے۔

صفات حقیقیہ اضافیہ : یہ وہ حقیقی صفاتِ باری سبحانہٗ ہیں۔ جن کے مفہوم و معنی میں غیر کی طرف نسبت نہیں ہے۔ یعنی جن کا مفہوم و معنی سمجھنا کسی غیر پر موقوف نہیں لیکن ان صفات کا تحقق ظہور اور وقوع غیر پر موقوف ہے۔

ان صفات کا وجود تو قدیمی ہے لیکن ان کے آثار اس وقت ظاہر ہوتے ہیں۔ جب مخلوق وجود میں آئے۔ جیسے علم۔ قدرۃ۔ بے شک یہ قدیمی اور حقیقی ہیں ان کے معنی مفہوم غیروں سے بے نیاز ہیں۔ لیکن ان کا وقوع اور ان کے اثرات کا ظہور اس وقت ہوا جب کوئی معلوم اور مقدور عالم وجود میں آیا۔ بے شک وہ علیم و قدیر تو قدیمی قبل ایجاد خلق تھا لیکن ان دونوں کے اثرات اور ان کا وقوع مخلوق کی ایجاد کے بعد ہوا۔

اضافیہ محضہ : یہ وہ صفات ہیں جن کا مفہوم و معنی اور ان کا ظہور غیر پر موقوف ہے۔ جب تک مخلوق نہ ہو تو اس کا مفہوم ثابت ہوتا ہے اور نہ یہ صفت ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے معیت : قبلیت : ساتھ ہونا، پہلے ہونا : کس کے ساتھ ہونا اور کس سے پہلے ہونا ان دونوں کا مفہوم وقوع اور ظہور مخلوق

پر موقوف ہے۔ مخلوق میں سے کوئی ہوگا۔ جس کے ساتھ ہوگا یا جس سے پہلے ہوگا
اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا : اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنَ
اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا :

صفات حقیقیہ محضہ اور حقیقیہ اضافیہ عین ذات ہیں اور اس وقت سے ہیں جب سے وہ ہے۔ صفات اضافیہ محضہ " نہ عین ذات ہیں اور نہ زائد بر ذات ہیں بلکہ انتزاعیہ ہیں۔ جس طرح کہ صفات حقیقیہ انتزاعیہ ہیں۔

صفات کا تعلق موصوف کے ساتھ دو طرح کا ہے :۔

(۱) انضمام (۲) انتزاع

انضمام : کا معنیٰ ہے کہ صفت کا وجود موصوف کے وجود سے زائد ہوتا ہے گو دونو کا اتحاد اور اتصال ہوتا ہے مگر صفت موصوف کے علاوہ علیحدہ وجود خارجی بھی رکھتی ہے۔ مثلاً سفید دودھ، سبز درخت، سرخ پھول۔ دودھ کا اپنا وجود ہے مگر سفیدی ایک الگ صفت جو اس کے ساتھ قائم ہے۔ اسی طرح درخت کا اپنا ایک مستقل وجود ہے مگر سبزی ایک زائد وجود رکھتی ہے۔ جو خارج میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح پھول کی سرخی : ایسی صفات کو "انضمامیہ" کہتے ہیں جن کو نظر دیکھتی ہے۔ صفت "انتزاعیہ" موصوف کی صفت ہے۔ اس کا خارج میں کوئی وجود نہیں تاکہ موصوف کے ساتھ منضم اور ملا ہوا ہو لیکن موصوف کی پہچان سے ذہن ایک صفت اخذ کرتا ہے اور عقل دریافت کرتی ہے۔ جس طرح کہ چھت کو دیکھنے سے اس کی "بلندی" ذہن میں آتی ہے یا بلندی پر زمین کی "پستی" سمجھ میں آتی ہے۔ بلندی اور پستی دو صفتیں ہیں لیکن ان کا علیحدہ وجود نہیں نہ اپنے موصوف کے ساتھ مل ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی صفت کو صفت انتزاعیہ کہا جاتا ہے۔ لہذا خدائے پاک کی تمام صفات انتزاعیہ ہیں۔ جب عقل خالق کے وجود کو دریافت کرتی ہے۔ اسے کامل بالذات سمجھتی ہے تو تمام صفات کاملہ کا اسے اہل سمجھتی ہے۔ اس کے لئے وہ ثابت کرتی ہے۔ ایسی صفات کو ثبوتیہ کہتے ہیں۔ جو صفات اس کے شایان شان نہیں بلکہ اس کے لئے عیب و نقص

ہیں ان کو اس سے سلب اور نفی کرتی ہے۔ اس واسطے ان کو صفات سلبیہ کہا جاتا ہے۔
پس ذات احدیت اپنی ذات وصفات میں یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں وہ ہر طرح لاشریک ہے۔ نہ ذات میں نہ صفات میں نہ عبادت میں اور نہ اس کے افعال میں اور توحید اسی کی کامل ہے جو اس ذات بے مثال اور اس ہستی لازوال کو ہر لحاظ سے لاشریک سمجھے۔ یہی شیعہ مذہب کا توحید کے متعلق اعتقاد ہے۔ جو ائمہ علیہم السلام کے فرامین سے مستفاد ہے اور یہی خالق و مالک کا ارشاد ہے۔
یہ تو ہے ذات وصفات میں لاشریک ہونے کی بات " اب رہی شرک فی العبادۃ اور شرک فی الافعال ؛ کی بحث تو اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔
تعظیم، توقیر، اللہ کے سوا اور اشخاص واشیاء کی کی جا سکتی ہے۔ لیکن عبادت غیر خدا کی حرام اور شرک ہے۔ تعظیم اور عبادت میں فرق ہے۔ جہاں تعظیم کی آخری حد ختم ہوتی ہے۔ وہاں سے عبادت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ تعظیم ہر اس کی کی جا سکتی ہے جو لائق تعظیم ہو مگر عبادت کے لائق صرف وہ ذات باری تعالیٰ ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اسی بات کا مفہوم کلمہ توحید "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں) ادا کرتا ہے۔

حصہ دوم

شرک فی الافعال

کسی غیر خدا کو خواہ وہ کتنی ہی متبرک مقدس و عظیم ہستی ہو۔ افعال خدا میں شریک ٹھیرانا "شرک فی الافعال" ہے۔ کسی کام میں کسی کو شریک وہ بناتا ہے جو خود اس کام کو تنہا نہ کر سکے اپنی کمزوری کی بنا پر وہ اوروں کو اس کام کی انجام دہی میں شامل کرتا ہے۔

ہمارا خدا کمزور نہیں وہ اکیلا تمام کام سر انجام دے سکتا ہے۔ زمین و آسمان کی پیدائش اور ان میں جاندار و بے جان مخلوق کی آفرینش مرئیات و محسوسات اشیاء کی ایجاد میں کسی غیر کو شامل نہیں کیا اور غیر سے نہ مشورہ لیا کیونکہ مشورہ وہ لیتا ہے جس کی عقل ناقص ہو اور رائے صحیح نہ ہو۔ فعل اور مشورہ میں کسی عظیم ہستی نبی و امام کو شریک خدا بنانا خود خدا کو کمزور ثابت کرنا اور پیغمبر و امام کو خدا کے برابر بنانا ہے جس نے کچھ بھی معرفت توحید حاصل کی اور کچھ بھی عرفان خدا حاصل کیا وہ اس قسم کا مشرکانہ عقیدہ نہیں رکھ سکتا۔

بعض جاہل غیر ذمہ دار فرطِ عقیدت اور بے جا محبت کے جوش و جنون میں کہہ دیتے ہیں کہ ائمہ علیہم السلام آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور کائنات کی تکوین میں شریک خدا ہیں اور قرآن مجید کی اُن آیات مبارکہ سے استدلال کرتے ہیں۔ جہاں لفظ۔ اِنَّا۔ نَحْنُ کے استعمال ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ جمع کے الفاظ ہیں۔ اور خدا "واحد" ہے اس واسطے کہتے ہیں۔ کائنات کے نظام میں کئی وجود شامل ہیں۔ جو خدا کے علاوہ ہیں اور وہ پنجتن پاک علیہم السلام ہیں۔ مثلاً لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۔ وَقُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۔

اَنْزَلْنَا، خَلَقْنَا، نَجَّیْنَا وغیرہ۔ اس قسم کی بودی دلیلیں اخذ کرکے بے چارے سادہ لوح سامعین کو غلط راہ پر لگاتے ہیں اور عقیدہ توحید پر ڈاکہ ڈال کر اپنا دنیوی مفاد حاصل کرتے ہیں۔ ایسے جہلاء اشخاص کو معلوم ہونا چاہیئے کہ خداوند عالم کا طرز تخاطب اور انداز تکلم یہ ہے کہ وہ اپنی عظمت اور کبریائی ظاہر کرنے کے لئے آپ خود جمع کے الفاظ استعمال فرماتا ہے اور بندگان خدا کو حکم دیتا ہے کہ جب تم مجھے پکارو تو واحد کے الفاظ استعمال کرو۔ چنانچہ جب صالحین بندے اسے اپنی دعاؤں اور مناجاتوں میں پکارتے ہیں تو مفرد اور واحد کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ رَبِّ لِیْ۔ اَنْتَ کثیر مقامات پر قرآن پاک میں انبیاءؑ و مرسلین اور بندگان صالحین کی دعائیں مذکور ہیں۔ کوئی ایسا مقام نہیں ملتا جب کسی بندہ نے خواہ وہ معصوم ہو یا غیر معصوم اپنے خطاب میں خدا کو جمع کے لفظ سے پکارا ہو۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قضاء حاجات اور کفایتِ مہمات میں وہ واحد لاشریک ہے۔ اور دعا و فریاد اسی کے لئے مخصوص ہے اور اس بے نیاز آقا کی یہی تعلیم ہے وگرنہ اگر کئی کارساز ہوتے تو وہ اللہ کے ساتھ دعا و مناجات میں شامل ہوتے اور وہاں صیغہ جمع کا آتا۔ خود قرآن پاک میں بعض ایسے مقامات ہیں کہ جہاں حق سبحانہٗ نے اپنی کبریائی اور عظمت کے اظہار کے لئے جمع کے صیغہ میں تکلم فرمایا ہے لیکن وہاں پنجتن پاک علیہم السلام اس کے شریک کار ہرگز مراد نہیں ہو سکتے بلکہ اس امر کی صراحتاً نفی ہوتی ہے۔ مثلاً:
اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ۔ جہاں پروردگار عالم اپنے حبیب پیغمبر کی طرف خطاب فرماتا ہے وہاں بھی جمع کے صیغوں میں خطاب فرماتا ہے۔ خطاب کرنے والا اللہ تبارک و تعالیٰ اور جس کی طرف خطاب ہے وہ ہیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں خدا کے ساتھ کون شامل ہے۔ پیغمبر تو خدا کے ساتھ شامل ہو نہیں سکتے کیونکہ پیغمبر تو خود مخاطب ہیں۔ جب کہ جمع کے صیغے ہیں اور اگر (معاذ اللہ) کوئی شامل ہے تو وہ پیغمبر اقدس سے کوئی برتر شخصیت ہے اور ان سے کوئی افضل ہستی ہے؟ مثلاً اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا سورہ دہر پ۲۹۔

بے شک ہم ہی نے تجھ پر قرآن نازل کیا۔ بتائیں جاہل حضرات! یہاں (ہم نے) میں خدا کے ساتھ کون شامل ہے؟ جو خدا کے ساتھ مل کر پیغمبر پر قرآن نازل کر رہا ہے۔ یقیناً وہ پیغمبر سے افضل ہوگا۔ وہ شریک کار خدا ہوگا (معاذ اللہ)

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا ۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

ہم نے تجھے بھیجا گواہ بنا کر۔ اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر عالمین کے لئے رحمت بنا کر: جناب رسول پاک کو تو بھیجا گیا ہے اور بھیجنے والے جمع کے الفاظ میں ہیں بتائیے حضور! جہلا عظام! یہاں پیغمبر کو خدا کے ساتھ مل کر بھیجنے والے کون ہیں۔ جو رسولِ پاک کو رسالت عطا فرما رہے ہیں۔ یقیناً رسولِ پاک سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ: یقیناً ہم نے تجھے کوثر عطا کیا۔ یہاں بھی جمع کا صیغہ۔ یہاں پیغمبر اسلام کو کوثر عطا کرنے والے کون۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا: یقیناً ہم نے اے رسول تجھے فتح مبین عطا فرمائی ہے۔ یہاں حضور پاک کو فتح مبین بخشنے والے کون شریک خدا ہیں (سورہ فتح)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ (سورہ یوسف) ہم تجھ پر بہترین قصہ بیان کرتے ہیں۔ یہاں بھی جمع کا لفظ ہے۔ قصہ بیان کرنے میں کون شامل ہیں؟ کیا وہ خدا کے سوز خوان ہیں؟

اسی طرح "نُوحِيْ" ہم وحی بھیجتے ہیں۔ کئی مقام پر آیا ہے۔ جمع کا لفظ ہے۔ پیغمبر کی طرف وحی بھیجنے میں کون لوگ شامل و شریک ہیں۔ معاذ اللہ۔ اگر ہیں تو پیغمبر سے افضل ہیں۔ ان آیات کریمہ سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ واحد ہی خطاب فرماتا ہے۔ وہ اکیلا فاعل ہے۔ شایان کبریائی اور عظمت فرمانروائی کے لئے جمع کے الفاظ استعمال فرماتا ہے۔ اور اس کے افعال میں کوئی شریک نہیں۔ جس طرح وہ عبادت میں لاشریک ہے۔ اسی طرح وہ "افعال" میں بھی لاشریک ہے۔ وہ قوی قادر قاہر اور غالب ہے۔ نہ اسے نصیر کی ضرورت

ہے : مشیر کی اور نہ وزیر کی۔
گو کوئی معقول انسان اس قسم کا نہایت واضح غلط عقیدہ تو نہیں رکھتا لیکن سٹیج چونکہ ہر قسم کی ضروری پابندیوں سے آزاد ہے اور سٹیج پر بیان کرنے والوں کی اکثریت غیر ذمہ دار ہے۔ اس واسطے مشقلین، مقررین، جاہلین، سامعین کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں اور یہ بیان بعض جہلا سے میں نے خود سنا ہے اس واسطے تردید واصلاح کے لئے چند سطور حوالہ قلم کی ہیں۔ تاکہ سامعین آئندہ ہوشیار رہیں۔

لفظ "کن" کہنے والا کون ہے : سٹیج و منبر کی آزادی نے ہر بولنے والے کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ جو منہ میں آئے بولتے چلو۔ شیعہ قوم کی سٹیج ہے کوئی پابندی نہیں۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں صرف سامعین کی خوشامد مطلوب ہے۔ واعظین و ذاکرین حضرات جناب چہاردہ معصومین علیہم السلام کی تو حد اعتدال سے بڑھ کر تعریف کرتے ہیں۔ لیکن انبیاء سابقین علیہم السلام حد درجہ توہین کرتے ہیں۔ پھر جب باہم تقابل کرتے ہیں تو ائمہ علیہم السلام کو تو خدائی اختیار سونپ دیتے ہیں۔ انبیاء سابقین کے پاس صرف کاسۂ گدائی رہ جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی ارواح مبارکہ کیا کہتی ہوں گی کہ شیعہ مقررین اور ذاکرین نے ہمیں "فٹ بال" بنا رکھا ہے۔
پنجتن پاک علیہم السلام کی ارواح طیبہ تو بقول ذاکرین و مقررین مجالس میں شریک ہوتی ہیں لیکن انبیاء سابقین علیہم السلام کی ارواح طاہرہ تو سٹیج سے کوسوں دور بھاگتی ہوں گی (معاذ اللہ) محمد وآلِ محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کے فضائل و مناقب بیان کرو لیکن ایسے انداز میں کہ انبیاء سابقہ کی توہین کا پہلو نہ نکلے۔
پنجتن پاک کے فضائل میں سے یہ ایک خود ساختہ غلط خلافِ عقل و نقل فضیلت بیان کی جاتی ہے کہ جن اشیاء کو خدا نے لفظ "کن" سے خلق فرمایا ہے۔ اس لفظ کن کے ادا کرنے والے پنجتن پاک ہیں۔ "استنباطی فضیلت" اس کی وجہ

واعظین و ذاکرین صاحبان یہ بیان کرتے ہیں کہ لفظ کن کہنے کے لئے منہ درکار ہے خدا منہ نہیں رکھتا اس واسطے کائنات سے قبل پنجتن پاک کو پیدا کیا وہ منہ زبان رکھتے ہیں۔ لہٰذا باقی کائنات کی تخلیق کے لئے ارادہ خدا کرتا رہا اور کن یہ کہتے رہے یہ معلوم نہیں کہ یہ سب مل کے کن کہتے یا باری باری" سبحان اللہ کیا استنباطی فضیلت ہے۔ اس ذہنی ایجاد پر کائنات قربان ؎

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیئے

یہ محمد و آل محمد سے سچی محبت نہیں، بلکہ سامعین جاہلین کرام سے داد و تحسین کرنے کی دماغی اپج ہے۔ یہ جملہ شیریں بیان کی تیز زبان سے نکلا۔ جہلاء کرام کی زبانوں سے واہ واہ کے نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ ہاتھ بلند ہو کر ہدیہ تحسین پیش کرنے لگے۔ واہ واہ کیا بات ہے کیسی اونچی بات کہی: سبحان اللہ! سبحان اللہ!!

اب اس بے اصل خلاف عقل منافی نقل "استنباط" کا بطلان ملاحظہ فرمائیں۔ سب سے پہلے تو جناب واعظ نے خدا کو اس قدر عاجز بنا دیا کہ وہ سوائے منہ زبان کے بول نہیں سکتا۔ آنجناب نے خدا کو بشر قیاس کیا ہوگا کہ بشر جب منہ اور زبان کے سوا بات نہیں کر سکتا۔ خدا بھی عاجز و مجبور ہوگا۔ آخر کلام کرنے کے لئے اس نے پنجتن پاک کا سہارا لیا۔ ان کا محتاج ہو گیا۔ ان کی مہربانی ہے کہ خدا کی یہ کمزوری دور کرتے رہے یوں اس کا بھرم رہ گیا۔ صفات ثبوتیہ میں سے اس کی ایک صفت تکلم بھی ہے یعنی متکلم ہے۔ قرآن مجید اس کا کلام ہے۔ معلوم نہیں یہ کلام اس نے کس طرح کیا؟ کیا یہ بھی پنجتن پاک علیہم السلام کا کلام ہے؟ جب کہ بعض مقامات پر خود مخاطب بھی یہی حضرات ہیں خصوصاً جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

دوسری بات یہ ہے کہ خود پنجتن پاک بھی کن کے ذریعہ پیدا ہوئے۔ ان کو پیدا کرنے کے لئے کن کہنے والا کون تھا؟ ان کی پیدائش کیسے ہوئی؟ جب خمسہ

نجبا اصحاب کسا پنجتن پاک کو وہ کن کہہ سکتا ہے اور کن کے ذریعہ پیدا کر سکتا ہے تو باقی مخلوقات کے لئے کن نہیں کہہ سکتا۔ وہ جس چیز سے چاہے کلام پیدا کر سکتا ہے وہ سنگریزوں کو نطق عطا کر سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے درخت میں کلام پیدا کر سکتا ہے۔ وہ منہ اور زبان اور نہ اشخاص کا محتاج ہے۔ اس کے "متکلم" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس چیز سے چاہے بے زبان ہو یا بازبان کلام پیدا کر سکتا ہے۔ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ اس مقام پر تحسین طلبی اور انعام خواہی میں حضرات اہل بیت علیہم السلام کو حد سے بڑھا دیا جو خود ان کو بھی پسند نہیں اور خدا کو گھٹا دیا جو اسے گوارا نہیں۔ کن کہنے کے لئے اس نے کوئی خاص نائب مقرر نہیں کیا۔ بلکہ اس کے کن کہنے کا مطلب یہ ہے وہ ارادہ کرتا ہے جب کسی چیز کی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے وہ چیز وجود میں آجاتی ہے۔ خواہ دفعتہً پیدا ہو جائے یا تدریجاً۔

امور الٰہیہ کی تقسیم

امور خداوندی دو قسموں میں تقسیم ہیں۔ امور تکوینیہ : امور تکلیفیہ۔

امور تکوینیہ :۔ وہ امور جو پیدائش اور پرورش اجسام سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً پیدا کرنا۔ ان کی روزی کے اسباب فراہم کرنا ان کی ضروریات زندگی پیدا کرنا۔ ان کی بیماری، صحت، تنگی و فراخی معیشت سے تعلق رکھنے والے امور، مارنا زندہ رکھنا وغیرہ۔

امور تکلیفیہ :۔ دینی و شرعی امور مثلاً نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ "کرنے کی باتیں جنہیں "اوامر" کہا جاتا اور نہ کرنے کی باتیں جنہیں محرمات و ممنوعات کہتے ہیں۔ ز قسم حلال و حرام، پاک و پلید، فرائض و منہیات (حرام کام) جو معاملات زندگی کو کنٹرول (قابو) کرتے ہیں۔ امور تکلیفیہ کہلاتے ہیں۔ امور تکوینیہ اور امور تکلیفیہ کی وضاحت کے بعد ان کی تقسیم کار کی وضاحت کی جاتی ہے

طریق کار: اس خالق رحیم اور مالک کریم نے ان امور کی انجام دہی اور ان کی تعمیل کا طریقہ اس طرح تقسیم کیا کہ امور تکوینیہ" فرشتوں کے سپرد کئے ہیں اور ان کی انجام دہی کے لئے اس نے فرشتوں کو کارکن مقرر فرمایا۔ فرشتے اس کے امر کے پابند ہوتے ہیں وہ جب کہے جس طرح کہے جتنا کہے۔ فرشتے اس کی صرف تعمیل کرنے کے پابند ہیں۔ اپنی طرف سے گھٹا بڑھا نہیں سکتے اور نہ اس میں کوئی مداخلت کر سکتے ہیں۔ فرمان اس کا ہوتا ہے تعمیل ان کی ہوتی ہے۔ قادر مختار اور حاکم کل وہ خالق قدیر ہے۔ فرشتوں کی حیثیت تو محض ایک وفادار نوکر کی سی ہے اس معاملہ میں ملک الموت ناحق کوسا جاتا ہے۔ اور وہ لوگوں کا ہدف ملامت بنا ہوا ہے۔ بقول میر تقی مرحوم کے یہی کہتا ہوگا ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ سورہ انبیا آیت ۲۶۔
انہوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن کی تو اولاد ہے۔ اللہ اولاد سے پاک ہے بلکہ وہ (جو کفار اس کی طرف منسوب کرتے ہیں) تو اس کے بزرگ اور صاحب عزت بندے ہیں کسی بات میں وہ اس پر سبقت نہیں کرتے اس کے حکم سے پہلے کوئی بات نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ کفار مشرکین کہتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ ان کی تردید میں یہ آیت نازل فرمائی کہ خدا اولاد سے پاک ہے فرشتے تو اس کے وفادار بندے اور نوکر ہیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے:۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں رہتے ہیں اور جو زمین میں چلتے پھرتے ہیں اور وہ فرشتے اس کے کسی حکم سے سرکشی نہیں

کرتے اور اپنے پروردگار سے جو ان سے اعلیٰ ہے ڈرتے ہیں اور جس چیز کا انہیں حکم دیا جاتا ہے بجا لاتے ہیں (سورہ نحل، آیت ۵۱ء۵۲)

امور تکلیفیہ: دینی و شرعی امور از قسم عبادات، معاملات، کاروبار، بیع و سزا عقود، نکاح و معاہدے و ایقاعات از قسم طلاق وغیرہ۔ حقوق اللہ و حقوق الناس کی تشریح و تعمیل ان امور کو خداوند متعال نے انبیاء و اوصیاء رُسُل و ائمہ طاہرین صلوٰۃ اللہ وسلامہٗ علیہم اجمعین کے سپرد فرمایا ہے۔

ان امور کا بھی مالک مطلق اور حاکم کل اللہ تعالیٰ ہے۔ احکام وہ بھیجتا ہے اور بندوں تک یہ پہنچاتے ہیں۔ اس کی طرف سے بندوں کو احکام کی تبلیغ بھی کرتے ہیں اور خود ان پر عمل پیرا ہو کر عملی نمونہ بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ احکام انبیاء و مرسلین خود نہیں وضع کرتے نہ ان میں کمی بیشی کرتے ہیں اور نہ کمی بیشی کے یہ مجاز ہیں بلکہ جوں کے توں اوامر و نواہی اس کے فرمانبردار ہو کر بندوں کو پہنچاتے ہیں اسی واسطے ان کو پیغام بر (پیغام پہنچانے والا) اور رسول (قاصد) کہتے ہیں۔

ہاں اپنے فرائض منصبی میں دیانت دار ہوتے ہیں اور خداوند عالم کو ان پر اعتماد ہوتا ہے۔ پاکیزہ فطرت پاکیزہ نسل اور فکر و عمل میں معصوم ہوتے ہیں جس طرح کہ فرشتے امور تکوینیہ کی انجام دہی میں معصوم اور دیانتدار و فرمانبردار ہوتے ہیں۔

یہ ہے نظام عالم کی تقسیم کار، فعال مطلق اور قادر مطلق خود اللہ تعالیٰ ہے امور تکوینیہ فرشتوں کے ذریعہ اور امور تکلیفیہ انبیاء و اوصیاء کے ذریعہ کراتا ہے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:-

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (سورہ بقرہ رکوع ۲۶)

تمام لوگ ایک امت تھے پس خدا نے انبیاء بھیجے جو جنت کی خوشخبری دینے والے اور عذاب جہنم سے ڈرانے والے تھے۔ اور ان کے ہمراہ حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی تاکہ لوگوں کے باہمی اختلاف میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے۔

هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۔ وہ اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کرے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۔ ہم نے ان کو پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے ان کی طرف امور خیر اور نماز قائم کرنے زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہمارے عبادت گذار تھے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔ وہ اللہ وہ ہے جس نے ان پڑھوں میں ان میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر آیات خدا کی تلاوت کرتا ان کو پاک کرتا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا تھا۔ (سورہ جمعہ پارہ ۲۸)

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا ۔

وجہ تفویض: امور الٰہیہ کی تقسیم اور تفویض کے بعد ہم ہر ایک تفویض کی علت اور حکمت بیان کرتے ہیں کہ امور تکوینیہ فرشتوں کے اور امور تکلیفیہ شرعیہ انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے سپرد کیوں ہوئے ہیں ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

امور تکلیفیہ، امور تکوینیہ سے افضل اور اشرف ہیں اس واسطے ان کو انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے سپرد فرمایا جو خود ملائکہ کرام سے افضل اور اشرف ہیں اور امور تکوینیہ امور تکلیفیہ سے کم درجہ رکھتے ہیں، فضل و شرف میں کمتر ہیں لہٰذا یہ ملائکہ کی تحویل میں دیئے گئے۔

وجہ اشرفیت امور تکلیفیہ: امور تکوینیہ۔ از قسم اسباب رزق و معیشت موت و حیات، دکھ سکھ، بدنوں میں جان ڈالنا قبض

ارواح وغیرہ ابدان و اجسام سے تعلق رکھتے ہیں اور تربیت ابدان کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اور امور شرعیہ روحوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ارواح کی تربیت کا سبب بنتے ہیں۔ روح چونکہ بدن سے افضل اور اشرف ہے لہذا اس کے متعلق امور بھی بدن سے متعلق امور سے افضل و اشرف ہیں۔

امور تکوینیہ میں انسان کی خدمت اور نوکری ہے۔ اس لحاظ سے امور تکوینیہ انجام دینے والے فرشتے انسان کے ایک طرح کے خادم اور نوکر ہیں اور نظام عالم چلانے والے خدائی کارندے ہیں۔

امور شرعیہ انجام دینے میں ہدایت اور رہبری ہے اس لحاظ سے امور شرعیہ کے محافظ انسان کے ہادی اور رہبر ہیں۔ ہادی اور رہبر افضل ہوتا ہے۔ اگر امور تکوینیہ انبیاء و ائمہ کے ہاتھ میں ہوتے تو یہ عام انسانوں کے خادم اور نوکر قرار پاتے اور انسان ان کے مخدوم ہوتے اور پھر عام انسانوں سے افضل نہ ہوتے۔

امور تکوینیہ انجام دینے والے انسان کی مادی زندگی کے برقرار رکھنے کے ناظم ہیں اور امور شرعیہ انجام دینے والے انسان کی روحانی زندگی کی بقاء و ارتقاء کے ذمہ دار ہیں۔

فرشتے مادی خوراک اور فانی غذا کے اسباب مہیا کرتے ہیں۔ اور انبیاء و ائمہ علیہم السلام انسان کی معلمی کے فرائض انجام دیتے ہیں، وہ انسان کو تعلیم دیتے ہیں۔ وہ انسان کو تعلیم دیتے ہیں ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں۔ ان کے بدنوں کو پاک کرتے ان کے دلوں کو روشن اور صاف کرتے ہیں۔ لہذا غذا پہنچانے والے نوکر اور پاکیزہ کردار معلم کا مقام و مرتبہ ایک جیسا نہیں۔

ملائکہ انسانوں کے خدمت گزار اور نظام عالم چلانے کے ذمہ دار ہیں جب کہ انبیاء و ائمہ انسانوں کے نہیں بلکہ دین و شریعت کے خدمت گار انسانوں کے رہبر معلم ہادی روحانی حاکم و سردار ہیں۔

ملائکہ انسان کی اس دنیا کا انتظام کرتے ہیں جو عارضی محدود اور ناپائیدار

ہے اور انبیاء و ائمہ انسان کو اس زندگی کے لئے تیار کرتے ہیں جو مستقل غیر محدود دائمی و پائدار ہے۔

امور تکوینیہ میں نمونہ عمل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیوں وہاں تعلیم و ہدایت نہیں اس واسطے خالق حکیم نے ان کو منتخب کیا جن کے مادی اجسام و اعضاً نہیں۔

اور امور تکلیفیہ شرعیہ کی حفاظت و تبلیغ کے لئے ان کو منتخب فرمایا جو پاکیزہ اجسام اور پاکیزہ مادی اعضاء بھی رکھتے ہیں اور جنس انسان سے بھی تعلق رکھتے ہیں تاکہ تمام امور شرعیہ اور معاشرتی تمدنی اقتصادی انفرادی اور اجتماعی نظام میں نوع انسان کو درس تعلیم بھی دے سکیں اور خود احکام الہٰیہ اور قوانین و ضوابط پر عمل پیرا ہو کر ان کو عملی نمونہ بھی پیش کر سکیں۔ انہی میں رہ کر انہی میں پل کر ان جیسا بن کر ان کو ہدایات دیں۔ ان کو دین سکھائیں اور ان ہدایات پر عمل کر کے ان جیسی معاشرتی و تمدنی زندگی اہل و عیال کے ساتھ بسر کر کے اور دنیا کے مختلف پیشے اختیار کر کے انسانوں کو سیرت کے عملی گوشے پیش کریں یہ بات فرشتوں کے لئے ممکن نہ تھی۔ اس واسطے فرشتوں کو امور تکوینیہ پر مؤکل فرمایا اور انبیاءؑ و ائمہ علیہم السلام کو امور تکلیفیہ شرعیہ کی تبلیغ و تعمیل پر مامور فرمایا یہ خالق علیم اور مالک حکیم کی تقسیم کار ہے۔ دونوں گروہ ملائکہ اور انبیاءؑ و اوصیاء اس کے کارکن اور نوکر ہیں۔ دونوں "عباد مکرمین" اس کے شریک در افعال نہیں وہ اپنے امور میں فعال مطلق ہے۔ نہ اس کا کوئی شریک نہ وزیر اور نہ کوئی مشیر ہے۔

وحدت فی الذات وحدت فی الصفات وحدت فی العبادت اور وحدت فی الافعال کی اس سے زیادہ تشریح نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اس مضمون کو پڑھ لینے کے بعد کسی شیعہ بلکہ مسلمان کو شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔

روحانی تصرف: گو امور تکوینیہ کی انجام دہی ان کے فرائض میں نہیں تاہم اپنے روحانی کمال اور نورانی جلال صفائے باطن قلب منور

قرب الٰہی کی وجہ سے کائنات خداوندی میں باذنِ خدا وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو کرنا چاہیں وہ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں جسے دیکھنا چاہیں وہ سب کچھ جان سکتے ہیں جو جاننا چاہیں۔ ہر اس مقام پر پہنچ سکتے ہیں جہاں پہنچنا چاہیں اور ہر اس چیز کو اپنے پاس منگوا سکتے ہیں جسے منگوانا چاہیں۔ خواہ آسمانوں کی بلندیوں میں ہو یا زمین کے طبقات کی پستیوں میں پہاڑوں کی غاروں میں یا سمندروں کی تہوں میں ہر جگہ اپنے روحانی تصرف کا کمال، سیرت باطن کا جمال اور نورانی طاقت کا جلال دکھا سکتے ہیں باذن اللہ کرتے ہیں اور جب اور جہاں مناسب سمجھیں حسب مصلحت اس قسم کے کمال دکھاتے ہیں۔ بوقت ضرورت یہ سب کچھ کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں مگر عام زندگی وہ دستور اور معمول زمانہ کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔

جذبۂ محبت اور قوم شیعہ

شیعہ قوم کو اپنے ائمہ علیہم السلام سے شدید محبت اور انتہائی عقیدت ہے۔ یہ ایک فطری عمل اور لازمی بات ہے کیونکہ اطاعت سے پہلے محبت ضروری ہے جس سے انس و محبت نہیں جس ذات کے ساتھ عقیدت و الفت نہیں اس کو رہبر و پیشوا ماننے سے کیا حاصل؟ عقیدت و محبت ہی بنیادی چیز ہے اور یہی معتقد اور محب کو اپنے محبوب رہنما اور نجات دہندہ پیشوا کی اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔

کسی قوم اور کسی فرقہ کو اپنے پیشوا سے اتنی محبت و عقیدت نہیں جتنی شیعہ قوم کو اپنے معصوم رہنماؤں اور پاک پیشواؤں سے ہے۔

ہر خوشی و غمی میں ان کو یاد کرتے ہیں ہر مشکل اور دشواری میں ان کا نام لیتے ان کا سہارا لے کر بارگاہِ رب العزت میں انہی کے توسل سے نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ ان کے ناموں کی نیاز دیتے ہیں۔ جہاں چہاردہ معصومین کا نام آئے تو عقیدت و محبت سے ان پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے ان کا نام لیتے ہیں۔

یہ عقیدت ہی تو ہے کہ جا بجا ان کی محافل و مجالس قائم کی جاتی ہیں کون

سا شہر اور کون سا قصبہ یا گاؤں ہے جہاں علمدار سپاہ حسینی کا علم لہراتا نظر نہ آئے یا امام مظلوم کے نام کی عمارت بنام "امام بارگاہ" دکھائی نہ دے۔

کسی قریہ میں اگر ایک گھر بھی محب علی اور عزادار حسین کا ہے تو وہ بھی مجلس کا اہتمام کرتا ہے۔ بسا اوقات لڑائی جھگڑے تک نوبت آجاتی ہے۔ مگر وہ مولا شبیر کا فدائی قربانی اور ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ میری جان عزت اولاد مال و متاع قربان ہو جائے مگر میرے مولا کا نام زندہ رہے ان کے کارنامے پائندہ رہیں۔ ان کی یاد تازہ ہوتی رہے۔ مجالس و جلوس کی کثرت اس قوم کی زندگی بیداری اور حب داری کی تصویر ہے۔ اپنے بچوں کے نام اپنے ائمہ اطہار اور بچیوں کے نام مستورات خاندان محمد و علی کے نام پر محبت و عقیدت کی بناء پر رکھتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر محبت کا اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ جب شیعہ فرطِ عقیدت اور جنون محبت میں ائمہ علیہم السلام کو حد سے بڑھا کر خدائی مقام پر لے جاتے ہیں۔ اور ان کے اپنے شیعہ علمائے کرام ان کو غلو اور تجاوز حد سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو جوش محبت میں راست باز علماء کو بھی دشنام طراز یوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کو دشمن اہل بیت وہابی مقصر کے القاب سے نوازتے ہیں اور نفرت کے جذبات مختلف صورتوں میں پیش کرتے ہیں ؎

کر رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

بہر حال اس قوم کو اپنے ائمہ اطہار سے بے پناہ محبت اور بے حد الفت و عقیدت ہے۔

جذبات کو قابو میں رکھنا ضروری ہے: خالق حکیم نے نفس بشری میں متعدد جذبات ودیعت فرمائے ہیں۔ نہ تو وہ بالکل مٹانے اور کچلنے کے لائق ہیں اور نہ انہیں مطلق بے قابو چھوڑ دیا جائے

انہیں حدود کے اندر اعتدال پر رکھنے کے لئے مذہب اور عقل کا پہرہ لگا دیا گیا ہے نہ تو انہیں معطل رکھنے اور کچلنے کی ہدایت ہے ورنہ خالق حکیم انہیں بدن حیوانی اور جسم انسانی میں پیدا نہ کرتا اور نہ انہیں آزاد چھوڑا گیا ہے کہ اپنا ہر تقاضا پورا کریں۔ مطلق آزادی کی صورت میں تباہی اور فساد کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس واسطے ان کو پابند حدود رکھنے کے لئے مذہب اور عقل کو رہبر مقرر کیا گیا ہے جو ان پر کنٹرول کرتے ہیں اور ان کو ان کی مقررہ حدود بتاتے ہیں۔ انہی جذبات میں سے ایک جذبہ محبت بھی ہے۔ جس کے تقاضے بھی ہیں۔ اور حدود بھی ہیں۔ قدرتی امر ہے کہ انسان محبت و عناد میں بہت تجاوز کر جاتا ہے۔ وہ ہر برائی کو دشمن کی طرف اور ہر نیکی کو دوست کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

شیعہ قوم کو اپنے ائمہ علیہم السلام سے محبت تو ضرور ہے لیکن بعض اوقات اس جذبۂ محبت کو اس طرح کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور ائمہ علیہم السلام کے اختیارات اپنی جانب سے اتنے بڑھا دیتے ہیں کہ توحید بھی بے بس ہو کے رہ جاتی ہے۔ خود خدا کو ان کا محتاج اور ماتحت بنا دیتے ہیں یا تو ہر اقتدار میں انہیں شریک خدا قرار دیتے ہیں یا جوش و جنون محبت میں خدا سے اختیارات چھین کر ان کے سپرد کر دیتے ہیں خدا معطل ہو کے رہ جاتا ہے۔ اقتدار کی کنجیاں ان کے قبضہ میں آ جاتی ہیں۔ پوری خدائی پر ان کا تسلط ہو جاتا ہے۔ خدا ایک کونہ میں پڑا ہوا معزول حکمران کی طرح بے بس و بے چارہ بن کے رہ جاتا ہے۔

محبت کی پائیداری اور عقیدت کی پختگی ایک ضروری اور بنیادی چیز ہے۔ لیکن حد کے اندر۔ جب حد سے بڑھ جائے تو غلو کی صورت اختیار کر جائے گی۔ جو خود ائمہ علیہم السلام کی نظر میں ممنوع اور مذموم ہے اور غلو کی سرحدوں کو عبور کر کے شرک میں جا داخل ہو گی جو ظلم عظیم اور ناقابل عفو گناہ ہے۔ اس واسطے جذبہ محبت پر کنٹرول کرنے کے لئے مذہب اور عقل کی رہنمائی و بالادستی ضروری ہے۔

پس محبت کے لئے دو چیزوں کی پابندی ضروری ہے۔ غلو اور شرک سے

پاک ہو۔

۱؎ غلو :- بے جا مبالغہ اور حد سے تجاوز۔ کیونکہ ہر عہدہ اور منصب کی حدود مقرر ہیں اور ہر عہدہ سے نیچے اور اوپر ایک عہدہ ہے اور ہر عہدہ کی حدود دوسرے عہدہ سے ملی ہوتی ہیں اگر کسی عہدہ کی حدود سے تجاوز کیا گیا تو دوسرے عہدہ کی حدود میں مداخلت بے جا ہو گی اور ماتحت کو مافوق کے برابر کرنے کی ناجائز کوشش ہو گی جس طرح کہ یہ گوارا نہیں کہ کسی صحابی کو افراد اہل بیت معصومین کے برابر کیا جائے۔ یا ازواج پیغمبر میں سے کسی کو جناب سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے برابر مانا جائے اسی طرح یہ بھی ناجائز ہے کہ اہل بیت اور ائمہ علیہم السلام کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مساوی تصور کیا جائے یا صفات و افعال میں شریک باری تعالیٰ قرار دیا جائے۔

کسی نچلے عہدہ دار کو بلند عہدہ دار کے برابر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ماتحت کو بڑھایا جائے تاکہ مافوق کے برابر ہو جائے یا مافوق کو گھٹایا جائے تاکہ ماتحت کے برابر ہو جائے۔ دونوں ناجائز اور مذموم ہیں اس طرح مقررہ عہدوں کی حدود کو تہ و بالا کرنا اور ان کے اختیار میں رد و بدل کرنا ہے اور امور الٰہیہ میں ناجائز مداخلت ہے۔ کسی کو اپنے عہدہ سے گھٹانا بھی گناہ ہے اور بڑھانا بھی گناہ۔

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (سورہ بقرہ۔ آیت ۲۲۹)

جو حدودِ خدا سے تجاوز کرتا ہے وہی لوگ ظالم ہیں۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ (سورہ نساء آیت ۱۸) جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدود سے تجاوز کرے۔ اللہ اس کو آگ میں جھونکے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہو گا۔

اس مطلب کی اور بھی بہت سی آیات ہیں ہم نے انہی پر اکتفا کی ہے۔

یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ۔ سورہ مائدہ آیت ۸۱۔ کہدے اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور سوائے حق کے کوئی بات نہ کرو۔
چونکہ عیسائی جناب عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو کرتے تھے اور انہیں حد سے بڑھا کر شریک خدا اور خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے اس واسطے انہیں سخت تنبیہہ کی گئی۔

جناب امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام خود "غلو" کی مذمت فرماتے ہیں :۔
یَھْلِکُ فِیَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ مُفْرِطٌ وَّ بَاھِتٌ مُفْتَرٍ (نہج البلاغہ) باب المختار من حکم امیرالمومنین ع ۴۶۱۔ میرے بارہ میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہوں گے ایک وہ جو محبت میں حد سے بڑھ جائے اور دوسرا وہ جو مجھ پر بہتان باندھے اور دروغ کو میری طرف منسوب کرے وہ بات جو مجھ میں نہیں۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں : ھَلَکَ فِیَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ غَالٍ وَّ مُبْغِضٌ قَالٍ ع ۱۱۳ میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہو گئے۔ غالی محب جو حد سے زیادہ مجھے بڑھائے اور دوسرا بغض و عناد رکھنے والا۔

جس طرح کہ جناب امیرالمومنین علیہ السلام کو مقام و مرتبہ سے ازراہ عناد و بغض گھٹانے والا جہنمی ہے اسی طرح جناب امیر علیہ السلام کو مقام و مرتبہ امامت اور حدود ولایت سے ازراہ محبت بڑھانے والا بھی جہنمی ہے۔ اسی واسطے جذبۂ محبت پر بھی مثل دوسرے جذبات کے مذہب و عقل کے پہرے لگا دیئے گئے ہیں۔ اور ان کی کڑی نگرانی ہے۔ اور انہی دونو کے کنٹرول سے اعتدال کی راہیں پیدا ہوتی ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب : عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام کی کوئی حد نہیں اور ان کے فضائل کا کوئی شمار نہیں۔ جب کوئی حد نہیں اور ان کے فضائل کا کوئی شمار نہیں۔ جب کوئی حد ہی نہیں تو پھر غلو کیسے ہو سکتا ہے اور حد سے تجاوز کیونکر ہو سکتا ہے۔

جواب باصواب : اس اعتراض کا ہم تسلی بخش جواب دیتے ہیں :۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے فضائل بے شمار ہیں اور ان کے کمالات ومناقب ان گنت ہیں۔ لیکن عہدۂ امامت کی حد ضرور ہے۔ کوئی عہدہ غیر محدود نہیں ہوتا اسی طرح خلافت اور وصایت کی بھی حدیں ہیں۔ اگر ان عہدوں کی حد نہ ہوتی تو عہدہ نبوت ورسالت سے ان کی تمیز نہ ہوتی۔

اصول اسلام میں سے تیسری اصل نبوت ہے اور چوتھی امامت ہے نبوت وامامت کی حدیں ہیں جب ہی تو ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اگر ان کی حدیں نہ ہوتی تو یہ عہدے جدا جدا کیوں ہوتے اور ہر ایک کی الگ الگ تعریف کیوں ہوتی نبوت کا مرتبہ بلند ہے اور امامت کا مرتبہ اس سے کم ورنہ نبوت تیسری اور امامت چوتھی اصل نہ ہوتی۔

امامت کی تعریف یہ ہے: اَلْإِمَامَةُ رِيَاسَةٌ عَامَّةٌ فِي أُمُوْرِ الدِّيْنِ وَالدُّنْيَا نِيَابَةً عَنِ النَّبِيِّ: امامت دین و دنیا میں عام سرداری اور حکومت کا نام ہے نبی کی نیابت کی حیثیت سے۔ امام نائب نبی اور اس کا خلیفہ ووصی ہے۔ اگر حد بندی نہ ہوتی تو امام کو نائب اور اس کا خلیفہ ووصی کیوں کہتے۔

کیا امامت اور نبوت ایک چیز ہے؟ اگر ایک ہی چیز ہے تو اسلام کی دو اصلیں اور دو الگ عہدے کیوں ہیں؟ ایک اصل اور دوسرا اس کا نائب کیوں ہے، اصل کی تعریف جدا ہے اور نائب کی جدا۔

یہ حد بندی ہی تو ہے کہ ان کو ہم امام کہتے ہیں۔ نبی اور رسول کیوں نہیں کہتے جب ہم نے ان کو امام کہہ دیا تو حد بندی ہو گئی۔ نبی کا اپنا مقام ہے اور امام ووصی کا اپنا۔ اس طرح ان کے فرائض اور اختیارات بھی الگ الگ ہیں۔ امام ماتحت اور نبی اس کا بھی حاکم اور سردار۔ نبی کی تعریف اور ہے اور اس کے خلیفہ اور وصی کی تعریف اور ہے۔ خود عہدہ ایک حد ہے۔

ہاں عہدۂ امامت اور مقام ولایت میں رہتے ہوئے ان کے فضائل ومناقب بے شمار ہیں۔ کمالات بے حساب ہیں لیکن حدود امامت ووصایت کے اندر رہ کر۔

یہ نہیں کہ فضائل کی کثرت سے حدود امامت سے تجاوز کا باعث بن جاتی ہے۔ اور کمالات کی زیادتی انہیں رسول یا خدا بنا دیتی ہے۔

خدا کے اختیارات اور ہیں رسول کے اور اس کے نائب امام اور وصی کے اور اگر امام رسول کی موجودگی میں رسول کے اختیار لے لے یا خدا کا مقام سنبھال لے تو امام، امام نہ رہے گا رسول یا خدا بن جائے گا اس طرح حدود شکنی ہو جائے گی اور دین میں فساد پیدا ہو جائے گا۔

لہٰذا امامت ایک عہدہ ہے جس کی حد متعین ہے۔ اس حد کے اندر جس قدر ان کے کمالات فضائل و خصائل ہو سکتے ہیں۔ ان سے کسی مومن کو انکار کی گنجائش نہیں۔

ایک اور سوال : ایک حدیث میں وارد ہے کہ جناب رسالتمآب فرماتے ہیں یا علی تجھے کسی نے نہیں پہچانا مگر میں نے اور اللہ پاک نے اور مجھے کسی نے نہیں پہچانا مگر اللہ پاک نے اور تم نے۔ اسی طرح خدا کو کسی نے نہیں پہچانا مگر میں نے اور آپ نے۔

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ان پاک ہستیوں کو سوائے خدا اور رسول کے کسی نے پہچانا ہی نہیں عوام کو ان کی معرفت ہی نہیں تو غلو اور حد سے تجاوز کیسے ہو سکتا ہے؟

جواب باصواب : یہاں معرفت سے مراد مکمل معرفت ہے اور پہچان سے مراد پوری پہچان ہے۔ ورنہ اگر مومنین ان کی معرفت سے اس قدر کورے ہیں تو ان کو امام کیوں تسلیم کیا؟ ان کو خلیفۂ برحق اور جناب علی علیہ السلام کو خلیفۂ بلافصل کیسے مان لیا؟ غیروں کو کیوں نہ مانا اور ان کو کیوں مانا۔ حق و باطل میں تمیز کس طرح کی سچے اور جھوٹے میں امتیاز کیسے کیا؟

آج شیعوں کو ان کی امامت اور خلافت کی دلیلیں کیوں یاد ہیں؟ مناظروں میں ان کی حقانیت اور غیروں کے باطل ہونے کے ثبوت کیوں پیش کیے جاتے

ہیں۔

ان کے حالات زندگی کیوں پڑھے اور سنائے جاتے ہیں؟ ان کی ولادت وشہادت اور ان کے فضائل وکمالات علم وفضل زہد وتقویٰ مکارم اخلاق دین حق کے لئے قربانیاں خدمات اسلام عبادت، سخاوت، شجاعت اور دیگر اخلاق حسنہ کتب میں مذکور زبانوں پر مشہور ہیں کیا یہ معرفت کی دلیل نہیں ہیں؟ یہ سب کچھ بغیر معرفت اور خالی از عرفان ہیں؟ یہی تو شیعوں کو فخر ہے کہ انہوں نے سوچ سمجھ کر اور جان پہچان کر ان کو امام مانا ہے اور غیروں سے کنارا کیا ہے۔ وہ لائق امامت نہیں اور یہی حقدار منصب امامت وخلافت اور اہل ولایت ووصایت ہیں۔ کیونکہ ان میں صفات امامت پائے جاتے ہیں جب کہ غیر ان اوصاف سے محروم ہیں یہ پہچان کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے۔

لہذا حضرات سائلین کے یہ دونوں سوال اور معترضین کے یہ دونوں اعتراض نہایت لغو اور بودے ہیں نہایت بے حقیقت اور بے اصل ہیں۔

طاقت بشری کے مطابق ہر مومن امام کو بھی پہچانتا ہے نبی کو بھی پہچانتا ہے اور خدا کو بھی پہچانتا ہے تب ہی تو ان کو مانتا ہے۔

کیا یہ پہچان نہیں ہے کہ خدا کی آٹھ صفات ثبوتیہ اور آٹھ صفات سلبیہ ہیں یونہی واعظ وذاکر مجالس میں خدا رسول اور امام کی تعریف کرتے ہیں۔ امام زمانہ کی معرفت کے بغیر تو جاہلیت کی موت ہے۔

نتیجہ اس بحث سے یہ نکلا کہ اہل بیت علیہم السلام کے جو فضائل وکمالات مکارم اخلاق وکرامات، خصائص ومعجزات معروف ذرائع اور مصدقہ روایات سے ثابت ہوں ان سے انکار ایمان کی کمزوری ہے۔ اور جو معتبرہ کتاب مصدقہ ذرائع سے ثابت نہیں ہوتے خواہ مخواہ ان پر زور دینا اور منوانے کی کوشش کرنا زیادتی ہے۔

پس محبت میں حد اعتدال پر رہنا لازمی ہے اور مذہب وعقل سے

بغاوت، ہلاکت وتباہی ہے۔ مذہب وعقل مرضیات خداوندی کے ترجمان جذبات قلبی کے نگہبان اور حدودِ الٰہیہ کے پاسباں ہیں۔

نور و بشر

ہر وفادار امت اپنے پیغمبر کے کمالات وفضائل سن کر خوش ہوتی ہے اور ہر فرد اپنے قائد کے کمال پر نازاں ہوتا ہے ہر پیروکار اپنے پیشوا کی خوبیاں پھیلانا چاہتا ہے اور جس قدر اس کے پیشوا کا تذکرہ خوبیوں اور فضائل کیساتھ کیا جائے اسی قدر اسے مسرت ہوتی ہے اور یہ نرالی نہیں قدرتی بات ہے۔

شیعوں کو چونکہ پنجتن پاک علیہم السلام سے شدت کی محبت والہانہ عقیدت ہے اور دلی لگاؤ ہے اس واسطے یہ اپنے ائمہ کی برتری مدارج اور ترقی مراتب پر بے حد خوش ہوتے ہیں اور بجا خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ صداقتِ ایمان کی دلیل ہے۔

جو ان کی نظر میں خوبی ہے اور ان کے خیال میں فضیلت وشرف ہے۔ اسے ائمہ علیہم السلام کے لئے ثابت کرنے میں فرحت محسوس کرتے ہیں اور جو ان کی نظر میں خامی اور ان کے خیال میں نقص ہے ان سے آئمہ کو محفوظ ومصئون ثابت کرتے ہیں۔ یہ بات مستحسن ہے لیکن بعض اوقات نظر وفکر سے خطا بھی ہو جاتی ہے۔ انسانی سوچ ٹھوکر بھی کھا جاتی ہے۔ جسے ایک معتقد کی نظر خوبی کہتی ہے۔ وہ دراصل خامی ہوتی ہے اور جسے وہ عیب ونقص خیال کرتا ہے وہ حسن و کمال ہوتا ہے۔ گو نیت نیک ہوتی ہے مگر سوچ غلط ہو جاتی ہے۔ صرف کسی حقیقت کو سطحی نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے۔ تعصب وسابقہ خیالات سے آزاد ہو کر غیر جانبداری کے ساتھ کسی موضوع اور کلیہ کے دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر اس میں غور کرنا چاہیئے۔ انسان جب خلوص نیت اور آزادی کے ساتھ کسی امر کی تحقیق کرتا ہے۔ تو خالق حکیم اور مدبر کائنات کی تائید اس کے شامل حال

ہوتی ہے۔ اس کی متجسس نگاہوں کے سامنے حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تاریکی کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ ادراک کی راہیں کھل جاتی ہیں اور حق روشن چہرہ کیساتھ نمودار ہو جاتا ہے۔

نور و بشر کا مسئلہ قوم شیعہ بلکہ مسلمانوں میں موضوع بحث رہتا ہے۔ اور اس پر کثیر معرکہ آرائی ہوتی ہے۔ ایک طرف چہاردہ معصومین علیہم کو محض نور ماننے والے افراد ہیں اور دوسری طرف کے لوگ ان کو بشر اور انسان مانتے ہیں۔

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اگر ان کو بشر اور انسان مانیں تو ان کا جو تقدس اور ان کی جو عظمت ہمارے دماغوں میں ہے ختم ہو جاتی ہے اور ان کا مرتبہ پست اور ان کا مقام ملائکہ سے کمتر ثابت ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ ان کی عظمت و فضیلت کا راز ان کو بشر اور انسان تسلیم کرنے میں ہے ان کا بشر اور انسان ہونا ان کی خوبی و کمال ہے۔ جسے نور ماننے والے عیب و نقص خیال کرتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ کو تفصیل سے حل کریں اور پوری دیانت اور غیر جانبداری کے ساتھ اس پر بحث کریں۔ کہ آیا یہ محض نور ہی نور ہیں، یا عام بشر اور انسان ہیں۔ نور و بشریت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ نوری بشر اور نوری انسان ہیں۔ عام بشر ماننے سے کون سی حقیقتیں روکتی ہیں اور محض نور ہی نور ماننے سے کیا خرابیاں لازم آتی ہیں۔

صرف مان لینا کافی نہیں اور یہ کہہ دینا بھی حقیقت نہیں بن جاتا کہ میں تو ان کو مجسم نور ہی مانتا ہوں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ محض اور مجسم نور ماننے سے کئی مسلّم حقیقتوں کی تکذیب تو لازم نہیں آتی مذہب و عقل کے تقاضوں کی نفی تو نہیں ہوتی۔

اسی طرح انہیں عام بشر اور عام انسان خیال کرنے سے مرتبہ نبوت و امامت کی تقدیس و حرمت تو پائمال نہیں ہوتی، منصب ہدایت کی عظمت تو ضائع نہیں

ہوتی۔ ہم اس موضوع پر تفصیل روشنی ڈالتے ہیں۔ نتیجہ خود قارئین کرام اخذ کر لیں گے۔

بشریت عمومی کی تردید: انبیاء وائمہ علیہم السلام کو ہم مکتوب ذیل وجوہ کی بناء پر عام بشر نہیں مان سکتے۔ ان کی کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو ان کو قبل از زمانہ نبوت وامامت عامۃ الناس اور عام بشر سے ممتاز کرتی ہیں گو ان کی بشریت وانسانیت سے انکار تو ناممکن ہے۔ لیکن ان کا عوام بشر سے فضل وکمال، مکارم خصال اور کردار کے جمال میں امتیاز وتفوق مسلم الثبوت اور سورج کی تابانیوں سے بھی زیادہ روشن ہے۔

ہر پیغمبر اپنی قوم میں اپنے علاقہ میں مبعوث ہوا اور دعوت حق دینے شرک سے دُور کرنے اور برائیوں سے اپنی قوم کو روکنے پر مامور ہُوا۔ برائیوں سے روکنے والا پیغمبر اسی قوم میں پیدا ہوا وہیں تربیت پائی اسی جگہ زندگی کا ایک معقول حصہ گزارا انہی میں رہا۔

مگر اتنا عرصہ ان میں رہنے کے باوجود ان کی کوئی بُری خصلت اور ان میں مروجہ کسی برائی کو قبول نہیں کیا۔ کفر وشرک کے ماحول اور فسق وفجور کے مقام میں رہ کر ان برائیوں سے محفوظ رہنا ان کی پاکیزہ فطرت اور پاکیزہ خیالی کی روشن دلیل ہے۔ کیونکہ جب کسی پیغمبر نے بعثت کے بعد اپنی قوم کو غلط عقیدہ اور غلط کردار سے منع کیا ہے تو اس قوم کے کسی فرد نے اپنے پیغمبر کو انہی برائیوں میں خود ان کے ملوث رہنے کا طعنہ نہیں دیا۔ اور نہ ان کے کردار پر انگشت نمائی کی ہے۔ اپنے پیغمبر کی ممنوعہ باتوں میں سے کسی بات کو پیغمبر کی طرف منسوب کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔ چنانچہ جب انبیاء علیہم السلام نے ان کو بت پرستی سے منع کیا اور ایک خدائے برحق کی دعوت دی تو ان کی قوم نے بت پرستی کی نسبت اپنے آبا کی طرف تو دی اور انہی کے طریقہ پر برقرار رہنے کا اظہار تو کیا مگر کسی نبی کی طرف بت پرستی اور مروجہ ومعمولہ برائیوں کو منسوب نہیں کیا اور

یہی کہا: قَالُوْا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِيْنَ۔ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا۔

خود حضور پاک ختمی مرتبت نے اپنی سابقہ زندگی کو بطور حجت پیش کیا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ؕ سورہ یونس آیت ۱۶۔

اس سے پہلے میں تم میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔

انہوں نے اپنی سابقہ زندگی بطور دلیل اور معجزہ پیش کی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلانِ نبوت سے قبل بھی ان کی زندگی معصوم اور کردار بے داغ تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا کہ ان کے بدن میں ایک ایسا جوہر پاکیزہ موجود تھا جو انہیں برائیوں سے روکتا اور نیکیوں پر آمادہ رکھتا تھا۔ لہذا ان کی بشریت عام لوگوں کی طرح نہ تھی بلکہ اس جوہر خاص کی وجہ سے ان کی بشریت ممتاز اور بلند تھی۔

عام آدمی جب کسی چیز کے ڈھیر میں سے کچھ چنتا ہے تو اسی دانہ کو منتخب کرتا ہے جسے اس کی نگاہ دوسرے دانوں سے ممتاز اور بے داغ قرار دیتی ہے خداوند عالم نے نوعِ بشر کی رہبری کے لئے انہی میں سے اُن افراد کو چنا۔ جن کی طینت دوسروں سے بلند اور جن کی فطرت دوسروں سے ممتاز تھی اور وہ دانعماً قوم میں اس کی علیم و خبیر نگاہ میں بے داغ افراد تھے اگر یہ بھی انہی کی طرح عیب دار ہوتے تو وہ عادل حقیقی انہیں کیوں منتخب فرماتا؟ کوئی بھی چننے والا بے داغ ہی کو چنتا ہے اور داغدار کو مسترد کر دیتا ہے۔ لہذا اس کا انبیا کو منتخب فرمانا اس امر کی روشن دلیل ہے کہ ان کی فطرت سلیمہ اور طینت صالحہ تھی، جو ان کو اپنی قوم و قبیلہ سے ممتاز بنائے ہوئے تھی۔

بشر اسے کہتے ہیں جس میں بشریت پائی جائے۔ یعنی ایسے جسم والا جس میں اس کی سیدھی قامت ہو بدن اور اس کے اعضا مثلاً ہاتھ پاؤں سر آنکھیں گوشت پوست ہڈیاں وغیرہ ہوں۔ اس کے جسم کی علم منطق نے یہ تعریف کی ہے ظاہر چمڑے والا یعنی اس کا چمڑہ بالوں وغیرہ سے چھپا ہوا نہ ہو۔ قد اس کا

سیدھا اور ناخن اس کے جوڑے وغیرہ یعنی جسمانی شکل وصورت "اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ"
میں تمہارے جیسا بشر ہوں۔ یعنی جسمانی شکل وصورت میں تمہارے جیسا ہوں اس
سے جسمانی صورت میں مماثلت تو ثابت ہوتی ہے لیکن انسانی سیرت جوہر عبدیت
اور پاکیزہ فطرت میں مماثلت ثابت نہیں ہوتی۔ انسانی کمالات اور عبدیت کے
درجات شکل وصورت میں مساوات کے باوجود مختلف اور متفاوت ہوتے ہیں۔ یہ
تو کہا ہے کہ تمہارے جیسا بشر ہوں لیکن یہ نہیں کہا کہ تمہارے جیسا عبد اور تمہارے
جیسا انسان ہوں۔

یہ تو زمانۂ قبل نبوت ان کی خصوصیات ہیں۔ مبعوث ہونے کے بعد ان کے
مدارج کمال اتنے بلند ہوتے ہیں کہ طائر بشر کی وہاں تک پرواز ناممکن ہے۔ قیاس
کی نظر تھک ہار کے رہ جاتی ہے۔ انھیں رہنمائی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ
عام بشر رہروی پر ہوتے۔ انھیں معلم انسانیت کا مقام ملتا ہے جب کہ عام بشر
ان سے علم اخذ کرتے ہیں۔ خصائص نبوت اعجاز وکرامت ان کی بشریت کو رفعت
دیتے ہیں اور اللہ سبحانہ سے خاص لگاؤ ان کی انسانیت کو ارتقا بخشتا ہے۔ خود
ان کی زندگی ایک ایسا معجزہ ہوتی ہے کہ امت کا کوئی فرد ان کی زندگی کے کسی
شعبہ کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔ کجا امت کجا نبی کجا معصوم کجا عاصی کجا پیشوا کجا
مقتدی۔ غرضیکہ زندگی کے کسی پہلو میں اُمت اور نبی میں برابری نہیں ہو سکتی۔
عام بشر کی بشریت بعض اوقات حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ لیکن ان
کی بشریت ملائکہ کی ملوکیت سے بھی افضل ہوتی ہے۔ ملائکہ کی نورانیت ان کی
بشریت کے بال برابر بھی نہیں ہے۔ ان کی سیرت کمالات ان کا علم وفضل ان کا
زہد وتقویٰ ان کی معرفت ان کا عمل ان کے معجزات وکرامات بتاتے ہیں کہ ان
کی بشریت آسمان ہے جب کہ عام لوگوں کی بشریت زمین ہے۔ ان کی بشریت
اتنی طاہر اور ان کی انسانیت اتنی کامل ہے کہ ملائکہ کی نوری جسمانیت بھی اس
کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان حقائق کی بنا پر انبیاء وائمہ علیہم السلام کو عام بشر

نہیں کہہ سکتے۔ ہاں انہیں ایسا خاص بشر مانتے ہیں کہ جن میں انوار الٰہیہ کی تابانیاں اور تجلیات ربانیہ کی ضو فشانیہ ہیں۔

نور اور بشر کی خاصیات

نور اور بشر کی جدا جدا تشریح کرتے ہوئے ہم ہر ایک کی خاصیات نقل کرتے ہیں۔ بعد ازاں یہ ثابت کریں گے کہ انبیاءؑ و ائمہ علیہم السلام بشر ہیں انسان ہیں اگر ان کی بشریت اور انسانیت سے انکار کیا جائے اور محض نور مجسم نور تسلیم کیا جائے تو ان کی نبوت و امامت سے بھی انکار کرنا پڑتا ہے۔

نور: لغوی معنی اس کا ہے روشنی اور اصطلاحی معنی ہے اَلظَّاھِرُ لِذَاتِہٖ وَالْمُظْھِرُ لِغَیْرِہٖ۔ جو خود ظاہر اور روشن ہو اور اپنی روشنی سے اپنے غیر کو ظاہر کرنے والا ہو۔ مجازاً۔ ہدایت اور ہدایت کی کتاب کو بھی نور کہا گیا ہے۔ جس طرح کہ کفر و جہالت کو "ظلمت" سے تعبیر کیا گیا۔ اسی طرح اور معانی پر بھی اس کا مجازاً اطلاق ہوتا ہے۔

لغت عرب میں مجازات کا بکثرت استعمال ہے اس واسطے قرآن مجید میں بھی مجازات کثیر ہیں۔ ہمارے ملک میں بعض لوگ دودھ کو بھی "اللہ کا نور" کہہ دیتے ہیں وہاں ان کی مراد نور سے خدا کی نعمت ہوتی ہے۔ یعنی دودھ اللہ کی نعمت ہے۔ ورنہ دودھ چراغ تھوڑا ہے کہ جس سے کمرہ روشن ہو جائے۔ علم دین کو بھی نور کہا جاتا ہے۔

جس طرح کہ مادی عناصر ہیں اور اُن سے مادی اجسام ترکیب پاتے ہیں مثلاً جماد، نبات، حیوان و انسان وغیرہ اس طرح نور ایک لطیف اور پاک عنصر ہے۔ جس سے فرشتے اور حوریں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح عرش و کرسی، لوح و قلم۔ یہ عنصر نور سے مرکب ہیں۔ نور کو ہم عنصر پاک سے تعبیر کرتے ہیں۔ محض تفہیم کے لئے۔

تو ملائکہ کے اجسام نور سے ترکیب پاتے ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ محض نور ہی

نور ہیں یا ان کے اجزاء ترکیبیہ میں کسی غیر عنصر پاک کی آمیزش بھی ہے اور نور غالب ہونے کی وجہ سے وہ نوری کہلاتے ہیں۔ جس طرح کہ انسان میں متعدد عناصر ہیں اور عنصر خاک غالب ہونے کی وجہ سے خاکی کہلاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اسی طرح آگ ایک لطیف عنصر ہے جس سے جن ترکیب پاتے ہیں۔ جنوں کے اجسام میں آگ کے علاوہ اور بھی عناصر ہیں۔ ہوا وغیرہ لیکن باقی خفیف اور آگ کثیر اور غالب ہے اسی واسطے یہ ناری کہلاتے ہیں۔

نور ایک مقدس پاک اور ارفع و اعلیٰ عنصر ہے جب نار ایک ادنیٰ پست اور غیر مقدس عنصر ہے۔ اور عنصر خاک میں ہر قسم کی صلاحیت اور استعداد ہے۔ جیسا کہ آگے بیان ہو گا۔

المَلَک : ملک فرشتہ کی تعریف یہ ہے۔ جِسْمٌ نُوْرِیٌّ یَتَشَکَّلُ بِاَشْکَالٍ مُخْتَلِفَةٍ اِلَّا الْکَلْبَ وَ الْخِنْزِیْرَ۔ فرشتہ ایک نوری جسم ہے جو مختلف شکلیں تبدیل کر سکتا ہے سوائے کتے اور خنزیر کے کہ یہ دونوں نجس العین ہیں۔

الجن : جن۔ جِسْمٌ نَارِیٌّ یَتَشَکَّلُ بِاَشْکَالٍ مُخْتَلِفَةٍ حَتّٰی الْکَلْبَ وَالْخِنْزِیْرَ۔ جن ایک ناری جسم ہے جو مختلف اشکال تبدیل کر سکتا ہے یہاں تک کہ کتا اور خنزیر بھی بن سکتا ہے۔

بشر و انسان : اربعہ عناصر آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے مرکب ہے عنصر خاک اس میں غالب ہے۔ زمانۂ حال کی تحقیق کے مطابق عناصر کی تعداد چار نہیں بہت زیادہ ہے۔ تاہم بڑے اور مشہور عناصر یہی چار ہیں۔ اس خاکی جسم میں بے حد صلاحیتیں ہیں اور غیر محدود ترقی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے خواہ وہ ترقی روحانی ہو یا مادی۔

کائنات میں یہ اشرف المخلوقات ہے اور احسن الخالقین کی بے شاہکار صنعت ہے۔ نیکی اور روحانیت کی طرف بڑھے تو ملائکہ سے بہتر اور بدی و مادیت و بہیمیت کی طرف جھکے تو حیوانوں سے بد تر۔

نوری اجسام کی خاصیات

کسی شئی کی خاصیت وہ ہوتی ہے جو صرف اسی میں پائی جائے اور اس کے غیر میں نہ پائی جائے۔ اب ہم نور اور نوری اجسام کے خواص تحریر کرتے ہیں۔

۱۔ نوری اجسام اس قدر لطیف ہوتے ہیں کہ وہ دکھائی نہیں دیتے۔

۲۔ ان میں وہ خواہشات اور وہ جذبات نہیں ہوتے جو بشر اور انسان میں ہوتے ہیں۔ مثلاً کھانا پینا، سونا، ازواج کی خواہش، لڑنا بھڑنا۔

۳۔ ان کے اجسام میں نقص و کمال نہیں ہوتا، یعنی وہ گھٹتے بڑھتے نہیں۔ ایسا کہ وہ ابتدا میں نہایت چھوٹے اور کمزور ہوں۔ اور پھر غذا کھا کھا کے بڑھتے اور طاقتور ہو جائیں۔ جس طرح کہ انسان آغاز میں بچہ کمزور اور عاجز ہوتا ہے۔ بعد ازاں غذائی قوت سے طاقتور بن جاتا ہے۔

۴۔ نہ تو ان کے والدین ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی اولاد، نہ تو وہ پشت پدر سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہی شکم مادر سے اور نہ ہی ان کی آگے نسل بڑھتی ہے اور نہ ہی اولاد ہوتی ہے۔

۵۔ ان کا کوئی خاندان اور قبیلہ نہیں ہوتا، نہ بھائی نہ بہن نہ چچا نہ ماموں نہ خالہ نہ پھوپھی نہ سسر نہ ساس نہ سالا نہ بہنوئی وغیرہ۔ ہر ایک تن دوسرے سے ہر طرح جدا ہوتا ہے۔

۶۔ وہ تھکتے نہیں جس فرض میں لگے ہوئے ہیں اسی میں مگن، ضعف و کمزوری نہیں کرتے نہ ماندہ ہوتے کہ طالب آرام ہوں نہ انہیں بھوک و پیاس ستاتی ہے چونکہ وہ نہایت لطیف اجسام رکھتے ہیں۔ اس واسطے ان میں گوشت پوست خون اور ہڈیاں بال وغیرہ نہیں ہوتے۔

۷۔ ان کی طبعی موت نہیں ہوتی نہ بیمار ہوتے ہیں نہ علاج کراتے ہیں۔ ہاں انہیں فنا ہوگی اسرافیل کے صور سے۔ لیکن بیماری، حادثہ، قتل، زہر وغیرہ سے انکی

موت نہیں ہوتی اور نہ وہ زیرِ زمین دفن ہوتے ہیں۔

۸۔ ملائکہ یعنی اجسام نوری اپنی شکل تبدیل کرنے پر بھی اپنی فطری خصوصیات اور اپنے ذاتی تقاضے نہیں بدلتے باوجود بشری تمثیل میں ڈھلنے سے اپنی نوری خاصیات ترک نہیں کرتے اور بشری خصائص قبول نہیں کرتے جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے پاس فرشتے جب بشری لباس میں آتے ہیں تو جناب ابراہیم علیہ السلام انہیں حقیقی بشر سمجھتے ہوئے ہیں۔ روایتی مہمان نوازی کے مطابق ان کے کھانے کا انتظام فرماتے ہیں اور حضرت سارہ کا پالا ہوا پیارا بچھڑا مکرم مہمانوں کے لئے ذبح کر کے گوشت بھون کر ان کی ضیافت کا سامان کرتے ہیں۔ بشریت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے فرشتے اپنی اصلیت برقرار رکھتے ہوئے جواب دیتے ہیں کہ ہم فرشتے ہیں اور خورد و نوش کی خواہشات سے بری ہیں۔ نوری اجسام کھاتے پیتے نہیں۔

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا سَلَامًا ۖ قَالَ سَلَامٌ ۖ فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيذٍ ۝ فَلَمَّا رَأَىٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۚ قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ ۝ پارہ ۱۲، سورہ ہود۔ آیت ۷۰۔

اور تحقیق ہمارے قاصد (فرشتے) ابراہیم کے پاس خوشخبری (فرزند کی بشارت) لے کر آئے انہوں نے سلام کہا، جواب میں ابراہیم نے بھی انہیں سلام کہا۔ پس بعد لحظہ کے جناب ابراہیم ان کے پاس بھنا ہوا بچھڑا لے آئے۔ پس جب ابراہیم نے دیکھا کہ فرشتوں کے ہاتھ گوشت کی طرف نہیں بڑھ رہے تو، اور ان سے خوف محسوس کیا۔ انہوں نے کہا اے ابراہیم خوف نہ کر ہم فرشتے ہیں جو کہ قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

اس جگہ فرشتوں نے اپنے تقاضا فطری کو برقرار رکھا اور بشری تقاضوں کو قبول نہ کیا کیونکہ وہ اصلاً اور حقیقتاً فرشتے تھے۔ عارضی اور مجازی طور پر بشر تھے۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے متعلق ملتے

جہاں فرشتہ روح الامین بشری مثال میں آتا ہے۔ اپنی خصوصیات سے معریٰ ہو کر نہیں آتا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۝ (پ ۱۶۔ سورۂ مریم)

حضرت مریم جب لوگوں سے علیحدہ ہو کر پردہ کے اندر نہانے میں مشغول تھیں جبریل ایک کامل بشر کی صورت میں آئے تو جناب مریم علیہا السلام نے اسے بشر سمجھتے ہوئے اس سے اللہ کی پناہ چاہی۔ جبریل کی وضاحت کے بعد انہیں اطمینان آیا۔ اور جبریل نے جناب مریم میں روح پھونکی۔ کیا اس وقت جبریل میں ملکی خصوصیات تھیں یا بشری؟ کیا بشری خصوصیات میں ایک جوان عورت کے پاس غسل کرنے کے وقت آنا اور روح پھونکنا جائز اور مناسب ہے۔

پس ثابت ہوا کہ اجسام نوری بشری حالت میں تبدیل بھی ہو جائیں تو وہ عارضی طور پر ہوتے ہیں اور اپنی ذاتی خصوصیات سے دست بردار اور بشری خصائص کے روادار نہیں ہوتے۔

۹۔ اجسام نوریہ میں غیر محدود ترقی اور ملے ہوئے علمی خزانے اور حاصل کردہ ملکات بڑھانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ادراک امور، تفحص و تجسس چھپے ہوئے اسرار قدرت کا انکشاف اپنی ذہنی اور دماغی قوتوں کو تصرف میں لا کر دریافت کی نئی راہیں تلاش کرنا۔ معلوم سے غیر معلوم کی طرف بڑھنا۔ اپنی معلومات میں وسعت پیدا کرنا، صنعت و ایجادات میں ترقی کرنا۔ یہ ملائکہ کے بس میں نہیں اور نہ فرشتوں میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں جمود ہے وہ صرف امر کے پابند ہیں۔ ہر فرشتہ اپنے اپنے فریضہ کی ادائیگی پر کاربند ہے۔ اور اپنی اپنی ڈیوٹی میں مصروف ہے۔ لیکن بشری دماغ اور انسانی ذہن میں ادراکات اور ارتقاء

کی غیر محدود صلاحیتیں موجود ہیں۔ یہ حاصل شدہ مواد میں اضافہ اور معلومات سے غیر معلومات کی طرف ترقی اپنے علم کو بڑھانے کی استعداد ہے۔ ترمیم و تنسیخ، نئی ایجادیں، غور و فکر، علمی و عملی ترقی کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ جنہیں انسان عمل میں لاکر روحانی و مادی ترقی کے مدارج نہایت سرعت کے ساتھ طے کر رہا ہے۔

اسی عقلی و دماغی غور و فکر کی ترقی کی بنا پر اشرف المخلوقات کی امتیازی شان حاصل کئے ہوئے جو ملائکہ کو نصیب نہیں۔ انہیں تو صرف خدمت اور کارکن ہونے کی ڈیوٹی سونپی گئی ہے۔ مخدومیت کا شرف تو انسان کو حاصل ہے۔

جب حضرت آدم علیہ السلام کا مقابلہ فرشتوں کے ساتھ مطالبہ خلافت میں ہوا تو دونوں کو امتحان گاہ میں لاکر پرچہ امتحان دیا گیا اور امتحان بھی علم میں لیا گیا۔ ایک محدود علم آدم کو بھی دیا گیا اور وہی محدود علم ملائکہ کو دیا گیا معیار امتحان کیا تھا۔

علم اسماء یہ نہیں کہ آدم علیہ السلام کو تو اسماء کا علم دیا گیا اور فرشتوں کو محروم رکھا گیا۔ یہ تو بات تو عادل حقیقی کی عدالت کے سخت خلاف ہے۔ پھر امتحان کاہے کا؟ یہ تو ایک دھوکہ ہوا اللہ پاک اس سے بلند و پاک ہے۔

بلکہ اسماء کا علم دونوں کو برابر برابر دیا گیا۔ امتحان اس بات میں تھا کہ اسم کو مسمّٰی پر منطبق کون کرتا ہے۔ یعنی اس اسم کا مسمّٰی کون ہے؟ اور اس مسمّٰی کا اسم کیا ہے؟

فرشتوں میں چونکہ جمود تھا اور اجسام نوریہ میں مواد ترقی مفقود تھا اس واسطے انہوں نے تو اپنی بے بسی کا اظہار ان لفظوں میں کر دیا۔ قَالُوْا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۔ پ ۱۔

۱۰۔ چونکہ ان کی جنس اور ان کا ماحول الگ ہوتا ہے اس واسطے وہ انسانی معاشرہ اور نوع بشر میں گھل مل کر نہیں رہتے اور نہ ان کا زمین میں بسنے والوں کے ساتھ رہن سہن ہوتا ہے۔ اور نہ ان میں انسان و بشر کے ساتھ معاشرتی

روابط ہوتے ہیں۔

یہ ملائکہ یعنی اجسام نوریہ کی دس خاصیات ہیں اور یہ نور کی خاصیات ہیں اور کسی شے کی خاصیت اس سے جدا نہیں ہوتی۔ لہذا یہ خاصیتیں اجسام نوریہ سے کبھی جدا نہیں ہوتیں۔

پس ان دس خواص کی روشنی میں انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے اجسام طاہرہ کو دیکھتے ہیں کہ ان پر خواص نور صادق آتے ہیں۔ تو ان کے اجسام خالص نور سے پیدا کئے ہیں اور اگر نور کی خاصیات ان پر صادق نہیں آئیں تو ان کے اجسام و ابدان کو ہم طاہر اور معصوم تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن نور مجسم اور خالص نوری ابدان نہیں کہہ سکتے کیونکہ صرف کہہ دینے سے بات نہیں بنتی۔ صرف سنی سنائی باتوں سے عقیدہ نہیں بنتا اور نہ پرانی باتوں کو جو دماغ میں جاگزیں ہوگئی ہیں صداقت کا معیار بنایا جا سکتا ہے۔ عقیدہ وضع کرنے کے لئے قرآن و حدیث اور عقل سے کام لینا پڑتا ہے۔ جن کے متعلق عقیدہ قائم کرنا ہوتا ہے۔ خود انہی سے دریافت کرنا ضروری ہے کہ ہم آپ کے متعلق کیسا عقیدہ اختیار کریں۔ اور عقلی تائید تو ہر حال میں لازم ہے۔

کوئی عقیدہ قائم کیا جائے تو اس کی صداقت اور حقیقت پر قرآن و حدیث سے ثبوت پیش کرنا ضروری ہوتا ہے اور اس پر جو اشکال وارد ہوتے ہیں۔ قرآن و حدیث سے ان کا حل تلاش کرنا لازمی ہے۔ اگر ایسے عقیدہ کا ثبوت مہیا نہ ہو سکے اور اس پر وارد اشکالات کا حل نہ مل سکے تو وہ عقیدہ نہیں وہ ایک بے ثبوت مفروضہ ہے جس کو ہم غیروں کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔

انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے اجسام کو خالص نور ماننے سے

درج ذیل مسلم حقیقتوں کی تکذیب لازم آتی ہے اور ناقابل حل اشکال وارد

ہوتے ہیں۔ اس بناء پر ہم ان کو بشر و انسان ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ورنہ مذہب سے بھی دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

۱۔ خلاق عالم نے نبی اور امام نوع بشر اور انسانی معاشرہ سے منتخب فرمائے ہیں۔ انبیاء اپنی اپنی امتوں کی جنس سے ہوتے ہیں اور اسی معاشرہ کے پاک افراد ہوتے ہیں۔ ان کا خانوادہ اور قبیلہ ہوتا ہے۔ اگر غیر جنس کے ہوں توان کا عمل طرز معاشرت رہن سہن آداب زندگی اپنی قوم کے لئے حجت اور نمونہ عمل نہیں قرار پا سکتے جو طاقت نور میں ہے وہ بشر میں نہیں۔ بشر میں احکام شرعیہ کی پابندی سے تکلیف، تکان، مشقت رنج اور دکھ ہوتا ہے جب کہ نور کو ان چیزوں کا ذرہ بھر احساس نہیں ہوتا۔ بشر چند گھنٹے رکوع میں نہیں گزار سکتا۔ جب کہ نوری جسم فرشتہ ہزاروں لاکھوں سال رکوع میں تھکتا نہیں۔ اس واسطے نوع بشر کی ہدایت فلاح و بہبود اور اقدار انسانیت کی بلندی کے لئے نوع بشر ہی کے اکمل افراد اور انسانیت کے بلند و بالا معیار پاکیزہ اطوار بندوں کو نبوت و امامت کے عہدہ کے لئے منتخب فرماتا ہے۔ اس امر پر عقل کے علاوہ قرآن کی ایسی کھلی ہوئی گواہی موجود ہے کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں لیکن ضد اور ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں۔

امتوں کا تصور ہادی

ہر امت اور ہر زمانہ کے لوگوں کا ہادی کے متعلق یہ تصور رہا ہے کہ وہ معاشرہ انسانی میں سے نہیں ہوتا وہ مافوق البشر اور نوع انسان سے بلند کوئی نوری طاقت ہوتی ہے۔ جسے افراد انسانی اور بشری معاشرہ کی ہدایت تہذیب اور ترقی کے فرائض سونپے جاتے ہیں۔ لیکن ہر زمانہ میں ہر نبی کی زبان سے اللہ پاک امت کے اس تصور کی تردید کرتا رہا۔ امتوں نے اپنے پیغمبروں کی بات ماننے اور ان کی نبوت کو تسلیم کرنے سے یہ طعنہ دیتے ہوئے انکار کیا کہ آپ تو ہمارے

جیسے بشر اور ہم ہی میں سے انسان ہیں۔ آپ کو کس طرح ہم پر فوقیت اور کس طرح آپ کو ہماری تبلیغ وہدایت کا حق پہنچتا ہے۔ نبی کے متعلق انہوں نے اپنا تصور ظاہر کیا۔ کفار لوگ نبی کے لئے بشر ہونا عیب تصور کرتے تھے۔ لیکن خداوند عالم نے کفار کے ان اقوال کو انہی انبیاؑ کی زبانی رد کر دیا۔ ان کے تصور نبوت کو غلط قرار دے کر بشریت انبیاء کو انبیاء ہی کی زبان سے ثابت کر دیا کہ بے شک ہم بشر ہیں اور بشر ہوتے ہوئے نبی اور رسول ہیں۔

کفار اور انبیاء علیہم السلام کے مکالمہ کو ہم قرآن کی زبان سے قلمبند کرتے ہیں۔ جو ہمارے عقیدہ کی بنیاد اور مذہب کی اساس ہے۔ شہادت واضح اور دلالت ظاہر ہے کوئی پیچیدگی اور پوشیدگی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی بشریت سورج کی روشنی کی مانند ظاہر ہے۔ جا بجا قرآن میں ہے۔ باقی انبیاؑ کے متعلق: قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ (پ ۱۳۔ سورہ ابراہیم)

ان لوگوں نے کہا کہ تم تو ہمارے جیسے بشر ہو تم چاہتے ہو کہ ہمیں ان معبودوں سے باز رکھو جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے آئے ہیں۔ پس کوئی کھلا معجزہ دکھاؤ۔ دعوت حق کے جواب میں کفار نے یہ کہا: اب اس کا جواب انبیاؑ کی زبانی سنیئے:۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (پارہ ۱۳ سورہ ابراہیم رکوع ۱۳)

ان کے جواب میں رسولوں نے کہا کہ بے شک ہم تمہارے جیسے بشر ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (نبوت ورسالت) کا احسان کرتا ہے۔ یہ ہمارے اختیار میں نہیں کہ اللہ کے اذن کے بغیر ہم کوئی معجزہ آپ کو پیش کر سکیں۔ اور اہل ایمان تو اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اس سوال و جواب میں کفار نے انبیاءؑ و مرسلین کو بشر مانا اور خود انبیاءؑ و مرسلین نے بھی اپنے آپ کو بشر مانا۔ فرق یہ ہے کہ کفار نے بشر مانتے ہوئے ان کی پیش کردہ نبوت کو اس نظریہ کے تحت رد کر دیا کہ نبی و رسول بشر نہیں ہوتا اور انبیاءؑ و مرسلین اپنے آپ کو بشر کہتے ہوئے یہ نظریہ ظاہر کیا کہ نبی و رسول بشر ہی ہوتے ہیں۔

کفار کا اعتقاد یہ تھا کہ نبی و رسول بشر نہیں ہوتے کوئی اور مافوق جنس ہوتے ہیں اسی لئے انہوں نے ان کو نہ مانا۔

انبیاء و مرسلین کا یہ عقیدہ اور نظریہ تھا کہ نبی و رسول بشر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ پاک کی عطا و احسان کے حامل ہوتے ہیں۔ حضرات قارئین دونوں گروہوں کے نظریات آپ کے سامنے ہیں جس کا چاہیں نظریہ و عقیدہ آپ قبول کریں۔

خود اشرف المرسلین، خاتم النبیین کا نظریہ آپ کے سامنے بزبان قرآن پیش کرتا ہوں: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔ پ۱۶

س کہف آیت ۱۱۰، پ ۲۴ حم سجدہ آیت ۶

آپ ان سے کہہ دیں کہ میں تمہارے جیسا بشر ہوں۔ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے۔

اللہ پاک کا فرمان: اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ۔ پ۱۱ س یونس آیت ۲۔ کیا لوگوں کو اس بات پر تعجب ہے کہ ہم نے ایک ایسے مرد کی طرف وحی کی ہے جو انہی میں سے ہے۔ اسی طرح مِّنْهُمْ اُن میں سے "مِّنْكُمْ" تم میں سے۔ کئی مقامات پر ہمارے آخری رسول جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔ جن سے صاف ظاہر اور واضح ہے۔ کہ تمام انبیاءؑ و مرسلین اور خاتم النبیین آخری پیغمبر بھی اپنی قوم اپنے قبیلہ اپنی امت گروہ انسانی اور معاشرہ بشری کی فرد اور جنس ہوتے ہیں لہٰذا ان کی بشریت سے انکار، قرآن کی تکذیب انبیاء کے فرمان کی تکذیب خدا

کی تکذیب معصومین علیہم السلام کی تکذیب عقل کی تکذیب ہے۔

ہاں ان کی کچھ ایسی خاصیات ہیں اور ان میں کچھ ایسے جوہر ہوتے ہیں جو باوجود نوع بشر کا فرد ہونے کے ان کا رتبہ و شان ان کی طینت و فطرت کردار و سیرت، علوم و معارف قدر انسانیت و عبدیت کی رفعت، صلاح و تقویٰ اعجاز و کرامت کی وجہ سے ان کو نوع انسان کا جامع کمالات و اکمل فرد بنا دیتے ہیں۔

جس طرح کہ انسان مخلوقات میں سے اشرف ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام بنی نوع انسان میں سے اشرف ہیں اور جناب محمد مصطفیٰ تمام انبیاء علیہم السلام سے اشرف ہیں۔

چہاردہ معصومین علیہم السلام باعتبار جامعیت اور اکملیت کے افضل افراد بشریت ہیں۔ ہم نے اختصار کی خاطر صرف چند آیات نقل کی ہیں۔ تفصیلات کا طالب کتاب "نوری انسان" کا مطالعہ کرے۔

۲۔ ان کو خالص نوری اجسام ماننے اور بشریت سے انکار کرنے سے لازم آتا ہے کہ ان کو عبادات، اعمال صالحہ، امتحان و آزمائش اور دنیا کی مصیبتوں کا اجر نہیں ملے گا۔ اور ثواب طاعت و زہد سے محروم رہیں گے جس طرح کہ ملائکہ عمر بھر کی عبادات لمبے رکوعوں اور طولانی سجدوں کے اجر سے محروم رہیں گے۔ نہ انہیں صابر کہہ سکتے ہیں اور نہ شاکر اور نہ وہ مقام امتحان میں آسکتے ہیں اور نہ انہیں اس امتحان میں کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے۔

عبادات و اعمال صالحہ اور آزمائش و امتحان کا اجر انہیں اس صورت میں مل سکتا ہے۔ جب ان کی بجا آوری سے انہیں محنت و مشقت کی تکلیف ماندگی تعب و کلفت و کوفت کا احساس ہو۔ بھوک و پیاس اور درد و الم کا ان کے بدنوں میں اثر ہو۔ میدان جہاد میں ان کو خنجر و تیر اور نیزہ و شمشیر کے زخم پہنچیں تو درد و رنج ہو اور فراق اعزہ و اقرباء احباب و رفقاء کا صدمہ محسوس ہو پھر وہ قوت برداشت کو عمل میں لا کر صبر و شکر کا مظاہرہ کریں

یہ اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب ان کے بدن بشری ہوں۔ عناصر سے مرکب ہوں گوشت و پوست اعصاب و عظام ہوں۔ جسم میں خون کی روانی ہو۔ قلب و جگر میں دردو الم کا احساس ہو۔ جذبات ہوں۔ اعصاب و دماغ میں احساس انسانی ہو۔ اذیت و صدمات محسوس کریں۔ یہ تمام باتیں ایک نوری خالص جسم کے لئے ناممکن ہیں۔

کیونکہ نوری اجسام میں نہ رنج و مشقت ہے نہ ماندگی اور تھکاوٹ ہے۔ نہ احساس دردو الم ہے۔ نہ بھوک و پیاس کی تکلیف ہے۔ نہ عزیزوں اور رفیقوں کی جدائی کا صدمہ ہے۔ نہ زخمی ہوتے ہیں اور نہ زخموں کے درد کا احساس۔ مجسم نور ہونے کی صورت میں ان کے کمالات کی نفی ہوتی ہے۔ امتحان و آزمائش کا مفہوم ختم ہوتا ہے۔

اگر میدانِ کربلا میں جناب سید الشہدا امام حسین علیہ السلام نے ایک نوری بدن اور خالص نوری جسم کی حیثیت سے حصہ لیا ہوتا تو ان کا کمال ہی کیا ہے ہم انھیں بھوکا پیاسا کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ جب کہ نور کو نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس۔ ہم انھیں صابر کیسے کہیں؟ جب کہ صبر دکھ درد اور اذیت اور کلفت پر ہوتا ہے۔ اور نور ان چیزوں سے بری ہے۔ ان کا کمال منفی نظر آتا ہے۔ بلکہ ان کے اصحاب کا کمال نظر آتا ہے کہ وہ بشر تھے اور انہوں نے آلام و مصائب سہے، بھوک و پیاس کی تکلیف گوارا کی، صبر و شکر کیا۔

جب ہم ان کو بشر اور انسان تسلیم کریں تو پھر ان کی عبادات اعمال صالحہ نماز و روزہ حج و جہاد مثالی باثواب اور بے نظیر ثابت ہوتے ہیں۔ ان کا کردار ان کے کارنامے ان کا صبر و شکر ان کی امتحان و آزمائش میں کامیابی ان کا کمال ظاہر کرتی ہے۔

پس اے برادرانِ شیعہ! اے محبانِ آلِ عبا! آپ میں غور و فکر کی کمی ہے۔ جس چیز کو آپ خوبی سمجھتے ہیں وہ دراصل خامی ہے۔ اور جسے کمال و

فضیلت سمجھ کر ائمہ علیہم السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں یہ پستی اور منقصت ہے۔
آپ میں محبت تو ہے مگر دانائی کی نہیں نادانی کی محبت ہے۔ یہ نادانی کی بات ہے کہ جسے آپ ان کے لئے عیب و نقائص خیال کرتے ہیں یہی تو خوبی و کمال ہے۔

۳۔ انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے خاندان قبیلے اور رشتہ داریاں ہیں۔ ان کے آباء و اجداد ہیں۔ ان کی ازواج ہیں جن سے ان کی نسل اور اولاد ہے۔ ان کے بہن بھائی سالے اور بہنوئی چچے اور ماموں ہیں۔ پھوپھیاں اور خالائیں بھانجے اور بھتیجے ہیں کیا ان کے یہ تمام رشتہ دار نوری ہیں؟ کیا نوریوں کی رشتہ داریاں خاکیوں کے ساتھ قائم ہو سکتی ہیں؟

۴۔ وہ باپ کی پاک پشت اور ماں کے پاک بطن سے پیدا ہوتے ہیں وہ شکم مادر میں رہتے ہیں۔ وہ ماؤں کا دودھ پیتے ہیں۔ دنیا کی غذا کھاتے ہیں، لباس پہنتے ہیں۔ تربیت پاتے ہیں۔ پروان چڑھتے ہیں کاروبار کرتے ہیں، لین دین کرتے ہیں۔ معاشرہ میں گھل مل کر رہتے ہیں۔ بیمار ہوتے ہیں۔ علاج کرتے ہیں۔ زخمی ہوتے ہیں مرہم پٹی کرتے ہیں۔ نکاح و ازدواج کرتے ہیں اولاد جنتے ہیں۔

۵۔ وہ پیدا ہوتے ہیں اپنے باپ کے پاک بدن کا حصہ ہوتے ہیں اگر ان کے بدن کا حصہ نہ ہوں تو ان کی اولاد کس طرح کہلا سکتے ہیں اور وہ ان کے باپ کس طرح بن سکتے ہیں۔ اسی طرح ماں کے پاک بدن کا جزو ہوتے ہیں۔ اسی واسطے ان کے پاک اخلاق اور صفات عالیہ کے وارث ہوتے ہیں۔ توارث صفات آباء کے اجزاء بدن کی بنا پر ہے۔ اگر کوئی پیغمبر یا امام اپنے باپ کے بدن اور خون کے پاکیزہ خلاصہ سے نہ پیدا ہو تو اس کا بیٹا کیونکر کہلائے گا؟

انبیاء و ائمہ علیہم السلام کو بیماری لاحق ہوتی ہے۔ موت آتی ہے خواہ موت طبعی ہو یا بذریعہ زہر و شمشیر ہو۔ زہر ان کے بدنوں میں اثر کرتی ہے۔ رنگ سبز ہو جاتا ہے۔ خون کی قے آتی ہے۔ جگر کٹ کٹ کے بذریعہ خونی قے باہر آتا ہے۔ بچے کی ولادت کے وقت ان کی امہات کو درد زہ کی تکلیف بھی ہوتی ہے۔

دائیاں خدمت و مدد کے واسطے آتی ہیں۔ خواہ از قسم انسان ہوں یا حوران جنت ہوں۔

انہیں موت آتی ہے: اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ س ۳۹ آیت ۳۱۔ اے پیغمبر تو بھی مرے گا اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔ ان کو غسل میت دیا جاتا ہے۔ کفن پہنایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کے اجسام مبارکہ طیب و طاہر ہوتے ہیں تاہم احکام شرع لازماً پورے کئے جاتے ہیں۔ نماز جنازہ بھی پڑھی جاتی ہے اور زیر زمین دفن بھی کئے جاتے ہیں۔ قبروں میں ان کے اجسام طاہرہ مدفون ہیں اور مزارات مقدسہ و مقابر مطاہرہ آج بھی زیارت گاہ عوام و خواص اور مرجع خلائق ہیں۔ اگر ان کے بدن وہاں نہیں ہیں تو قبروں کی ان کی طرف نسبت غلط ہے (معاذ اللہ) وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں (معاذ اللہ) صرف ایک ڈھونگ ہے۔ اگر فی الواقع ان ہی کی قبور ہیں اور انہی معصومین سلام اللہ علیہم کی قبور مطہرہ ہیں اور ائمہ انہیں میں مدفون ہیں اور یہی حقیقت ہے تو عزیزان گرامی خالص نور اس طرح مرتا بھی نہیں ہے اور زیر خاک پنہاں بھی نہیں ہوتا ہے۔ بے شک نور کو فنا ہے۔ لیکن اس طرح موت نہیں۔

۷۔ یہ پاک اجسام شادیاں کرتے ہیں اور شادیوں سے لطف واندوز بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ دوسروں سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں اور دوسروں سے زیادہ شادی کا لطف و مزہ حاصل کرتے ہیں کیونکہ ان میں قوت رجولیت یعنی مردی طاقت غیروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازواج کے ان کی کنیزیں بھی ہوتی ہیں اور وہ مثل بیویوں کے حلال ہوتی ہیں۔ اور ان میں سے ان کی اولاد بھی ہوتی ہے۔ اور بعض صالحہ نیک خصلت کنیزوں کو انبیاء و ائمہ علیہم السلام کی مائیں بننے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ کتب تاریخ ملاحظہ فرمائیں:۔

چونکہ شیعہ کتب احادیث میں ان کی نورانیت کا تذکرہ کثرت سے موجود ہے لہٰذا ان کی نورانیت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ بشریت اور انسانیت

سے انکار ممکن ہے۔ ہم نے نور اور بشر کے خواص تحریر کر دیئے ہیں۔ قارئین کرام خود نتیجہ اخذ کر لیں۔

جہاں تک ہماری عقل و دانش اور فہم و بینش کام کرتی ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان کے اجسام و ابدان طاہرہ میں نور کی آمیزش بھی ہے۔ خواہ نور کا کوئی ہی معنی مراد لیا جائے۔ جو نور اصلاب طاہرہ اور ارحام مطاہرہ میں منتقل ہوتا رہا خواہ اسے مادہ تولید قرار دیا جائے خواہ کوئی اور معنی مراد لیا جائے۔ اسی طرح مشروب عرشی یا ثمر بہشتی کی شمولیت بھی ہے۔ پاک طینت بھی ان کے بدن کا جزو ہے اور والدین کے پاک بدنوں کے اجزاء لحم و شحم اور پاک خون بھی ان کے ابدان کے اجزاء ترکیبیہ کا حصہ ہیں۔ اس لحاظ سے نور و بشر کا حسین امتزاج ہے ان میں نوری خصوصیات بھی ہیں اور بشری اوصاف بھی۔ چونکہ حضرت آدم ان کے جد امجد ہیں۔ ان کی اولاد سے ہیں اور وہ خاکی تھے اس وجہ سے انہیں خاک کی طرف حضرت آدم کی وجہ سے نسبت دینا کوئی عیب و نقص نہیں۔

نور و بشر متضاد نہیں دونوں کا اجتماع ممکن ہے جو انبیاء و ائمہ علیہم السلام میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ نوری بشر اور مقدس انسان ہیں نہ محض بشر ہیں اور نہ خالص نور۔ اسی حسین امتزاج کی وجہ سے انسانیت کے اعلیٰ معیار اور بشریت کی بلند اقدار پر فائز ہیں۔

جہاں ان کے اجسام مطہرہ کی ترکیب پیدائشی میں والدین کے اجسام کا خلاصہ اور مشروب عرشی وغیرہ شامل ہیں وہاں ان کے اجسام کی نشوونما اور بڑھنے میں دنیاوی غذاؤں اور مادی خوراک کا بھی حصہ ہے۔ یہ افراد معصومین دنیوی اور مادی غذائیں کھاتے رہے۔ جن کا تعلق عناصر ارضی و مادی سے ہے اور یہی غذائیں ان کے بدن کا جزو بنتی رہیں۔ دنیا کا پانی پیتے رہے جانوروں کا گوشت کھاتے اور دودھ پیتے رہے۔ ارضی نباتات از قسم سبزی اور ارضی اشجار کے پھل کھاتے رہے۔ ارضی غلہ از قسم جو گندم وغیرہ بھی استعمال کرتے رہے

جب یہ عناصر سے مرکب غذائیں ارضی وخاکی تناول فرماتے رہے اور یہ غذائیں اُن کے خون میں شامل ہو کر ان کے پاک ابدان کا جزو اور حصہ بنتی رہیں تو ہم اُن کے اجسام طیبہ کو عناصر اور مادی حصہ سے کس طرح علیحدہ کر سکتے قرار دے سکتے ہیں۔ جہاں نوری اجزاء کو شریک بدن قرار دیتے ہیں۔ وہاں مادی اجزاء اور عناصر کو بھی شامل بدن ماننے پر مجبور ہیں۔ لہذا جہاں ان کی نورانیت سے انکار کمزوری ایمان کی علامت ہے۔ وہاں ان کی بشریت اور انسانیت سے انکار قرآن وحدیث سے انکار کے برابر ہے اور عقلی تقاضوں کی مکمل تردید ہے۔

ایک ظلم عظیم اور گناہ کبیر

ایک کم عقل اور بد باطن مقرر اور جاہل و بے دین ذاکر منبر و سٹیج پر جب لعن طعن اور تبرا نشر کرتا ہے کہ نبی و امام پنجتن پاک و چہاردہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بشر ماننے والوں اور انسان تسلیم کرنے والوں پر لعنت اور جاہل بے علم سامعین بے شمار کی صدائیں بلند کرتے ہیں تو عرش الٰہی کانپنے اور زمین و آسمان تھرانے لگتے ہیں۔ کیونکہ (معاذ اللہ) جہالت وضلالت کے عمیق گڑھے میں مبتلا واعظ و ذاکر اپنے مذموم جملوں اور مذموم و عظیم گستاخی سے سب سے پہلے وہ (معاذ اللہ) اللہ پاک پر لعنت کرتا و کرواتا ہے جس نے ان کو بشر کہا، پھر انبیاء و ائمہ علیہم السلام پر لعنت کرتا ہے (معاذ اللہ) جنہوں نے اپنی بشریت کا اقرار کیا، پھر وہ قرآن پر لعنت کرتا ہے (معاذ اللہ) جس میں ان کی بشریت کا ذکر ہے۔ بعد ازاں وہ علماء اعلام مومنین صالحین پر لعنت کرتا اور کراتا ہے۔ جو ان کو بشر تسلیم کرتے ہیں۔ کس قدر عظیم دشنام طرازی اور بدگوئی ہے اس شخص کی جس کا شیوہ معصوموں پر زبان درازی ہو۔ "العیاذ باللہ" "العیاذ باللہ"

ذاکر و واعظ ذرا سوچ سمجھ کر اپنے منہ سے الفاظ نکال دا یسے لفظوں کو

لکھتے ہوئے "کراماً کاتبین" بھی پریشان ہوتے ہیں) تو حق گو حق بین حق شناس افراد پر تبرّا بازی کرتا ہے۔ تیری تبرّا بازی سے اللہ، اس کے رسول، قرآن اور ائمہ معصومین بھی محفوظ نہیں رہے۔ تیری کتنی جسارت ہے، کتنی عظیم گستاخی ہے، کتنا عظیم گناہ ہے، کتنا بڑا ظلم ہے۔ "معاذاللہ" اے جاہل و گمراہ و بے دین شخص ہوشیار باش!!

اسی امر کے تاحال اکثر تعداد میں قائل ہیں۔ اگر اس پر غور کیا جائے تو غلط فہمی اور غلط عقیدت میں سامعین کا اتنا قصور نہیں جتنا واعظین و ذاکرین کا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ بشر و انسان ماننے میں یہ پنجتن پاک علیہم السلام کی کسر شان کمیٔ فضیلت و کوتاہیٔ شرف سمجھتے ہیں۔ چونکہ ہر محب اپنے محبوب ہر پیرو اپنے پیشوا ہر تابع اپنے رہبر کی افزونیٔ عزت بلندیٔ فطرت درجات کی رفعت اور زیادتیٔ شرف و فضیلت کا خواہش مند اور طلب گار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر شیعہ اپنے ائمہ کی شان میں کمی نہیں زیادتی چاہتے ہیں۔ وہ ان کے درجات کی پستی نہیں بلندی چاہتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے نوری اجسام ماننے سے ان کی شان بلند مقام رفیع اور درجات و مراتب عالی نظر آتے ہیں۔ جب کہ ان کو اربعہ عناصر سے مرکب اجسام خاکی و مادی ابدان ماننے سے ان کے مراتب پست، شان گھٹیا، مراتب و درجات کمتر دکھائی دیتے ہیں۔ اسی واسطے وہ اپنے پرانے اور سنے سنائے عقیدے پر اڑے ہوئے ہیں۔ اب ہم ان دونوں سببوں کا جواب سپرد قلم کرتے ہیں ؎

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

سبب اول کا جواب: حضرات واعظین و ذاکرین اگر ان احادیث کا پوری طرح مطالعہ فرما لیتے اور یہ سوچ سمجھ لیتے کہ ان احادیث میں خلقت اجسام و ابدان ہے یا خلقت ارواح؟ اور ساتھ ساتھ وضاحت بھی کرتے جاتے کہ ان کے اجسام

نور سے مخلوق نہیں بلکہ طینت پاک اور اپنے آباء کے خلاصہ خون سے انکی پیدائش ہے جس میں ایک پاک و خاص جوہر بھی شامل ہے۔ تو آج یہ مشکلات پیش نہ آئیں اور افراد مذہب آپس میں اُلجھنے کی بجائے آگے قدم بڑھاتے۔

"خلقت نوری میں بدن شامل نہیں رُوحیں ہیں"

یعنی معصومین علیہم السلام کی ان احادیث مبارکہ میں جن انوار کی پیدائش کا ذکر ہے ان سے مراد اجسام و ابدان کی پیدائش نہیں بلکہ ارواح مراد ہیں نور سے مراد روح ہے جسم نہیں۔

اَمری مخلوق

اکثر مومنین اور بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ انبیاءؑ و ائمہ علیہم السلام اَمری مخلوق ہیں۔ عالمِ خلقی سے ان کا کوئی تعلق نہیں گویا انہوں نے دو قسم کے عالم بتائے ہیں عالم خلقی اور عالم اَمری۔

عالم خلقی وہ عالم ہے جہاں اسباب مادیہ سے پیدائش ہوتی ہے اور تدریجاً بڑھتی ہے جیسا کہ حیوان مطلق، انسان پرندے چرندے عالم نباتات وغیرہا۔

عالم امری وہ ہے جہاں صرف لفظ کُن سے تخلیق ہوتی ہے اور اسباب ظاہرہ مادیہ کا وہاں کوئی دخل نہیں جس طرح ملائکہ، حوریں، روحیں وغیرہ۔ اسی طرح انہوں نے انبیاءؑ و ائمہ کو امری مخلوق قرار دیا۔ اس بات کا استنباط انہوں نے اس آیت مجیدہ سے کیا ہے: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اسی کیلئے ہے خلق (پیدا کرنا) اور امر (حکم دینا) بابرکت ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اس نئی ایجاد کے مُوجد جناب شیخ عبدالعلی صاحب ہروی مرحوم کے مواعظ حسنہ ہیں:۔

اس کے ثبوت کے لئے انہوں نے چند ایک پیغمبروں کی مثالیں پیش کی

ہیں جنہیں مولوی و ذاکر ہیں۔ منبروں و سٹیجوں پر ناقابل تردید حقائق سمجھتے ہوئے بڑے طمطراق سے مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ ثبوت میں جن انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے۔ ان میں جناب آدم علیہ السلام کہ بغیر والدین کے پیدا ہوئے۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام کہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور حضرت اسحاقؑ کہ حضرت ابراہیمؑ کی ضعیفی عمر ایک سو بیس سال اور ان کی زوجہ حضرت سارہ کی پیری کی جن کی عمر ۹۰ سال تھی دونوں کی ضعیفی اور عالم یاس کے زمانے میں ان کی پیدائش ہوئی۔ اس بشارت پر حضرت سارہ نے تعجب بھی فرمایا اور یہ کہا اَنَا عَجُوْزٌ عَقِيْمَةٌ میں بہت بڑھیا اور بانجھ ہوں یہ زمانہ اولاد جننے کا نہیں اور جناب ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا ھٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا۔ میرا شوہر بہت بوڑھا ہے۔ اسی طرح حضرت زکریا کی دعا فرزند کے متعلق اور مایوسی اور پھر حضرت یحیٰی علیہ السلام کی پیدائش۔ یہ انبیاء کی عالم امر سے پیدائش کے متعلق اُن کے دلائل ہیں۔ اب ان کا جواب ملاحظہ فرمائیں:-

۱۔ ان کا تعلق عالم امر کی پیدائش سے ہے یا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی قدرت اور مہربانی سے۔

یہ اللہ کی قدرت اور مہربانی کی نشانیاں ہیں کہ جس وقت چاہے جس کے لئے چاہے اور جس طرح چاہے اپنے بندوں پر مہربانی کرتا ہے اور عاجز نہیں عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ ارباب علم سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کر رہا ہے۔ کہ میں اس طرح خلاف دستور اور خلافِ عادت امور پر بھی قادر ہوں جس طرح کہ وہ انبیاء کے دستِ حق پرست پر معجزات ظاہر فرماتا ہے: اس سے امری پیدائش کہاں ثابت ہوتی ہے۔

۲۔ امری پیدائش کا تعلق جن سے ہوتا ہے نہ ان کے والدین ہوتے اور نہ اُن کی اولاد اور نہ وہ گھٹتے بڑھتے ہیں جیسے ملائکہ، حوریں اور روحیں وغیرہا۔ انبیاء علیہم السلام کے ماں باپ بھی ہیں اور اولادیں بھی ہوئیں۔ اجسام گھٹتے بڑھتے

رہے اور تدریجاً ان کے بدنوں کی بڑھوتری ہوئی۔ دنیا کی مادی غذائیں بھی کھاتے رہے۔

۳۔ اس آیت میں لفظ امر کا معنی امر پیدائش نہیں بلکہ امر بمعنی حکم ہے، اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ: اسی کے لئے ہے پیدا کرنا اور اسی کے لئے ہے حکومت کرنا یعنی حق حکومت خالق ہی کا ہے۔ امر سے مراد امری پیدائش لینا تفسیر بالرای ہے جس سے مواعظ حسنہ بھری ہوئی ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے ائمہ معصومین علیہم السلام کے فرمان کی تائید ضروری ہے۔ اور سابقہ علمائے اعلام کی تائید: کہ ائمہ علیہم السلام امری مخلوق ہیں اور یہاں لفظ امر سے امری پیدائش مراد ہے۔ نصی ثبوت چاہیئے۔

۴۔ کلّی کے احکام اس کی جزئیات پر تو صادق آتے ہیں۔ لیکن جزئی کے احکام کا کلّی پر صادق آنا ضروری نہیں۔ کلّی وہ لفظ ہے کہ جس کے مفہوم و معنی میں کثیر افراد شامل ہوں جیسے انسان وغیرہ اور جزئی وہ لفظ ہے کہ جس کے مفہوم میں ایک ہی فرد شامل ہو۔ مثلاً زید، بکر وغیرہ کلّی کا حکم ہے۔ اَلْاِنْسَانُ نَاطِقٌ: اَلْاِنْسَانُ سَمِیْعٌ: اَلْاِنْسَانُ بَصِیْرٌ۔ انسان بولنے والا ہے۔ انسان سننے والا ہے۔ انسان دیکھنے والا ہے۔ یہ حکم تمام افراد پر صادق آتا ہے۔ بسوائے چند مستثنیٰ کے لیکن جو حکم جزئی پر لگتا ہے کہ زید خوبصورت ہے۔ خالد کند ذہن ہے۔ بشیر نابینا ہے۔ تو یہ جزئی تک محدود رہتا۔ کلّی پر صادق نہیں آتا۔ کہ سب انسان خوبصورت، کند ذہن وغیرہ ہو جائیں۔

جن چند انبیاء علیہم السلام کی پیدائش کا ذکر عام معمول دستور کے خلاف ہے، تو وہ جزئی واقعات ہیں۔ ان کا تمام انبیاءؑ پر اطلاق نہیں ہو سکتا وہ باپ کی پشت اور ماں کے پیٹ میں رہے۔ ایام حمل کی مدت بھی سوائے چند ایک کے معمول کے مطابق ہے۔ اس سے عالم امر کی پیدائش کہاں ثابت ہوتی ہے کلیات سے تو استثنا ہوتا ہے۔ یعنی چند افراد اس کلیہ سے باہر ہو جاتے ہیں: مثلاً گونگا

بہرہ، نابینا افراد ناطق سمیع اور بصیر کے کلیوں سے باہر ہیں۔ لیکن مستثنیٰ دخارجہ از کلیہ افراد) سے کلیہ نہیں بن سکتے۔ اللہ سبحانہٗ کی قدرت کاملہ اور اس کی خاص مہربانیوں کی مثالیں ہیں اور انہوں نے خاص اصطلاح مراد لے لی۔

علم غیب

اس باب میں ہم بیان کریں گے کہ ائمہ علیہم السلام کو علم غیب حاصل ہے۔ کتنا حاصل ہے؟ اور اس کا حصول کس طرح ہوتا ہے۔ مگر اس سے پہلے ہم غیب کی تعریف بیان کرتے ہیں:

غیب کا لفظی معنی ہے "پوشیدہ" یعنی وہ چیز جو ہماری نظروں سے اوجھل ہو غیب کہلاتی ہے۔ مگر یہ تعریف جامع نہیں کہ ایک کی نظر کمزور ہے وہ اس چیز کو نہیں دیکھ سکتا جسے وہ شخص بآسانی دیکھ سکتا ہے جس کی نظر تیز ہے۔ اسی طرح ایک شخص کی قوت سمع بہت کمزور ہے۔ یعنی کسی قدر بہرا ہے وہ ایسی آواز نہیں سن پاتا۔ جسے ایک قوی السمع سن لیتا ہے۔ اسی طرح بعض امور کے ادراک اور بعض حقیقتوں کی دریافت میں آلۂ ادراک یعنی عقل متفاوت ہے۔ مزید براں بعض مادی آلات ایسے ایجاد کئے جا چکے ہیں۔ جن کی مدد سے آلۂ بصارت زیادہ تیز ہو گیا ہے اسی طرح قوت سماعت بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس طرح ایک چیز ایک شخص کے لئے غیب اور دوسرے کے لئے حاضر اور شہادت ہے۔

غیب کی جامع تعریف: یہ ہے کہ مادی حواس مادی ذرائع کے ذریعے جس موجود چیز کی دریافت سے قاصر اور عاجز ہوں۔

وہ غیب ہے اور مغیب ہے۔ اس طرح وہ جراثیم خوردبین کے ذریعہ اور دور دراز بعید چیزیں جو دوربین کے ذریعہ دیکھی جا سکتی ہیں مغیبات شمار نہیں ہوں گی۔

اسی طرح قرائن ودلالات اور آثار و علامات کے ذریعہ جو چیز معلوم کی

جا سکے وہ بھی غیب نہ کہلائے گی۔ مثلاً نشانِ قدم سے کسی جاندار کا کسی مقام میں موجود ہونے کا علم یا اٹھتے ہوئے دھوئیں سے آگ کا علم یا کسی صحرا میں اُڑتے پھرتے پرندوں سے کسی چشمہ کا علم علم غیب نہیں۔ کیونکہ یہ مادی قرائن وعلامات ہیں۔ اسی طرح مادی علوم کے ذریعہ کسی حقیقت و نامعلوم کا پتہ کرنا بھی علم غیب نہیں ہے۔

غیب تو یہ ہے کہ کوئی شخص یا چیز فی الواقع موجود ہو اور مادی حواس ظاہرہ وحواس باطنہ مادی وسائل و آلات اور مادی علوم کے ذریعہ اس کے ادراک و دریافت سے درماندہ رہ جائیں اور وہاں تک ان کی رسائی نہ ہو سکے اس طرح ریڈیو کے ذریعہ آواز کا سننا اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ صورت کا دیکھنا گو فاصلہ بعید ہے۔ اطلاع غیب نہ قرار پائے گی کیونکہ مادی ذرائع کے ذریعہ یہ اطلاع یابی ہے۔ بلکہ علم غیب تو یہ ہے کہ مثلاً سو میل کے فاصلہ پر بغیر مادی آلات و وسائل کے صرف روحانی اقتدار کے ذریعہ اس چیز کی صورت اور نقل و حرکت دیکھ سکے اور اس کی آواز سُن سکے۔ یا گذشتہ و آئندہ ہونے والے واقعات کی من جانب اللہ مطلع ہو کر خبر دے سکے۔

صفائے قلب اور تہذیب نفس

ایک بشر جب زبان کو کذب اور پیٹ کو حرام ونجس غذا سے پاک رکھتا ہے۔ اور دل کو اللہ پاک سے وابستہ اور عقل و فکر کو اس کی معرفت میں مصروف رکھتا ہے۔ اسی طرح نفس کو بُری و ناپسندیدہ عادات سے چھانٹ کر مکارم اخلاق سے آراستہ کرتا ہے اور وہ اس ریاضت وعبادت پر ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے تو اس کی روحانیت اس کی مادیت پر غالب آجاتی ہے اور اس کی بشریت ملکوتیت سے بڑھ جاتی ہے۔ اس میں قدسیت وطہارت باطن اس قدر غالب آجاتی ہے کہ نیکیوں کو مشروب طاہر اور مرغوب غذا سمجھتا ہے اور برائیوں سے اس طرح

نفرت کرتا ہے جس طرح گندی نالیوں کے گندے و غلیظ پانی سے عام بشر متنفر ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی ریاضت سے اس کے نفس میں حسنات کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور معاصی و سیئات سے یعنی گناہوں سے شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ مجاہدۂ نفس اور ریاضت روحانی اسے عصمت کے قریب کر دیتی ہے۔ اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے وہ مقرب خدا بندہ اور مستجاب الدعوات عبد صالح قرار پاتا ہے۔ صفائے باطن اور نورانیت قلب کی وجہ سے اس کے حواس تیز ہو جاتے ہیں اور نوافل و عبادات کی ریاضت کی وجہ سے وہ اتنا مقرب بارگاہ ایزد متعال ہو جاتا ہے کہ اس کے کان غیر معمولی آواز کو سن سکتے اور عام آنکھوں سے اوجھل اشیاء کو اس کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں آیا ہے۔ لَا یَزَالُ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اَکُوْنَ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَعَیْنَهُ الَّتِیْ یَنْظُرُ بِهَا وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا:

ہمیشہ میرا بندہ نوافل عبادات یعنی فرض کے علاوہ غیر فرض عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا ہے اور اس ریاضت کے ذریعہ وہ اتنا میرے قریب آجاتا ہے کہ وہ میرے کانوں سے سنتا ہے میری آنکھوں سے دیکھتا اور میرے ہاتھوں سے پکڑتا ہے۔ یعنی اس کے حواس میں غیر معمولی تیزی آجاتی ہے۔ اس کی مادیت میں اتنا تجرد آجاتا ہے کہ مادی پردے اس کے کانوں اور آنکھوں کے درمیان حجاب نہیں بن سکتے اور اس سے خوارق عادت کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ہر وقت نہیں خاص اوقات میں جس کی توضیح آگے آرہی ہے۔ یہ غیر معصوم بشر کی روحانی منزل اور آخری درجۂ کمال ہے۔ جو ریاضت عبادت زہد و تقویٰ اور مجاہدۂ نفس سے حاصل کرتا ہے اور اس کا یہ کمال کسبی ہے۔

ایسے غیر معصوم انسان کے کمال انسانی کی جو آخری منزل ہے۔ اس سے اوپر نبی و امام کی ابتدائی منزل ہے۔ یعنی جہاں غیر معصوم بشر کا کمال ختم ہو جاتا ہے وہاں سے اوپر معصوم انسان کا کمال شروع ہوتا ہے۔

غیر معصوم کی کاملیت کسبی ہے جب کہ معصوم کا ابتدائی کمال وہبی ہے۔ جو مقام غیر معصوم بشر مجاہدۂ نفس ریاضت عبادت اور تہذیب اخلاق کے ذریعہ کسبًا حاصل کرتا ہے وہ مقام معصوم نبی و امام آغاز ہی سے لے کر پیدا ہوتا ہے پھر نبی و امام بھی کسب کے ذریعہ اسے بڑھاتا رہتا ہے۔

ابتدائی مقام و کمال معصوم کا وہبی ہوتا ہے۔ پھر اس میں اس کے ذاتی کسب کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اور خاص عنایات ربانی و عطائے رحمانی اور اپنی ذاتی ریاضات و مجاہدات سے اپنے مراتب کمال اور منازلِ عرفان میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

عبد صالح ہو مقرب بارگاہِ قدس بندہ ہو، نبی یا امام ہو باوجود روحانیت کی بلند منزل نورانیتِ قلب اور صفائے باطن کے ان سے بشریت کی نفی نہیں ہو سکتی اور نہ مادیت ان میں ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان میں بشری و مادی تقاضے موجود ہیں۔ جیسا کہ نور و بشر کی بحث میں مقتضائے بشریت کی تفصیل گذر چکی ہے۔ اسے سامنے رکھ کر یہی فیصلہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ نبی و امام میں دو پہلو ہوتے ہیں: ۱۔ بشری و مادی ۲۔ روحانی و نورانی، روحانی و نورانی پہلو کے اعتبار سے جب کسی چیز کا علم حاصل کرنا چاہیں تو معلوم کر سکتے ہیں۔ اور جہاں کہیں جانا چاہیں جا سکتے ہیں۔ یہ اس وقت ہے جب چاہیں لیکن ہر وقت نہیں ان کی عام زندگی معمول زمانہ کے مطابق ہوتی ہے۔ معجزانہ زندگی اور غائبانہ اشیاء پر اطلاع ہمہ وقت نہیں ہوتی اور نہ خوارقِ عادات اور کرامات کا ظہور ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ اخبارِ غیب اور معجزات کا اظہار تابع مرضات الٰہی اور نورانی پہلو سے کرامات کا صدور حسب مشیت ایزدی ہوتا ہے۔

کوئی نبی بغیر اذنِ خدا معجزہ نہیں دکھا سکتا ہے وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (پ۱۳ س رعد رکوع ۱۲) کسی پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہے کہ کوئی معجزہ بغیر اذن لا دکھائے۔

اسی طرح امام علیہ السلام جب چاہیں کہ کسی چیز کا علم حاصل کریں کر سکتے ہیں جیسا کہ اصول کافی وغیرہ کی احادیث اس بات کی خبر دیتی ہیں۔ اَنَّ الْاَئِمَّۃَ عَلَیْہِمُ السَّلَامُ اِذَا شَاءُوْا اَنْ یَّعْلَمُوْا شَیْئًا عَلِمُوْا۔ تحقیق ائمہ علیہم السلام جب کسی چیز کو معلوم کرنا چاہیں معلوم کر سکتے ہیں۔ اصول کافی کے باب کا عنوان ہے: اِذَا اَرَادَ الْاِمَامُ اَنْ یَّعْلَمَ شَیْئًا اَعْلَمَہُ اللّٰہُ۔ اصول کافی باب مذکور۔ امام جب کسی چیز کو جاننا چاہے تو خدا اس کو وہ جنوا دیتا ہے۔ اَلْاِمَامُ لَا یَعْزُبُ عَنْہُ شَیْءٌ یُرِیْدُہٗ " امام جس چیز کے جاننے کا ارادہ کرے وہ اس سے مخفی نہیں رہ سکتی۔

یہاں مشیت اور ارادہ کی قید نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہر شئی ہمہ وقت ان کے سامنے نہیں رہتی اور نہ ہر وقت امام کی توجہ اس طرف رہتی ہے وہ عام زندگی عام معمول کے مطابق گزرتے ہیں وقت ضرورت حسب مصلحت باذنِ خدا اور اس کی تعلیم سے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ جس کا ارادہ کرتے ہیں۔

عام شیعہ حضرات نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ نبی و امام علیہما السلام کے سامنے تمام کائنات یعنی سات طبقات زمین کے اور سات طبقات آسمان کے پہاڑوں کی غاریں اور سمندروں کی گہرائیاں ہمہ وقت چوبیس گھنٹے ان کے سامنے یوں رہتی ہیں جیسے دو آنکھوں کے سامنے ہاتھ کی پانچ انگلیاں۔ یہ عقیدہ حقیقت کے مطابق نہیں شیخیت کی پیداوار ہے۔ یعنی ہر وقت ایسا نہیں جب وہ عالم بشریت میں ہوتے ہیں، مادی زندگی کے طور طریقہ پر ہوتے ہیں تو انہیں غیب کی خبر نہیں ہوتی اور نہ کائنات اس طرح ان کے سامنے منکشف ہوتی ہے۔ ان سے وہ تمام چیزیں اس طرح مخفی ہوتی ہیں جس طرح کہ عام انسانوں سے مگر جب وہ روحانی و نورانی پہلو کو استعمال کرتے ہیں اور تقرب خداوندی کے ذریعہ انکشاف اشیاء یا بُعد فاصلہ کو قرب میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام: حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کا قصہ قرآن پاک میں پڑھیں۔ کہ کان کی قوتِ سماعت اتنی

تیز ہے کہ چیونٹی کی آواز سن رہے ہیں اور ان کے وزیر آصف بن برخیا کی روحانی طاقت اتنی ہے کہ آنِ واحد میں بلقیس کو مع تخت جناب سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر کر دیتے ہیں۔ یہ تو ان کے روحانی پہلو کا کمال ہے۔ لیکن خود حضرت سلیمان کے مادی و بشری پہلو کا یہ حال ہے کہ ہد ہد پرندے کی خبر نہیں کہ کہاں ہے۔ دربار لگا ہوا ہے پرندے پر پھیلا کر سایہ فگن ہیں ہد ہد نظر نہیں آیا۔ فرماتے ہیں: وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ۝ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ مِن سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ ۝ (پارہ ۱۹ سورہ نمل آیت ۱۹ تا ۲۲)

حضرت سلیمان نے ایک پرندہ کو نہ پایا تو کہنے لگے مجھے کیا ہے کہ: میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا یا وہ واقعاً کہیں غائب ہے اگر ایسا ہے تو میں اسے سخت عذاب دوں گا یا اسے ذبح کر ڈالوں گا یا وہ کوئی معقول عذر اور واضح دلیل لائے۔ جناب سلیمان نے تھوڑی ہی دیر توقف کیا (ہدہد آگیا) تو اس نے کہا کہ مجھے وہ بات معلوم ہوئی ہے جو آپ تک حضور کو بھی معلوم نہیں اور میں شہر سبا سے ایک تحقیقی خبر لے کر آیا ہوں۔

یہاں سے صاف ظاہر ہے کہ جناب سلیمان علیہ السلام کو ہُدہُد کے بارے میں علم نہ تھا کہ کہاں ہے اور نہ سبا شہر کے متعلق اور نہ ملکۂ سبا کے متعلق کوئی علم تھا۔ مزید اس کی تصدیق اگلی آیت کر رہی ہے۔ کہ ہُدہُد نے آکر جو خبر سنائی اس کی تصدیق کے لئے آپ نے فرمایا: سَنَنظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝ ہم دیکھتے ہیں کہ تو نے سچ سچ کہا ہے یا تو جھوٹا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام

جب حضرت یعقوب علیہ السلام سے حضرت یوسف علیہ السلام غائب ہونے

اور برادرانِ یوسف نے حسد کی بنا پر ان کو کنوئیں میں ڈالا۔ اور خود وہ لوگ روتے ہوئے حضرت یعقوب کے پاس آئے تو یہ عذر کیا کہ ہم لوگ شکار و تفریح میں مشغول تھے اور یوسف کو سامان کے پاس چھوڑا تو ایک بھیڑیا آیا اور یوسف کو کھا گیا۔

لیکن حضرت یعقوب نے انکا عذر قبول نہ فرمایا اور ان کا من گھڑت فسانہ قرار دیا۔ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔ حضرت یعقوب نے کہا (کہ اسے بھیڑیئے نے نہیں کھایا)، بلکہ تمہارے دل نے تمہارے بچاؤ کے لئے ایک بات گھڑی ہے۔ (ورنہ کرتا ضرور پھٹا ہوا ہوتا) پھر اچھا صبر و شکر ہے اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس پر خدا ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے۔ (س یوسف۔ آیت ۱۸)

حضرت یعقوب علیہ السلام کو اتنا تو علم تھا کہ یوسف زندہ ہیں۔ لیکن یہ علم نہیں کہ کہاں ہیں؟ جو کچھ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ہو گزری حضرت یعقوب اس سے بے خبر رہے۔ گریہ کرتے رہے اور زبانِ حال سے یہ کہتے رہے ؎

ترس رہی ہیں تری دید کو جو مدت سے
وہ بیقرار نگاہیں سلام کہتی ہیں

پھر جب بنیامین کو فرزندانِ یعقوب مصر لے گئے۔ غلہ لینے کے لئے اور حضرت یوسف نے پیمانہ بنیامین کے سامان میں رکھ دیا اور چوری کا الزام لگا کر ان کو اپنے پاس رکھ لیا تو برادرانِ یوسف واپس کنعان اپنے باپ کے پاس آئے اور تمام ماجرا صحیح صحیح بیان کیا اس واقعہ کی تفصیل میں برادرانِ یوسف نے کوئی من گھڑت بات نہیں بلکہ حقیقت بیان کی لیکن حضرت یعقوب نے ان کو وہی جواب دیا جو پہلی بار دیا تھا۔ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ۔ بلکہ تمہارے نفسوں نے یہ بات گھڑ لی ہے۔ اچھا صبر و شکر ہے۔

اگر حضرت یعقوب علیہ السلام کو بنیامین کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام

کی کارروائی کا علم ہوتا تو جناب یعقوب وہ سابقہ جملہ نہ دہراتے اور ان کو مورد الزام نہ ٹھہراتے اور نہ ان کے بیان کو جھوٹا سمجھتے۔

قارئین کرام سورہ مبارکہ یوسف کی تفسیر اور تاریخ انبیا علیہم السلام میں اس واقعہ کی تفصیل پڑھیں۔ لیکن ان کے علم کا اور ان کے حواس کی غیر معمولی و غیر عادی تیزی کا واقعہ بھی قرآن میں موجود ہے۔ جس سے اُن کے اس غائبانہ واقعہ کی خبر کا علم ثابت ہوتا ہے۔

جناب یعقوب کی فراقِ یوسف میں گریہ وزاری لگاتار جاری تھی۔ اُن کے فرزند اس دائمی غم و گریہ کو دیکھ کر کہتے ہیں: قَالُوا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتّٰى تَكُونَ حَرَضًا اَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ ۔ قَالَ اِنَّمَا اَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۔ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَاَخِيهِ وَلَا تَيْاَسُوا مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ ط اِنَّهُ لَا يَيْاَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُونَ ۝ (سورہ یوسف۔ آیت ۸۵، ۸۶)

ان کے بیٹوں نے کہا کہ آپ تو ہمیشہ یوسف کو یاد ہی کرتے رہیئے گا یہاں تک کہ بیمار ہو جائیں گے یا جان ہی دے دیں گے۔ یعقوب نے کہا میں تو اپنی بے قراری اور رنج کی شکایت اللہ سے کرتا ہوں۔ اور وہ باتیں میں خدا کی طرف سے جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اے میرے بیٹو! تم جاؤ یوسف اور اسکے بھائی کو تلاش کرو اور خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ کیونکہ خدا کی رحمت سے سوائے کافر لوگوں کے کوئی بھی مایوس نہیں ہوتا۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب یعقوب کو جناب یوسف کی زندگی کا علم تھا۔ اس لئے برادران یوسف کو ان کے ڈھونڈ لانے کا حکم فرماتے ہیں۔ اور ان کی واپسی کے امیدوار بھی تھے رحمتِ خدا سے ناامید نہ تھے۔ خدا کی جانب سے وہ غائبانہ باتیں جانتے تھے جن کا ان کے فرزندوں کو علم نہ تھا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے وطن کنعان میں بیٹھے ہیں اور اہل کنبہ و

خاندان کے افراد بیٹھے ہیں۔ جناب یعقوب کے مشام مبارک غیر معمولی تیزی کا ثبوت دیتے ہیں کہ جناب یوسف کی بُو سونگھتے ہیں۔ بادِ صبا بشارت یوسف دیتی ہے اور حضور فرماتے ہیں: وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَن تُفَنِّدُونِ ۔ جونہی قافلہ مصر سے چلا تو ان کے والد جناب یعقوب نے کہا اگر تم مجھے بہکا ہوا سٹھیایا ہوا نہ سمجھو (تو ایک بات کہوں) یہ بات قرآن پاک سے بھی ظاہر ہو رہی ہے۔

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ۔ فَلَمَّا أَن جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۔ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم آپ یقیناً پرانے بھٹکے ہوئے خیال میں پڑے ہوئے ہیں۔ پس جب خوشخبری دینے والا آیا اور اُن کے (یوسف کے) کرتے کو ان کے (یعقوب کے) چہرے پر ڈالا تو یعقوب فوراً بینا ہو گئے۔ بصارت لوٹ آئی تب یعقوب نے کہا کہ میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں خدا کی طرف سے جو باتیں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

اس وضاحت سے ثابت ہو گیا ہے کہ بعض امور کا علم تو خدا نے حضرت یعقوب کو دیا اور بعض امور کا علم ان کو نہیں دیا گیا۔ اسی طرح ہر نبی و رسول کو تمام کائنات کا کلی طور پر علم نہیں دیا گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام بلند پایہ پیغمبر ہیں۔ خلیل اللہ کے معزز لقب سے سرفراز ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد سلسلہ نبوت آپ ہی کی نسل سے چلا ہے۔ اسلئے آپ کو "شجرۃ الانبیاء" بھی کہا جاتا ہے۔ بیت اللہ خانہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ آپ کا بارہا امتحان لیا گیا اور آپ ہر بار اس میں کامیاب نکلے۔ آپ کو بعض امور کا علم دیا گیا اور بعض امور سے بے خبر رکھا گیا۔ کائنات کے

کل امور کا کل علم چونکہ کسی پیغمبر و امام کو نہیں دیا گیا۔ وقتاً فوقتاً مصلحت و ضرورت کے تحت ان کو مطلوبہ امور کا علم دیا گیا۔ البتہ قوت قدسیہ کے تحت جس وقت وہ کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنے کا ارادہ کریں من جانب اللہ اس کا ان پر انکشاف ہو جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں تمام مخلوقات ان کے سامنے ہمہ وقت حاضر ناظر نہیں رہتی۔

اس کے ثبوت میں قرآن مجید سے حضرت ابراہیم سے متعلق چند واقعات پیش کرتے ہیں۔

ایک بار جناب ابراہیم علیہ السلام کو تمام آسمانوں اور زمین کے طبقات و حالات دکھائے گئے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ (پارہ ۷، سورہ انعام آیت ۷۵)

اسی طرح ہم نے ابراہیم کو سارے آسمانوں اور زمین کی سلطنت کے انتظام دکھائے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔

روایات میں بتایا گیا ہے کہ جناب ابراہیم علیہ السلام کی نظر میں تیزی اور طاقت اس قدر بڑھا دی گئی تھی کہ آسمانوں سے پار چلی گئی اور زمین کے حجابات رکاوٹ نہ بن سکے فضا میں زیر آب غاروں مکانوں میں کوئی چیز آپ کی نظر سے پنہاں نہ رہی۔ تمام واقعات حالات اور جملہ اشیاء کا آپ نے بچشم خود مشاہدہ فرمایا۔

لیکن یہ مشاہدہ صرف ایک بار ہوا بار بار نہیں۔ اب وہ واقعات بھی ملاحظہ کریں جن میں جناب ابراہیم علیہ السلام کے غائبانہ علم کی نفی ہوتی ہے۔

فرشتے قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لئے اترے اور قبل از عذاب حضرت ابراہیم کو فرزند ارجمند کی بشارت دینے کے لئے پہلے حضرت ابراہیم کے پاس آئے۔ تھے تو فرشتے مگر انسانوں کی صورت میں آئے۔ خلیل خدا چونکہ بہت مہمان نواز تھے اور ان کی مہمان نوازی بے نظیر تھی اس لئے ان آدمیوں کو دیکھ کر مہمان سمجھ کر ان سے پوچھے بغیر گھر میں ضیافت کا سامان کرنے کے لئے آئے۔ جناب سارہ سے

دریافت فرمایا کہ مہمانوں کے لئے گھر میں کچھ ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ کچھ نہیں صرف ایک بچھڑا پالا ہوا ہے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ لیکن جناب ابراہیم کو مہمانوں سے زیادہ کوئی شے عزیز نہ تھی۔ اس واسطے وہ پیارا بچھڑا ذبح کر کر گوشت بھون کر مہمانوں کے آگے رکھا۔ انہوں نے کھانے سے معذوری ظاہر کی۔ جناب ابراہیم گھبرا گئے ان پر خوف طاری ہوا کہ کھانے سے انکار کیوں؟ آخر انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ہم تو فرشتے ہیں۔ مادی غذائیں کھانے سے معذور ہیں۔ آپ کو فرزند ارجمند کی خوش خبری دینے کے لئے آئے ہیں۔ اور قوم لوط کو گرفتار عذاب کرنے کے جا رہے ہیں۔ درج ذیل قرآنی آیات یہ واقعہ بیان کرتی ہیں۔

لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۖ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ أَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ فَلَمَّا رَآٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۚ قَالُوْا لَا تَخَفْ إِنَّآ أُرْسِلْنَآ إِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ (سورہ ہود۔ آیت ۶۹-۷۰)

ترجمہ: ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ابراہیم کے پاس خبری لے کر آئے انہوں نے ابراہیم کو سلام کہا۔ ابراہیم نے بھی جواب میں سلام کہا۔ پھر ابراہیم تھوڑی دیر کے بعد ایک بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت لائے پھر جب دیکھا کہ ان مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے تو ان کی طرف سے بدگمان ہوئے اور ان سے خوف محسوس کیا۔ اس بات کو فرشتے سمجھ گئے اور انہوں نے کہا کہ ہم تو فرشتے ہیں قوم لوط کی طرف سزا کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

اگر جناب ابراہیم ان کو پہچانتے تو عزیز بچھڑا کیوں ذبح کرتے؟ کیوں گھبرا جاتے کیوں ڈرتے؟ یہ بات صاف اور واضح طور پر حضرت ابراہیم کی ان فرشتوں سے متعلق بے علمی ظاہر کرتی ہے۔ اب اس کی ہزار تاویلیں کرو۔ بات نہیں بنتی۔ لیکن دستور ہے کہ کوئی غلط بات جب ذہن میں بیٹھ جائے تو ایک ضدی اور ہٹ دھرم آدمی غلطی پر اڑ جاتا ہے اور کئی مسلّمات اور صحیح باتوں کا انکار کر جاتا ہے۔ اور اسی غلط دستور سے مذہب میں کئی غلطیاں داخل ہو جاتی ہیں جو

مذہب کی خرابی و تباہی کا باعث بنتی ہیں۔

انسان سوچ سمجھ کر پہلے ہی صحیح عقیدہ قائم کرے اور اگر کسی عقیدہ یا نظریہ کی غلطی ظاہر ہو جائے تو رواج کے بندھنوں کو توڑ کر عقیدہ بدلنے میں عار محسوس نہ کرے۔ رسم و رواج کے بندھنوں میں الجھ کے نہ رہ جائے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان جناب اسمٰعیل علیہ السلام کی ذبح کے متعلق بتا رہا ہے کہ جناب ابراہیم کو ہرگز معلوم نہ تھا کہ اسمٰعیل بچ جائے گا۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ اسمٰعیل بچ جائے گا تو پھر امتحان بے مقصد اور اس میں کامیابی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے نہ اسمٰعیل کا صبر اور نہ ابراہیم کا صبر بلکہ یہ صرف ایک مذاق اور ڈرامہ رہ جاتا ہے نہ ابراہیم تعریف کے قابل اور نہ اسمٰعیل مدح کے لائق۔ اور قربانی کی سنت جاریہ ایک قربانی ایک صبر ایک آزمائش کی یاد نہیں بلکہ ایک ڈرامہ کی یادگار ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ جناب ابراہیم کو علم تھا کہ اسمٰعیل ذبح تو ہو گا نہیں چلو ایک ڈرامہ رچالیں، معاذ اللہ، ایک غلط عقیدہ اور غلط نظریہ قائم کر لینے اور اس پر اڑ جانے سے ایسی خرابیاں لازم آتی ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام

اسم گرامی تالیا بن ملکان بن عابر بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام لقب خضر ہے۔ جس خشک گھاس پر بیٹھتے ہرا ہو جاتا اور جس خشک لکڑی سے سہارا لیتے سرسبز ہو جاتی۔ پیغمبروں میں علوم و کمالات میں یکسانیت نہیں اختلاف مدارج ہے۔ فضائل میں برابری نہیں تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ ۳ پارہ ۲۔ آیت ۱) ان رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

ان نبیوں میں سے ایک امتیازی خصوصیت کے مالک یعنی علم باطن و علم لدنی کے حامل جناب خضر علیہ السلام ہیں۔ جن کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ہم نے اسے اپنے

ہاں سے رحمت بخشی اور اسے اپنے ہاں سے علم عطا فرمایا۔

جناب موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت اور صاحب کتاب نبی بھی ہیں اور رسول بھی لیکن علم کی کمی ہے۔ خدائے عزوجل سے ہم کلام ہونے اور وادی مقدس میں خالق کریم اور مالک رحیم سے سوال وجواب کرنے کا شرف انہیں حاصل ہے۔ لیکن اس فضل وشرف کے باوجود حضرت خضر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر علم لدنی حاصل کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔ علم کے معاملہ میں شاگرد بن کر اور ان کو استاد مان کر ان سے علم لدنی سیکھنے کی استدعا کرتے ہیں۔ جیسا کہ مذکور ہے۔ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا۔ موسیٰ نے کہا کہ آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ رہوں اس شرط پر آپ خدا سے سیکھے ہوئے علم میں سے مجھے بھی کچھ سکھائیں۔ آخرکار ساتھ ہو لئے ہم سفر ہو گئے تین واقعات پیش آئے۔ کشتی میں خرابی پیدا کرنا۔ لڑکے کا قتل کرنا۔ دیوار کا درست کرنا۔ ظاہر و باطن کی نبرد آزمائی تھی۔ ظاہر بین نگاہیں ظاہری غلطی کو برداشت نہ کر سکیں اور باطنی امور سے باخبر غلطی سے معدوم نظر صاحب شریعت، رسول کے اعتراض کو گستاخی پر محمول کر رہی تھی۔ جناب موسیٰ جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ باوجود استاد کی تاکیدی نصیحت کے برداشت نہ کر سکے ان تینوں پر اعتراض کر دیا۔ جناب خضر علیہ السلام نے جناب موسیٰ علیہ السلام کی تسلی کر دی۔ ظاہری غلطی کو باطنی صحت میں تبدیل کر کے واقعہ کی خفیہ حقیقت کا اظہار کر دیا۔ اور حضرت موسیٰ کو اپنی صحبت میں نہ رکھ سکے اور ان کو رخصت کر دیا۔ حضرت کلیم اللہ حضرت کے ساتھ واپس آ گئے۔

اس قصہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت موسیٰ میں غائبانہ علم کم تھا اور حضرت خضر میں زیادہ یعنی بعض امور کا علم حضرت موسیٰ کو تھا اور بعض کا نہ تھا۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام سے جناب امیرالمومنین علی علیہ السلام کا علم زیادہ تھا جیسا کہ روایات اہل بیت علیہم السلام سے مستفاد ہے۔ تفاسیر اور

احادیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جناب خضر علیہ السلام باوجود عالم علم لدنی ہونے کے بعض امور کے علم سے محروم ہیں۔ کیونکہ جناب امیر علیہ السلام سے کم علم ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض امور کا علم حضرت علی علیہ السلام کو تھا اور حضرت خضر علیہ السلام کو نہ تھا۔

حدیث میں منقول ہے کہ جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کے پاس حضرت خضر سے واپس آئے تو حضرت ہارون نے اس علم کے بارے میں جو جناب خضر سے حاصل ہوا تھا اور عجائب دریا کے بارے میں سوال کیا۔ موسیٰ نے کہا میں اور خضر دریا کے کنارے کھڑے تھے ناگاہ ہم نے دیکھا کہ ایک پرندہ دریا کی جانب فضا سے آیا اور اپنی منقار میں ایک قطرہ اٹھا لیا اور مشرق کی جانب پھینک دیا پھر ایک قطرہ لے کر مغرب کی جانب پھر ایک قطرہ لے کر آسمان اور ایک قطرہ پھر اٹھا کر زمین کی طرف پھینکا اور ایک قطرہ پھر اٹھا کر دریا میں ڈال دیا۔

جناب موسیٰ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے جناب خضر سے اس پرندے کے اس عجیب فعل کا سبب دریافت کیا جناب خضر نے بھی اس مقام پر اپنی لاعلمی ظاہر کی۔

ناگاہ ایک شکاری کو میں نے دیکھا جو لب دریا مچھلی کا شکار کر رہا تھا میں نے اس سے اس پرندہ کے فعل کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا کہ میں صیاد ہوں اور اس کے فعل کا سبب جانتا ہوں۔ لیکن تم پیغمبر ہوتے ہوئے بھی نہیں جانتے ہم نے کہا کہ ہم تو بس اتنا ہی جانتے ہیں جتنا خدا نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ صیاد نے کہا کہ یہ وہ پرندہ ہے جس کو دریا میں مسلم کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی آواز میں بھی مسلم مسلم کہتا ہے۔ اس کے اس فعل سے اشارہ یہ ہے کہ خدا تمہارے بعد ایک پیغمبر بھیجے گا۔ جس کی امت مشرق و مغرب میں پھیلے گی، آسمان پر بھی جائے گی زیر زمین بھی ہو گی اور اس پیغمبر کے علم کے مقابلہ میں دوسرے تمام عالموں کا علم اتنا ہو گا جتنا یہ قطرہ اس دریا کے مقابلہ میں ہے اور اس پیغمبر کا علم

میراث میں اس کے چچا زاد بھائی اور وصی کو پہنچے گا۔

جناب موسیٰ نے بیان جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا کہ اے ہارون اس وقت ہم دونوں کا علم خود ہم کو کم معلوم ہوا۔ اس اثنا میں وہ صیاد ہماری نظروں سے غائب ہو گیا تو ہم لوگوں نے سمجھا کہ وہ فرشتہ تھا اور خدا نے ہماری تادیب کے لئے اسے بھیجا تھا۔ (حیات القلوب وغیرہ حالات حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام)

مزید براں اس واقعہ سے ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ حضرت موسیٰ کو حق تعالیٰ نے حضرت خضر کے پاس کیوں بھیجا؟ خود براہ راست حضرت کلیم کو علم لدنی کیوں نہ عطا فرمایا۔ جب کہ تکلم کے شرف سے نوازا ہوا تھا۔ غالباً جناب موسیٰ کو غصہ اور جذبات کی تیزی کے انجام سے آگاہ کرنا مقصود تھا کیونکہ جناب موسیٰ غصیلے اور جذباتی پیغمبر تھے۔ ایک قبطی کو گھونسا مار کر ہلاک کر دینا۔ توراۃ کی تختیوں کو پھینک دینا۔ حضرت ہارون برادر اکبر پر سخت غصے ہونا۔ یہ غضبناکی اور ہیجان جذبات کی دلیل ہے۔ عجلت اور عدم تحمل کا ثبوت ہے جذباتی آدمی عموماً صابر نہیں ہوتے۔ حضرت خضر علیہ السلام کا یہ فرمان: اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۔ بے شک آپ میرے ساتھ صبر و تحمل کی طاقت نہ رکھ سکیں گے۔ نفی صبر کی واضح دلیل ہے۔ اگر حضرت موسیٰ صبر و تحمل کی طاقت رکھتے جذبات پر قابو پا لیتے اعتراض نہ کرتے تو یہ صحبت طولانی ہوتی۔ مگر اعتراض اور مکرر اعتراض نے صحبت کے شرف سے محروم کر دیا اور "هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ" کہہ کر حضرت خضر نے جناب موسیٰ کو واپس کر دیا۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے: کہ جب ایک معصوم پیغمبر، صاحب عزم نبی، صاحب شریعت رسول۔ اپنے استاد پیغمبر کے کسی فعل پر اعتراض کرتا ہے اور اسے غلطی پر محمول کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اسے شرف صحبت سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ اور پیغمبر کی رفاقت سے علیحدگی اختیار کرنی پڑتی ہے تو جب غیر پیغمبر غیر معصوم سید المرسلین خاتم النبیین جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے کسی فعل پر اعتراض کرے اسے غلطی کی جانب نسبت دے بلکہ اس کی عقل اُسکے اجتہاد کو غلط قرار دے تو ایسے شخص کو پیغمبر کی صحبت سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اسے شرفِ صحبتِ پیغمبر کا تربیت یافتہ کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے؟

ہاں وہاں چونکہ نیت بد نہ تھی، گستاخانہ ذہنیت نہ تھی، غلط فہمی تھی اور وہ غلط فہمی ایک گونہ حق پر مبنی تھی۔ صرف برزبانیت اور نرم سبر تھا اس واسطے استاد پیغمبر نے نرم الفاظ استعمال فرمائے: "هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ"۔ اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی ہے۔ لیکن دوسری جگہ نیت بد ہے۔ ذہنیت گستاخانہ ہے۔ دل میں منصوبہ کچھ اور ہے۔ استاد پیغمبر کے منصوبہ کو ناکام بنانے کے علاوہ ان کی عقل اور ان کے ہوش و حواس پر بھی حملہ ہے۔ لہٰذا یہاں پیغمبر علیہ السلام کو "قُوْمُوْا عَنِّيْ" کے سخت الفاظ استعمال کرنے پڑے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے اور یہ جملہ صحیح ہے اور اس کی صحت میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ کتب فریقین نے اسے اپنے صفحات میں محفوظ رکھا ہوا ہے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مالک خلق عظیم کے اس جملے نے گستاخ اور باغی صحابیوں کی صحابیت ختم کر دی اور یہ لوگ مجلس پیغمبر سے شرف صحابیت کا لباس اتار کر نکلے۔ اب ان کا شمار زمرہ اصحاب میں نہیں ہونا چاہیئے۔ مطرود بین بارگاہ نبوی سمجھنا چاہیئے۔ تاکہ وقتیکہ مثل آدم ان کی توبہ طلب عفو اور حضور پاک کی جانب سے معافی اور قبولیت کا ثبوت نہ مل جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اقلیم زہد کے شہنشاہ لذائذ دنیا سے بے رغبتی کا بلند پایہ نمونہ ملکِ روحانیت کے تاجدار حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام عصمت مآب ماں کے معصوم فرزند مادی آلائشوں سے منزہ پیغمبر صاحب معجزات و کمالات ہیں۔ آپ بیماروں

کو تندرست کوڑھی کو اچھا۔ اندھوں کو بینا اور مردوں کو باذن اللہ زندہ کر دیتے تھے۔ مٹی سے پرندہ کی شکل بنا کر اس میں روح پھونک کر اللہ کے اذن سے جاندار پرندہ بنا کر فضا میں اڑا دیتے تھے۔ مزید براں اللہ کی طرف سے عطا کردہ غائبانہ علم میں سے لوگوں کو ان کے گھروں میں جمع شدہ ذخیرہ کی اطلاع بھی دے دیتے تھے۔ جیسا کہ کلام پاک میں مذکور ہے۔ مگر ایک مقام پر خود اپنے علم کی کمی کا اظہار کرتے ہیں۔

خالق کریم نے جناب عیسیٰ علیہ السلام سے ایک استفسار کیا ہے جس کا بہترین جواب جناب عیسیٰ نے دیا ہے اور مقصود اس استفسار سے امت عیسیٰ علیہ السلام کی اصلاح وہدایت ہے۔ ملاحظہ ہو: وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝ (سورہ مائدہ آیت ۱۱۶) اور جب اللہ نے عیسیٰ بن مریم سے کہا کہ کیا تو نے ہی لوگوں سے کہا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو اللہ کو چھوڑ کر۔ عیسیٰ نے کہا اے اللہ تو ہر نقص اور شریک سے پاک ہے میں ایسی بات کیوں کہوں جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں اگر میں نے کہا ہوتا تو تجھے اس کا علم ہوتا کیوں کہ تو وہ سب کچھ جانتا ہے جو میرے اندر ہے لیکن میں وہ نہیں جانتا جو کچھ تیرے پاس ہے۔ بے شک تو ہی غیبوں کا جاننے والا ہے۔

اس مقام پر جناب عیسیٰ نے اپنے علم کو محدود اور اللہ کے علم کو غیر محدود بتایا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سیاح بھی تھے۔ ایک جگہ خوشی کی تقریب تھی دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شادی ہے اور لوگ خوشیاں منا رہے ہیں۔ آپ نے پیشین گوئی فرمائی کہ آج محفل سرور ہے۔ کل نوحہ و ماتم کرو گے۔ دریافت کرنے پر بتایا کہ جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہے آج رات مر جائے گی۔ دوسرے دن لوگ پتہ کرنے

گئے تو پتہ چلا کہ وہ لڑکی زندہ ہے۔ اور تقریب خوشی دھوم دھام سے منعقد ہے حضرت عیسیٰ کی پیشین گوئی صحیح نہیں نکلی۔ لوگوں نے آکر حضرت عیسیٰ سے دریافت کیا اے روح اللہ! آپ نے فرمایا تھا کہ دلہن آج رات مرجائے گی، مگر وہ تو زندہ ہے۔ آپ نے فرمایا خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ مگر آؤ چل کر دیکھیں تو سہی۔ آپ اس شادی والے گھر تشریف لائے۔ صاحب خانہ سے اجازت چاہی کہ ہم تمہاری دلہن سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ وہ شخص دولہا اپنی بیوی کے پاس آیا اور کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دروازے پر تشریف لائے ہیں اور تم سے کچھ باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لڑکی نے چادر اوڑھ اور گھونگھٹ کر کے کہا کہ ان کو بلا لو۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام آئے اور دریافت کیا کل شب تو نے کون سا نیک عمل کیا۔ اس دلہن نے جواب دیا کہ کل شام کو ایک سائل ہمارے دروازہ پہ آیا اس نے سوال کیا چونکہ گھر والے شادی کے کاموں میں مصروف تھے کسی نے سائل کی بات نہ سنی۔ میں نے چادر لپیٹی اور سائل کو جا کر خیرات دے آئی اور کسی نے مجھے پہچانا نہیں۔ حضرت نے فرمایا اچھا ذرا اپنا بستر تو چھوڑ دو۔ وہ عورت اپنے بستر سے الگ ہوئی آپ نے بستر کو جھاڑا تو ایک سانپ مثل کھجور کی شاخ کے نکلا جس کے منہ میں کوئی چیز تھی اور اس چیز کی وجہ سے وہ سانپ ڈسنے پر قادر نہ ہوا۔

آپ نے فرمایا تیری موت تو آچکی تھی اور اسی سانپ کی وجہ سے تھی لیکن تیرے صدقہ و خیرات نے اس بلا کو تجھ سے دور کیا اور موت کو ٹال دیا۔

استقصار الافحام حضرت مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ لکھنوی

حیات القلوب۔ اعلی اللہ مقامہ بحث بدا

اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کو حتمی علم نہ تھا۔ محو و اثبات تک محدود تھا۔ پیش گوئی صحیح ثابت نہ ہوئی۔ مزید براں موت کے ٹلنے زندگی بڑھنے اور بلا کے دور ہونے کا سبب بھی معلوم نہ تھا۔ دلہن کے گھر آکر سبب حیات کا انکشاف ہوا۔ معلوم ہوا کہ علم غیب کلی نہیں۔ اور حضوری نہیں مستفاد ہے۔

خاتم النبیین اشرف المرسلین
حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اولاد آدم کے سردار، مملکت کونین کے تاجدار، علت غائیہ ممکنات سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ آپ انبیاء و رسل کے امام ہیں بعد از حق تعالیٰ آپ ہی سب سے بزرگ اور اشرف و افضل ہیں۔

آپ کے غائبانہ علم کے متعلق قرآن مجید میں وضاحت موجود ہے۔ کچھ آیات ایسی ہیں جو آپ کے غائبانہ علم کی صراحۃً نفی کرتی ہیں اور بعض آیات آپ کے من جانب خدا عطا کردہ علم کو ثابت کرتی ہیں۔ پہلے ہم دونوں قسم کی آیات مع ترجمہ تحریر کرتے ہیں پھر ان سے مطالب کا استنباط کریں گے۔ پہلے ہم وہ آیات درج کرتے ہیں جو علم غیب کی نفی کرتی ہیں :-

۱ : قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَیَّ (پ۔ س انعام ع ۱۱) اے رسول آپ کہدیں کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں جو خدا کی طرف سے وحی آتی ہے میں تو بس اس کی پیروی کرتا ہوں۔

۲ : وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ٥ (پ س اعراف ع ۲۳) اگر میں غیب جانتا ہوتا تو میں بہت سا فائدہ اکٹھا کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف برائی نہ پہنچتی میں تو صرف ڈرانے والا خوشخبری دینے والا ہوں۔ ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔

۳ : قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (پ س نمل ع ۱)

اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ آسمانوں اور زمین کے غیب کو سوائے خدا کوئی نہیں

جانتا۔

۴۔ وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (پ۱۴ س نحل ع ۱۰) آسمانوں اور زمین کے غیب خدا ہی کے لئے مخصوص ہیں۔

۵۔ وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَا اِلَّا ھُوَ۔ (پ۷ س انعام ع ۱۳) تمام غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔

۶۔ وَمِمَّنْ حَوْلَکُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَھْلِ الْمَدِیْنَۃِ مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُھُمْ نَحْنُ نَعْلَمُھُمْ۔ (پ۱۱ س توبہ آیت ۱۰۱) تمہارے آس پاس کے دیہاتوں میں سے اور خود مدینہ والوں میں سے کچھ منافق لوگ ہیں جو منافقت پر ڈٹ گئے ہیں۔ اے رسول تم انہیں نہیں جانتے ہم ان کو جانتے ہیں۔

۷۔ وَلَا اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَیْبَ۔ (پ۱۲ س ہود آیت ۳۱) نہ میں کہتا ہوں کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔

یہ آیات قرآن مجید کی ہیں۔ ان کے معانی بھی صاف ظاہر ہیں اور کھلے طور بیان کر رہی ہیں کہ سوائے خدا کے علم غیب کوئی نہیں جانتا خواہ رسول ہو، یا وصی، ملک ہو یا نبی، امام ہو یا ولی کوئی بھی اپنے طور پر غیب دان نہیں۔ ان آیات کو نہ تو قرآن سے نکال سکتے ہیں نہ دکھا سکتے اور نہ انکار کر سکتے ہیں۔

اگر ہم قرآن کو اللہ کا کلام مانتے ہیں اور عقائد و ہدایات کی اولین بنیادی کتاب تصور کرتے ہیں تو پھر پرانے بندھنوں کو توڑنا اور پرانے غلط عقیدوں اور باطل خیالات کو دماغ سے نکالنا پڑے گا کہ سب کچھ تمام آئینہ کی مانند ان کے سامنے ہے اور کائنات ان کے سامنے جنتی رہی۔ لیکن ان آیات نے عطائی اور وہبی علم کی نفی نہیں کی صرف اس بات کی نفی ہے کہ وہ ذاتی طور پر غیب نہیں جانتے۔

وہ آیات جو من جانب اللہ ان کو غیب پر مطلع کرنے اور غیب کا علم عطا کرنے کو ثابت کرتی ہیں، یہ ہیں :۔

۱۔ عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ۔ (پ ۲۹ س جن ع۱) وہی غیب کا عالم ہے وہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر جس رسول کو پسند کرے۔

۲۔ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ (پ ۴ س آل عمران ع ۹) اللہ تمہیں غیب پر مطلع نہیں کرنے کا مگر اپنے رسولوں میں جسے چاہے اس بات کے لئے چن لیتا ہے۔

۳۔ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (پ ۳۰ س تکویر) وہ غیب ظاہر کرنے میں بخیل نہیں۔

۴۔ تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا۔ (پ ۱۲ س ہود آیت ۵۱) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے بذریعہ وحی ہم تیری طرف بھیج رہے ہیں اور اس سے پہلے ان خبروں کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی۔

۵۔ ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ مَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ۔ (پ ۱۳ س یوسف) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے بذریعہ وحی تیری طرف بھیجتے ہیں اے رسول تو ان کے پاس اس وقت موجود نہ تھا جب ایک امر پر اتفاق کر کے وہ مکر کر رہے تھے۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ گو نبی و مرسل، امام و وصی ذاتی طور پر غیب داں نہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کو علم غیب عطا فرماتا ہے۔ اور من جانب اللہ یہ غیب جانتے ہیں اور بغیر تعلیم الٰہی یہ کچھ نہیں جانتے۔ اب یہ کہنا کہ جانتے ہیں اور ان کو کتنا علم دیا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمارے امکان بلکہ بشری مقدور سے باہر ہے۔ دینے والا جانے اور لینے والے جانیں۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ جتنا اُن کے مرتبہ و مقام کے لئے ضروری اور مناسب ہے اور جتنا یہ لے سکتے ہیں۔ اتنا ہی عطا فرماتا ہے۔ وہ مصلحت و ضرورت کو جانتا ہے۔ یعنے

والے کے ظرف قابلیت کی وسعت کو جانتا ہے۔ وہ خود بخیل نہیں۔ نہ کُل کا کُل عطا فرماتا ہے کہ جتنا علم اس کا ہے سارے کا سارا دیدے۔ اور نہ اس قدر بخیل ہے کہ اپنی عطا پر پابندی لگا دے۔ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ عام مخلوق سے زیادہ اور خالق سے کم ہے۔ نہ جزئی میں محدود کر سکتے ہیں اور نہ کل کہہ سکتے ہیں البتہ مخلوق کے مقابلہ میں کل اور خالق کے بالمقابل جزئی ہے۔

اور جو عطا ہے وہ بذریعہ وحی ہے، بذریعہ الہام ہے، بذریعہ خواب ہے۔ اور بذریعہ "روح القدس" ہے۔ یہی ذرائع علم غیب عطا کرنے کے ہیں۔ اس کے علاوہ غیب جاننے کا اور کوئی ذریعہ نہیں اور اسی پر علماء اعلام شیعہ کا اتفاق ہے۔

ایک آیت کو کچھ لوگ "کل علم" عطا کرنے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں وہ آیت اور ان کا استدلال ہدیہ قارئین ہے۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ہ (پ ۵ س نساء رکوع ۵) تجھے سب کچھ وہ تعلیم کیا جو تو نہیں جانتا تھا اور خدا کا فضل تجھ پر بہت بڑا ہے۔

اس آیت سے وجہ استدلال یہ ہے: کہ لفظ ما لغت عرب میں عموم کا معنی دیتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ عام پر شامل ہے۔ کہ جو کچھ تو نہیں جانتا تھا وہ سب کچھ بتا دیا۔ سلب و نفی کے بالمقابل ایجاب ہے۔ اور اس سے کل علم غیب کی تعلیم ثابت ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے کسی خاص مقرب بندے پر انعام کرے تو اس سے کسی دوسرے کو درد کیوں ہو۔ اسے بلا چون و چرا مان لینا چاہیے بلکہ اس پر مسرت کا اظہار کرنا چاہیے۔ لیکن اگر ثبوت نہ مل سکے اور کل علم عطا کرنے کی نفی ثابت ہو تو آیات کے معانی بدلنے من مانی غلط تاویلیں کرنے اور قرآن مجید کی آیات و مطالب کو اپنے خیال کے تابع کرنے اپنی مرضی کے مطابق مروڑنے کی مذموم کوشش کی کیا ضرورت ہے۔ وہی عقیدہ کیوں نہ اختیار کیا

جائے جس کی خود خدا اور اس کا رسول تعلیم دے۔ خواہ سابق عقیدہ سے دستبردار ہونا پڑے۔

اس عقیدہ کی غلطی اور اس خیال کا بطلان تو ثابت ہو گیا کہ تمام کائنات ان کے سامنے ہے اور علم غیب ان کا ذاتی علم ہے۔ عالم بنتا رہا اور یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ان کا علم عطائی اور وہبی ہے۔ اگر آنکھوں سے عالم بنتا ہوا دیکھتے تمام اشیاء ہر دم سامنے ہوتیں تو ذاتی علم ہوتا۔ وہبی اور عطائی نہ ہوتا۔

مذکورہ بالا آیات سے ان کا علم کلی ثابت نہیں ہوتا۔ لغت عرب کے لحاظ سے ہر عام عام نہیں رہتا بلکہ قرآن اور دوسرے دلائل اس کی تخصیص کر دیتے ہیں۔ مثال مشہور ہے کہ مَامِنْ عَامٍ اِلَّا وَقَدْ خُصَّ " کوئی ایسا عام نہیں مگر اس کی تخصیص کی گئی ہے۔ اور وہ قرینے اور دلیلیں قرآن مجید کی وہ آیتیں ہیں جن میں یہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں لفظ مَا بھی ہے اور وہی جملے ہیں جو سابقہ آیت میں استعمال کئے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ (پ۳۰ س علق) اے پیغمبر! اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے۔ پڑھ اور تیرا پروردگار بڑا کرم کرنے والا ہے۔ اس نے قلم کے ذریعہ سکھایا انسان کو۔ وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اس جگہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ہے وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ۔ ایک معنی و مفہوم کے جملے ہیں ایک ہی مصدر کے مشتق اور دونوں میں لفظ مَا عامہ استعمال ہوا ہے۔ کیا انسان کو کلی علم دیا ہے؟ ہر انسان کل علم رکھتا ہے؟ اگر اس جگہ آیت " کل علم " کا معنی دے تو اس جگہ آیت " کل علم " کا معنی دے تو اس جگہ بھی " کل علم " کا معنی ضرور دے گی۔ حالانکہ یہاں کل علم مراد لینا عقل کے نقل کے اجماع و اتفاق مسلمین کے خلاف

ہے۔ اسی مضمون کی ایک تیسری آیت بھی ہے: كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (پ۲ س البقرہ آیت ۱۵۱) جیسے کہ تم میں تم ہی سے ہم نے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سنائے اور تم کو پاکیزہ کرے۔ اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور تم کو وہ باتیں بتائے جو تم کو معلوم نہیں تھیں۔

ان تینوں آیات میں لفظ مَا عامہ بھی آیا ہے اور ایک ہی مصدر کے مشتقات استعمال ہوئے ہیں۔ میں آیت مذکورہ سے "کلی علم" کا استدلال کرنے والے اصحاب سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو "کلی علم" عطا فرمایا ہے۔ کیا رسول پاک نے اپنی امت کو عام اور تمام امت کو "کلی علم" سکھایا ہے۔ اور اگر ان پچھلی دو آیتوں سے "کلی علم" ثابت نہیں ہوتا تو پہلی آیت سے کلی علم کا استنباط کس طرح کیا جاتا ہے؟ جب کہ ہر آیت میں ایک ہی مادہ ایک ہی مصدر ایک ہی قسم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

دراصل تعلیم کا دائرہ متعلم کی نوعیت اور اس کے مقام و مرتبہ کے مطابق ہوتا ہے۔ عام انسانوں کو بحیثیت ایک انسان کے زندگی گذارنے اور اصول و قواعد حیات تمدن و معاشرت کے لئے جتنے علم کی ضرورت ہے۔ اتنا علم عام انسان کو دیا۔ یہ انسان کا دائرہ تعلیم ہے۔

امت محمدیہ کو شرائع اور مذہبی علوم کی بحیثیت امت کے جس قدر ضرورت تھی پاک پیغمبر علیہ السلام نے اس کو تمام علم ضروری مسائل شرعیہ تاریخ و تفسیر و حدیث و فقہ وغیرہ تعلیم کئے۔ جو قبل ازیں وہ امت ان مسائل و احکام سے ناواقف تھی۔ یہ امت کا دائرہ تعلیم ہے۔

اسی طرح اللہ سبحانہٗ نے اپنے محبوب پیغمبر جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو جس قدر علوم کی بحیثیت ایک نبی و مرسل خاتم النبیین اشرف المرسلین کے ضرورت تھی وہ علوم عطا فرمائے۔ جو قبل ازیں وہ نہ جانتے تھے۔

دائرہ تعلیم کے مطابق کل ہیں اور علوم خدا کے مقابل جزئی ہیں۔ یہ ختم المرسلین کا دائرہ تعلیم ہے۔

مثال کے طور پر ایک معلم آٹھویں دسویں جماعت کو امتحان کے لئے تیار کرتا ہے۔ کورس ختم کرنے کے بعد اپنے شاگردوں سے کہتا ہے کہ لو اب امتحان کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں نے تمہیں سب کچھ پڑھا دیا ہے۔ جو باتیں آپ نہ جانتے تھے میں نے آپ بتا دی ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ دسویں جماعت کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے جس قدر تمہیں پڑھانا تھا میں نے سب کچھ پڑھا ہے۔ اس جماعت کے دائرہ تعلیم کے مطابق کل ہے۔ لیکن کل علوم کے مقابلہ میں جزئی ہے۔ ہر ایک کا ایک محدود اور معین نصاب تعلیم ہے۔ عام انسان کا نصاب بھی عام امت کا نصاب تعلیم ایک نبی و رسول کا نصاب تعلیم ہے۔ نصاب ہر ایک کا محدود اور معین ہے۔ مگر کل کے کل نصاب کی تعلیم دی یہ کل اپنے مقام پر کل ہے۔ لیکن مافوق کے مقابلہ میں جزو ہے۔

اسی قاعدہ کی تاویل پر لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۔ وَ كُلَّ شَیْئٍ اَحْصَيْنَاهُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۔ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَیْئٍ وغیرہا کی عمومیت مختص کی جا سکتی ہے۔ یعنی دین شریعت کی ہر بات اور وہ تمام علوم جن کی نبی امام کو بحیثیت مرتبہ و مقام ضرورت ہوتی ہے۔ یا قرآن میں وہ تمام علوم جمع کر دیئے گئے ہیں جو قرآن میں شامل کرنے ضروری تھے۔

ہم قبل ازیں واضح طور پر بار بار لکھ آئے ہیں کہ حضور رسالت مآب اور ائمہ معصومین صلوۃ اللہ و سلامہ علیہم اجمعین اپنے نورانی قلب صفائے باطن عصمت و طہارت اور قوۃ قدسیہ کی بنا پر جس چیز کا جہاں اور جس وقت علم حاصل کرنا چاہیں۔ اللہ سبحانہ کے اعلام و تعلیم سے حاصل کر سکتے ہیں، جان سکتے ہیں معلوم کر سکتے ہیں۔ اور جہاں جانا چاہیں باذن خدا جا اور جسے اپنے پاس بلانا چاہیں باذن اللہ بلا سکتے ہیں لیکن ایسے امور کے لئے اذن خدا کی ضرورت

ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جتنے ہی معجزات دکھاتے تھے۔ سب باذن اللہ تھے
کیونکہ کوئی معجزنما اس وقت تک معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ جب تک اذن خدا نہ
ہو۔ وہ امر الہٰی کے پابند ہوتے ہیں۔ اور ہم یہ بھی ظاہر اور ثابت کر چکے ہیں کہ
کسی نبی رسول اور امام کے پاس کلی علم ہمہ وقت نہیں ہوتا۔ کبھی ہوتا ہے کبھی
نہیں ہوتا۔ بعض چیزوں کا ہوتا ہے بعض کا نہیں ہوتا۔ بعض چیزوں کا علم اپنی
روحانیت، نورانیت نبوت و امامت کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں اور بعض کا صرف
مادی ذرائع سے۔ بعض اوقات صرف بشری حقیقت سے طالب مصلحات ہوتے
ہیں۔ اور مادی وسائل سے وہ مصلحات حاصل کرتے ہیں اور بعض اوقات وہ
روحانی اور قوت قدسیہ کے ذریعہ اشیاء کا انکشاف چاہتے ہیں۔

اپنے اس بیان کا ثبوت ہم ان کی زندگی کے مسلمہ اور صحیح واقعات سے
پیش کرتے ہیں۔ جب ہم چہاردہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگیوں اور
ان کے معمولات کا مطالعہ کرتے ہیں تو بالکل بشری زندگی نظر آتی ہے۔ اور
عام حالات بشری کے مطابق وہ زندگی بسر کرتے ہیں گو ان کی زندگی مادی
آلائشوں اور دنیوی گندگیوں سے پاک و صاف اور روحانیت کا اعلیٰ نمونہ
ہوتی ہے۔ مگر معمولات زمانہ کے عام مطابق ہوتی ہے۔ ان کے غائبانہ علم کا
بعض اوقات ظہور ہوتا ہے اور بعض اوقات نہیں بھی ہوتا۔

تاریخ اور صحیح تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بارہا بعض اشیاء کے متعلق حضورؐ
نے دریافت فرمایا جن کا ان کو پہلے سے علم نہ تھا۔ واقعات پڑھیں تو آپ
کو پتہ چلے گا۔

بعض حضرات اس مقام پر یہ ناتسلی بخش جواب پیش کرتے ہیں کہ حضور
علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دریافت فرمانا اپنی آگاہی کے لئے نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ
دوسروں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے آپ سوالیہ انداز اختیار فرماتے تھے پہلے
تو یہ انداز اختیار کرنا ہر مقام پر ایک معلم اور ہادی کے شایانِ شان نہیں،

نبی خود معلم ہوتا ہے۔ اپنی زبان اور اپنے عمل سے تعلیم دیتا ہے۔ بعض اوقات تو دوسروں کے سمجھانے کے لئے اس قسم کا سوال ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر وقت اور ہر مقام پر نہیں ہوتا۔ اگر ان کی دریافت اور استفسار کو ہر وقت اور ہر مقام پر اعلام غیر پر محمول کیا جائے تو ایک مذاق اور متانت و سنجیدگی سے خالی دستور و معمول قرار پائے گا۔ ایک دن میں کتنی بار دریافت امور کرتے تھے۔ کیا انہوں نے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ اپنی زبان سے کچھ نہ بتائیں اور غیروں سے کہلواتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ غیروں کو بتانے اور سمجھانے کے لئے یہ معمول اس وقت نتیجہ خیز اور فائدہ مند ہو سکتا ہے کہ جب غیر موجود ہوں اور ایسے غیر ہوں جن کو اس انداز سے سمجھانا مقصود ہو۔ جب غیر موجود ہی نہ ہوں اور یا غیر ہی سب اپنے ہوں تو وہاں دریافت فرمانا پوچھنا کس معنی پر محمول پر ہوگا؟ خصوصاً جب حضور پاک اور صرف جناب جبریل ہوں اور حضور بار بار جناب جبریل سے دریافت کریں کہ یہ کیا ہے؟ یہ کیا چیز ہے؟ اس کا کیا نام ہے؟ یہ کون ہے؟ یہاں کیوں ہے؟ یہ کب سے ہے؟ اور جناب جبریل بتاتے جائیں، یہ فلاں ہے اس کا نام یہ ہے۔ اور حضور مطمئن ہوتے جائیں تو حضرات آپ کیا نتیجہ اخذ کریں گے؟ وہاں کون ایسا غیر ساتھ تھا جس کو اپنی زبان سے نہیں جبریل کے ذریعہ سمجھانا چاہتے تھے؟

کسی معتبر تاریخ و تفسیر میں معراج کا واقعہ پڑھیں۔ بیت المقدس سے لے کر سدرۃ المنتہیٰ تک جناب جبریل آپ کے ہم سفر ہے اور ہر مقام پہ آپ نے ان دیکھی چیزوں کے متعلق جبریل سے دریافت کیا۔ فرشتوں کے متعلق پوچھا انبیاء کے بارے میں دریافت کیا۔ آسمانوں کی سیر کی تو پوچھا۔ جنت و دوزخ کے حالات دریافت کئے۔ غرضیکہ شب معراج کون سی چیز تھی جو اثناء راہ ملی۔ اور حضور نے اس کے متعلق نہ پوچھا ہو اور جبریل نے نہ بتایا ہو۔

جب کسی ملک کا بادشاہ دوسرے ملک میں بطور مہمان سیر کے لئے جائے تو اس ملک کا ایک خاص آدمی اس بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو اپنے ملک کے حالات سے آگاہ کرتا ہے۔ اور مناظر قدرت اور قابلِ دید مقامات کی سیر کراتا ہے۔ مہمان بادشاہ دریافت کرتا رہتا ہے اور میزبان کا نمائندہ اسے آگاہ کرتا جاتا ہے۔

یہی حال شبِ معراج رہا۔ حضور پوچھتے رہے اور جبریل بتاتے رہے۔ اور حضور صرف ذاتی آگاہی کے لئے دریافت فرماتے نہ کوئی غیر ساتھ تھا اور نہ غیر کو وہاں بتانا مقصود تھا۔ لہذا ثابت ہوا کہ ان تمام چیزوں کا علم حضور پاک کو نہ تھا جو شبِ معراج سامنے آئیں۔ اور آپ نے ان کے متعلق جبریل سے دریافت کیا۔

میں کسی ایک کتاب کا حوالہ نہیں دیتا ان تمام کتابوں کا حوالہ دیتا ہوں جن میں واقعہ معراج مذکور ہے۔ اور قدیم مفسرین و مورخین کی کاوش کا ثمرہ ہیں۔

یہاں دو باتوں میں سے ایک بات کا انکار لازماً کرنا پڑے گا۔ یا تو واقعہ معراج سارے کا سارا غلط اور خود ساختہ ہے یا حضور پاک کے علم غیب کلی کی نفی ہے۔

غلط تاویلوں بے معنی توجیہوں اور الفاظ کی فضول خرچی سے مدعا ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے سینکڑوں غلطیوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ پھر بھی غلطی غلطی ہی رہتی ہے۔

عرش کے ساکن تھے زمین پر بھیس بدل کر چلے آئے۔ آسمان و زمین ان کے سامنے بنتے رہے بلکہ بعض اوقات غلو ترقی کر کے یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ خود بناتے رہے۔ لیکن واقعہ معراج نے سیٹیج کی خود ساختہ اور صنعت غلو کی پیداوار کو خلاف حقیقت قرار دیا۔

لیکن یہ بھی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بہ تعلیم خدا آنے والے واقعات کی پیشین گوئیاں کیں جو ان کے غیب جاننے کا واضح ثبوت ہیں۔ مثلاً خروجِ دجال، ظہور حضرت امام مہدی عجل اللہ ظہورہٗ، نزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام، قیامت صغریٰ، قیامت کبریٰ کے حالات جناب امیر المومنین کو آنے والے واقعات سے آگاہ فرما کر دورِ فتن میں صبر کی تلقین فرمانا، جنگ جمل، صفین اور نہروان کی خبر دینا۔ حضرت امام حسین کی شہادت کی پیشین گوئیاں یہ سب اخبار غیب ہیں جو زبان وحی ترجمان سے صادر ہوئیں۔ جنگ موتہ میں ؟ اور حضرت جعفر طیار رضوان اللہ علیہما کی لڑائی اور شہادت کے واقعات سے مسجد نبوی میں اہل مدینہ کو آگاہ کرنا اور اس قسم کے ایسے واقعات جو پیش گوئیوں سے تعلق رکھتے ہیں یا اسی زمانہ میں غائبانہ امور پر اطلاع یابی کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ کتب تاریخ و تفسیر میں مذکور ہیں۔ لہٰذا دونوں قسم کے واقعات کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ذاتی طور پر علم غیب نہیں، خداوند متعال کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔ تمام غیوب پر اطلاع نہیں بعض پر ہے اور بعض پر نہیں۔ لیکن جب وہ چاہیں اطلاع حاصل کر سکتے ہیں۔

جناب امیر المومنین علیؑ علیہ السلام

نبوی علوم کے در مملکت علم و عرفان کے تاجور منبر سلونی کے خطیب اشہر مسائل کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھانے والے پیچیدہ عقدوں کو حل کرنے والے علم لدنی کے خزینہ دار اسرار قرآن اور رموز کتاب کے عارف علم ظاہر اور علم باطن کے بحر ذخار بعد از خاتم الانبیاء علمی دنیا میں بے مثال ہیں۔ لیکن ان کو بھی تمام علوم بیک وقت عطا نہیں ہوئے۔ من جانب خدائے قدوس ان کو القاء بھی ہوتا رہا اور جناب اشرف الانبیاء بھی ان کو تعلیم دیتے رہے۔ لیکن ایک ہی وقت میں سب کچھ عطا نہیں ہوا۔ مختلف اوقات میں درجہ بدرجہ وقتاً فوقتاً

بتدریج رفتہ رفتہ تدریجاً ان کے علوم میں اضافہ ہوتا رہا۔ جیسا کہ خود جناب امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: زَقَّنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ زَقًّا زَقًّا۔ مجھے جناب رسول اللہؐ نے یوں علم عطا فرمایا ہے۔ جس طرح پرندہ اپنے بچے کو دانہ بھراتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اَلْفَ بَابٍ فَانْفَتَحَ لِیْ مِنْ کُلِّ بَابٍ اَلْفَ بَابٍ۔ رسول اللہ صلعم نے مجھے ہزار باب علم کے تعلیم کئے پھر میرے ہر ایک باب سے ہزار باب خود بخود کھل گئے۔

یہ ہزار باب کی تعلیم جناب امیر علیہ السلام کو سرکار رسالت نے زندگی کے آخری لمحوں میں کی تھی۔ جب کہ وقت وفات اور وصیتیں بھی فرمائی تھیں۔

جناب امیر علیہ السلام کے ان دو فرمانوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جناب امیر شاگرد ہیں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لہٰذا ان کا علم علم حضوری نہیں بلکہ مستفاد ہے اور حضور پاک سے حاصل کردہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ براہ راست من جانب خدا بھی ان کو علم عطا ہوا ہو لیکن وقتاً فوقتاً علم حاصل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جب پیدا ہوئے تو علم کلی ساتھ لے کر نہیں آئے۔ مثلاً جناب امیر علیہ السلام کو ایک علم عطا ہوتا ہے۔ سن بعثت کے تیسرے سال تو ماننا پڑے گا کہ بعثت کے دوسرے سال حضرت اس علم سے محروم تھے، یا مثلاً دوسری ہجری میں آپ کو علوم عطا ہوتے ہیں تو جو علوم آپ کو دوسری ہجری میں حاصل ہوئے وہ علوم آپ کے پاس دوسری ہجری سے پہلے نہ تھے اسی طرح ائمہ علیہم السلام کے متعلق ہر امام علیہ السلام کے بارے میں احادیث مروی ہیں کہ ان کا علم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں اصول کافی و دیگر کتب احادیث جب ہر امام کا علم وقتاً فوقتاً اور رفتار زمانہ کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے تو ثابت ہوا کہ بڑھنے سے پہلے کم تھا اور جو علم کسی وقت عطا ہوا اس وقت سے پہلے وہ علم ان کے پاس نہ تھا۔ ورنہ عطا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور تحصیل حاصل کا کیا مطلب۔

چونکہ شیعہ حضرات نے عموماً سٹیج سے معلومات مذہبی حاصل کی ہیں۔ جو غیر ذمہ دارانہ بیانات کی بڑی نشرگاہ ہے اور کتب سیر و تواریخ سے کنارہ کیا جو مذہبی معلومات کا واحد اور صحیح و معتبر ذریعہ ہے۔ اس واسطے ان کی معلومات عام طور پر حقیقت سے دور ہیں۔ کتب تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے کہ ائمہ علیہم السلام کو تمام علوم غیب بیک اور پیدائشی طور پر حاصل نہیں ہوتے کبھی حاصل ہوتے ہیں اور کبھی نہیں۔

بے شک جناب امیرالمومنین علیہ السلام علم لدنی رکھتے ہیں اور علوم قرآن کے حامل بھی ہیں مگر علم انساب کے لئے اپنے بھائی جناب عقیل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ انہی کو فرماتے ہیں کہ کسی ایسے شجاع اور دلیر خاندان کی عورت کو تلاش کرو جس سے میں شادی کروں تاکہ اس سے ایسا بہادر لڑکا پیدا ہو جو پدری اور مادری خاندانوں کی شجاعت کا وارث ہو اور مثالی شجاع ہو۔

یہاں ظاہری دستور پر عمل کیا۔ روحانی طاقت کو صرف نہیں کیا اور نہ جناب فاطمہ بنت حزام کلابیہ کا آپ کو علم تھا ورنہ خود نامزد فرما کر خواستگاری کر دیتے۔ جناب عقیل کو کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ تلاش کرو۔ جناب عقیل چونکہ قبائل قریش کے حالات انساب واقف تھے انہوں نے جستجو کے بعد جناب فاطمہ بنت حزام کلابیہ المعروف ام البنین کو منتخب فرمایا۔ یاد رہے کہ نام جناب کا فاطمہ ہے اور کنیت ام البنین ہے جو کربلا میں یوم عاشورہ وہ کنیت ختم ہو گئی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام

جناب سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام مامور من اللہ حجت خدا امام معصوم ہیں۔ ان کے دو واقعے عرض کرتا ہوں۔ ایک واقعہ سے ان کا علم غیب ثابت ہوتا ہے اور دوسرا واقعہ ان کے علم غیب کی نفی کرتا ہے۔

ان کے حالات کتب تاریخ ہی سے ملتے ہیں۔ نہ یہاں صدری معلومات کام دے سکتی ہیں اور نہ الہام اور وحی کی آمد ہے۔ مستند کتب تاریخ کی معتبر روایات و معتبر حالات کی طرف رجوع کئے بغیر چارہ نہیں۔ مدینہ سے اس سفر کی تیاری کے وقت کہ جس سفر سے عزیب کربلا کی جسمانی واپسی نہیں ہوئی ام المومنین ام سلمہ رضوان اللہ علیہا تشریف لائیں اور اپنے تربیت یافتہ فرزند رسول کو اس سفر کے ان خطرات سے آگاہ کیا جو مختلف وقتوں میں آپ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بطور پیش گوئیوں کے سنتی رہتی رہی تھیں۔ اور انہی خدشات کا اظہار فرمایا جو سفر عراق سے متعلق تھے جناب سید الشہداء غریب کربلا قتیل نینوا بھی روئے اور جناب ام المومنین بھی رو دیں۔ اس کے بعد جو واقعا سرکار رسالت نے بطور پیش گوئی فرمائے تھے اور انہوں نے زبانی فرمائے تھے۔ امام مظلوم مسافر مغموم نے جناب ام سلمہ کو آنکھوں سے دکھائے۔ میدان کربلا کا وہ حصہ جو مقتل حسین مقدر ہو چکا تھا بلند ہو گیا۔ فوجوں کے گھمسان میں مظلوم کربلا کی تنہائی اور تنہائی میں سر کی بدن سے جدائی کا منظر جناب ام سلمہ سلام اللہ علیہا کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور زوجہ رسول نے اپنی آنکھوں سے مقتل حسین مشاہدہ کیا۔

یہ ایک غائبانہ امر تھا جو صرف خود امام مظلوم نے نہیں دیکھا بلکہ اپنی نانی ام المومنین کو بھی دکھایا یہاں روحانی تصرف تھا اور عام دستور پر اکتفا نہیں کی۔

لیکن جب جناب مسلم بن عقیل سلام اللہ علیہما کو اپنا وکیل بنا کر کوفہ بھیجا تو جو کچھ کوفہ میں رونما ہوا آپ اس سے قطعاً بے خبر تھے۔ ظاہری حالات کی بناء پر کوئی علم نہ تھا اور روحانی تصرف کیا نہیں حتیٰ کہ جب جناب مسلم کا خط آیا کہ میرا استقبال اچھا ہوا ہے۔ کوفیوں کے محبت بھرے جذبات آپ کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ اٹھارہ ہزار کی تعداد نے بیعت کر لی ہے۔

یہ لوگ اہل بیت رسول کے شیدائی ہیں۔ آپ نے اپنے قافلہ کا رُخ کوفہ کی جانب موڑ دیا۔ اور انہی حالات کے پیش نظر موڑا کہ اہل کوفہ نصرت و محبت جذبات سے سرشار ہیں۔

تاہم اثنار سفر میں بے قرار رہے اس خط کے بعد مزید خط کے منتظر رہے۔ اور جناب مسلم کے بعد والے حالات کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ دوران سفر نگاہیں کوفہ کی طرف رہتیں۔ چنانچہ جناب مسلم کے اس خط کے بعد جس قدر حالات نے پلٹا کھایا اور کوفہ میں جو انقلاب رونما ہوا۔ محبوں کے جذبات ماند پڑ گئے، وفاداریاں بدل گئیں، دوست دشمن بن گئے اور جناب مسلم پر زمین تنگ ہو گئی، گھروں کے دروازے بند ہو گئے بنو ہاشم کا چراغ جفا کی آندھیوں کی نذر ہو گیا اور ہاشمی شبیر مکرو فریب کے جال میں جکڑا گیا اور نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کیا گیا۔ جتنے حالات پر درد اور مصائب گذرے حتیٰ کہ جناب مسلم کی شہادت تک کا جناب امام حسین علیہ السلام کو علم نہ ہوا۔

حضرت مسلم علیہ السلام کی شہادت کا علم

جناب مسلم کی شہادت کا علم امام پاک کو کس وقت اور کس طرح ہوا کتب تاریخ متفقہ طور پر جو کچھ بیان کرتی ہیں وہ حسب ذیل ہے :-

عبداللہ بن سلیمان اور منذر بن مشمعل قبیلہ بنی اسد کے یہ دو شخص بیان کرتے ہیں کہ ہم نے حج بیت اللہ ادا کرنے کے بعد یہ انتہائی کوشش کی کہ جلد از جلد جناب امام حسین علیہ السلام کے قافلہ کو پالیں اور معلوم کریں کہ کن حالات سے دوچار ہیں اس تیز روی کے ساتھ ہم منزل " زرود " میں ان سے جا ملے جب ہم ان کے قریب پہنچ گئے اس اثنار میں ہمیں کوفہ کی جانب سے ایک شخص آتا دکھائی دیا اس نے راستہ چھوڑ دیا جب امام حسین علیہ السلام کو دیکھا

رُک گیا گویا کہ ملنا چاہتا ہے پھر آگے چلا گیا ہمیں خیال آیا کہ یہ شخص کوفہ کی جانب سے آرہا ہے ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس کوفہ کی کوئی خبر ہو۔

چنانچہ ہم اس کے پاس گئے۔ سلام دیا اس نے جواب دیا ہم نے پوچھا آپ کس قبیلہ سے ہیں۔ اس نے کہا اسدی ہوں ہم نے کہا کہ ہم اسدی ہیں آپ کا نام کیا ہے۔ اس نے جواب دیا میں "اکبر بن شعبہ" اسدی ہوں۔ پھر ہم نے کوفہ کے حالات دریافت کئے۔ اس نے کہا کہ جناب مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ شہید ہو گئے۔ اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں کہ ان دونوں کی لاشیں کوفہ کے بازار میں پھرائی جا رہی ہیں۔ ان دونوں کا بیان ہے کہ پھر ہم قافلہ امام کے ساتھ مل گئے۔ جب منزل زبالہ میں نزول فرمایا تو ہم نے عرض کی کہ حضور ہم نے ایک خبر سنی آپ چاہیں تو تنہائی میں بتائیں اور اگر چاہیں تو ان لوگوں کے سامنے عرض کر دیں۔ اس وقت امام پاک نے اپنے اصحاب اور اقرباء پر نظر ڈالی اور فرمایا کہ یہ میرے خواص ہیں ان سے کوئی رازداری نہیں۔ پھر ان لوگوں نے وہ خبر سنائی کہ وہ سوار جو کل شام کو کوفہ سے آرہا تھا۔ آپ نے دیکھا تھا فرمایا ہاں اور میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا ان کا بیان ہے کہ پھر ہم نے کہا ہم اسے ملے اور کوفہ کے حالات دریافت کئے اس نے بتایا کہ جناب مسلم اور ہانی مارے گئے ہیں اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی بازار کوفہ میں آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔

اس وقت آپ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کئی بار پڑھا۔ پھر ہم نے عرض کی مولا! کوفہ کے حالات بدل چکے ہیں۔ اب کوفہ میں آپ کا کوئی ناصر نہ ہو گا۔ بہتر ہو گا کہ آپ یہیں سے مڑ جائیں۔ مگر خود امام اور اولادِ عقیل کی یہی رائے ہوئی کہ سفر جاری رکھا جائے۔ (بحار الانوار وغیرہ)

اسی طرح نفس المہموم اور لہوف میں مذکور ہے کہ منزل زبالہ پر امام پاک کو مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کی شہادت کی خبر پہنچی۔ آپ نے چند

بار اِنَّا لِلّٰہِ آہ پڑھا۔ پھر قافلہ والے لوگوں کو اس سے آگاہ کیا۔ اس مقام پر جناب مسلم کی شہادت پر شدید ماتم ہوا گریہ و بکا کی بلند آوازوں سے صحرا گونج گیا۔ اور اہلِ حرم نے اندرونِ خیام دل کھول کر گریہ و ماتم کیا۔

اور بعض کتبِ مقاتل میں یہ بھی درج ہے کہ امام پاک نے اداس چہرہ بہتے ہوئے آنسوؤں غمگین حالت کے ساتھ اہلِ حرم کو قافلہ کربلا اور بنی ہاشم کے پہلے شہید کی خبر سنائی، خیام میں کہرام ماتم بپا ہوا اور امام پاک نے اس انداز سے یتیمۂ مسلم کو گود میں لیکر شفقت فرمائی کہ یتیمہ پہچان گئی میرا بابا مارا گیا ہے۔

پھر امام پاک نے اہلِ قافلہ کو جمع کر کے خطبہ پڑھا اور حقیقتِ حال اور مقصدِ سفر سے آگاہ کیا جس کے بعد بہت سے لوگ جو دنیوی اغراض کے تحت اور مالِ غنیمت کی لالچ میں ساتھ چل رہے تھے چھوڑ کر چلے گئے اور مخلص و باوفا لوگ ساتھ رہ گئے۔

مذکورہ روایت تاریخ کی متفقہ روایت ہے۔ اس سے درج ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

- جناب مسلم کی موت کا علم امام پاک اور اہلِ قافلہ کو اس وقت منزلِ زبالہ پر ہوا۔
- اسی منزل پر گریہ و بکا ہوا اور اسی منزل پر مستورات نے ماتم کیا۔
- اسی منزل پر آپ نے یتیمۂ مسلم پر خصوصی شفقت فرمائی۔
- اس خبر کے بعد آپ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔ اور اہلِ قافلہ کو جمع کر کے تقریر کی اور اصحاب و اقربا سے سفر جاری رکھنے کی رائے طلب کی۔
- اس سے قبل جناب مسلم کے درد بھرے حالات اور ان کی شہادت کا علم نہ تھا۔ اور نہ قوتِ امامت اور طاقتِ روحانی سے انکشافِ حالاتِ کوفہ کی خواہش کی۔

جناب مسلم ۹ ذی الحجہ کو شہید ہوئے ہیں اور یہ خبر کافی دنوں کے بعد پہنچی جب کہ آپ ۸ ذی الحجہ کو مکہ سے چل پڑے تھے۔

اگر عید الاضحیٰ کی شب کو یا دن کو آپ کو شہادت مسلم کا علم ہو جاتا، اور انگلیوں کے درمیان یہ منظر دکھاتے تو اسی روز یہ تقریب ماتم منعقد کی جاتی اور یہ تمام کاروائی اسی وقت ہونا چاہیئے تھی۔ یہ کون سی عقل کی بات ہے کہ خبر معلوم ہو ۱۰ ذوالحجہ کو اور تقریب غم دو تین ہفتہ بعد منعقد ہو اور اس سے پیدا ہونے والی صورتِ حال پر دو تین ہفتہ بعد غور و خوض ہو۔

صحیح تاریخی واقعہ تو وہ ہے جو تحریر کر دیا باقی ذاکروں اور کم علم واعظوں کے خود ساختہ ڈھکوسلے ہیں۔

آخر میں میں اپنے اس موضوع کو حضرت امام زمانہ حجت خدا سرکار قائم آل محمد عجل اللہ ظہورہٗ کی اس توقیع مبارک پر ختم کرتا ہوں جو سرکار علیہ السلام نے اپنے ایک نائب خاص محمد بن علی سمری کو تحریر فرمائی ہے :-

یاد رہے کہ حضرت حجت علیہ السلام کے زمانۂ غیبت صغریٰ میں آپ کے نائب خاص مقرر رہے جو عوام شیعوں اور امام علیہ السلام کے درمیان استفسار مسائل کا وسیلہ رہے۔ شیعوں کو جب اہم مسائل دریافت کرنا ہوتے تو وہ حضور پاک کے نائب خاص کے ذریعہ سرکار حجت تک پہنچاتے اور حضور حجت علیہ السلام ان مسائل کا جواب تحریر فرماتے یا خود خاص تحریری ہدایات جاری فرماتے اس کو توقیع کہا گیا ہے۔ ان توقیعات میں سے ایک توقیع ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اور شیعوں کو دعوت دیتے ہیں کہ جس امام زمانہ کا آپ بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں اور ان کے ظہور کی گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ جن کی رویت کے لئے آنکھیں ترس رہی ہیں ؎

ترس رہی ہیں تیری دید کو جو مدت سے
وہ بے قرار نگاہیں سلام کہتی ہیں

آپ ان کی ہدایات بھی پڑھ لیں تاکہ وقت ظہور اُن کے غضب و قہر سے بچ سکیں۔

یا محمد بن علی تعالی اللہ عز وجل عما یصفون سبحانہ وبحمدہٖ لسنا نحن شرکائہ فی علمہٖ ولا فی قدرتہٖ بل لا یعلم الغیب غیرہٗ کما قال فی محکم کتابہٖ تبارکت اسمائہٗ قل لا یعلم من فی السمٰوٰت والارض الغیب الا اللہ وانا وجمیع آبائی من الاولین آدم ونوح وابراھیم وموسیٰ وغیرھم من النبیین ومن الآخرین محمد رسول اللہ وعلی بن ابی طالب وغیرہ ممن مضیٰ من الائمۃ صلوٰت اللہ علیھم اجمعین الیٰ مبلغ ایامی ومنتہیٰ عصری عبید اللہ عزّوجل یقول اللہ عز وجل من اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکاً الخ یا محمد بن علی قد آذانا جُہلاءِ الشیعۃ وحُمقائہم ومن دینہٗ جناح البعوضۃِ ارجح منہ فاشھد اللہ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَ کفیٰ بہٖ شھیدا ورسولہ محمداً صلی اللہ علیہ وآلہٖ وملائکتہٗ واولیائہٗ علیھم السلام وَاُشہِدکَ وَاشہد کل مَن سَمع کتابی ھٰذا انی بری الی اللہ والیٰ رسولہٖ ممن یقول انا نعلم الغیب او نُشارکہٗ فی مُلکہٖ او یحلنا محلاً سوی المحل الذی رضیہ اللہ لنا وخلقنا لہ او یتعدیٰ بنا عما فسرتہٗ لک فی صدر کتابی واشھدکم ان کل من نتبراٗہ منہ فان اللہ یَبْرَأُ منہ وملائکتہٗ ورسلہٖ واولیاءہٗ وجعلت ھٰذا التَّوقیع الذی فی ھٰذا الکتاب امانۃ فی عنقک وعنق من سمعہ اَن لَا یکتمہٗ من احدٍ من موالی وشیعتی حتّٰی یُظھرہٗ علیٰ ھٰذا التوقیع الکلّ من موالی لعل اللہ عز وجل یتلا فاھم فیرجعون الیٰ دین اللہ الحق وینتھون عما لا یعلمون منتھیٰ امرہٖ ولا یبلغ منتھاہ فکل من فھم کتابی ولا یرجع الی

ما قد امرته و نهيته فقد حلّت عليه اللعنة من الله ومن ذكرت من عبادة الصالحين ۔ (احتجاج طبرسی مطبوعہ نجف اشرف ص ۲۶۵)

ترجمہ: اے محمد بن علی دسمری) اللہ عز وجل ان باتوں سے بلند اور پاک ہے جو یہ (غالی) لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ہم نہ تو اس کے علم میں شریک ہیں اور نہ ہی اس کی قدرت میں بلکہ اس کے سوا کوئی بھی غیب کا علم نہیں رکھتا جیسا کہ اس نے خود اپنی محکم کتاب میں ارشاد فرمایا ہے:۔ اے رسول کہدو کہ زمین اور آسمانوں میں جو مخلوق ہے اس کے غیب کا علم سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ میں اور میرے بزرگ آبار و اجداد اولین میں سے حضرت آدم نوح، ابراہیم، موسیٰ اور باقی انبیار اور آخرین میں سے محمد رسول اللہ، علی بن ابی طالب اور باقی ائمہ طاہرین جو گذر چکے ہیں " صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین" میرے زمانہ تک وہ سب کے سب اللہ سبحانہٗ کے بندے ہیں" خدا کا ارشاد ہے جو شخص میرے ذکر سے منہ پھیرے اس کے لئے تنگ زندگی ہے۔

اے محمد بن علی۔ ہمیں جاہل احمق اور ان نام نہاد شیعوں نے جن کے دین و اعتقاد کا وزن مچھر کے بھی برابر نہیں سخت اذیت پہنچائی ہے۔ میں اس خدا کو گواہ بنا کے کہتا ہوں کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے فرشتوں اور اس کے تمام انبیار و اولیار علیہم السلام کو اور تجھے اور ہر اس شخص کو جس تک میرا یہ تحریری پیغام پہنچے، گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اللہ اور رسول کی بارگاہ میں ایسے لوگوں سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں جو ہمیں عالم الغیب یا خدا کی ملکیت میں اس کا شریک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح میں اس سے بھی بیزار ہوں جو ہمیں اس مرتبہ و مقام جو خدا نے ہمارے لئے پسند فرمایا ہے اور اس کے لئے ہمیں پیدا کیا ہے کے علاوہ کوئی اور مقام و مرتبہ دیتا ہے یا جو کچھ میں نے تیرے سامنے بیان کر دیا ہے اس سے بڑھاتا ہے۔

میں تمہیں گواہ کر کے کہتا ہوں کہ جس سے ہم بیزار ہو جائیں اس سے خدا کے فرشتے اس کے رسول اس کے اولیاء بھی بیزار ہو جاتے ہیں۔

میں اس توقیع (خط) کو تمہاری گردن اور ہر اس آدمی کی گردن میں امانت قرار دیتا ہوں کہ وہ اسے ہمارے کسی شیعہ سے نہ چھپائیں تاکہ ہمارے محب اور شیعہ اس پر مطلع ہو سکیں۔ اور شرک و غلو سے بچ سکیں۔ شاید خدائے تعالیٰ ان کی تلافی (غلطی کی اصلاح) کرے اور وہ لوگ دین حق کی طرف پلٹ آئیں اور اس بات سے باز آجائیں جس کے انجام سے بے خبر ہیں۔

(اس کے بعد حضور فرماتے ہیں) جو شخص میری اس توقیع کو سن سمجھ کر بھی اس کی طرف رجوع نہ کرے۔ جس کا میں نے حکم دیا ہے اور اس عقیدۂ باطل سے باز نہ آئے جس سے میں نے روکا ہے تو اس پر خدا اور اس کے ان صالحین بندوں کی جن کا ذکر اس توقیع میں ہوا ہے لعنت اترے گی۔

سرکار قائم آلِ محمد بارھویں امام اور خداوند عالم کی آخری حجت اور آخری خلیفہ عجل اللہ ظہورہٗ کا تحریری فرمان آپ پڑھ چکے ہیں جس میں انہوں نے علم غیب اور خدا کی ملکیت میں شریک ہونے کی شدت کے ساتھ نفی کی ہے۔ اس کے بعد مزید کسی دلیل اور ثبوت کی ضرورت نہیں، کسی غلط فہمی میں مبتلا شیعہ کی غلط تشریحات کا شکار ناواقفیت اور جہالت کا بیمار صاف دل اور طبع سلیم رکھنے والا شیعہ جب اس موضوع علم غیب کو ہمارے دلائل اور براہین کے ساتھ بغیر کسی تعصب اور طرفداری کے پڑھے گا تو یقیناً اپنے سابقہ غلط خیالات اور باطل عقائد کو خیرباد کہے گا اور صحیح اور حق عقائد و نظریات کو خلوص دل سے قبول کرے گا۔

لیکن جن دماغوں میں پرانے خیالات اور باطل عقائد جمے ہوئے ہیں۔ اور وہ ایک عرصہ سے غلط عقیدوں کو سنتے اور مانتے آئے ہیں انہوں نے حق و باطل میں امتیاز کرنے اور نئے و پرانے خیالات پر غور و فکر کرنے کی زحمت

گوارا نہیں کی۔ جہل مرکب میں اور ہٹ دھرمی کا شکار ہیں وہ ان حقائق کی شدت کے ساتھ تردید کریں گے۔ اور جاہلیت اولیٰ پر کاربند رہنے اور آباؤ اجداد کی غلط اور ناجائز روایات کو برقرار رکھنے کی ہٹ پر قائم رہیں گے۔

• بعض لوگ ان روایات و واقعات کو ضعیف و غلط کہیں گے۔ حالانکہ یہ صحت کے معیار بروایت و درایت پر پوری اترتی ہیں ان کو ضعیف اور غلط قرار دینے کا کوئی ثبوت اور کوئی وجہ ان کے پاس نہ ہوگی۔ محض بحث سے گلوخلاصی کرانے کے لئے اور جواب کی جرأت نہ رکھنے کی وجہ سے ان کو غلط کہہ کے جان چھڑائیں گے۔

• بعض لوگ ان کی تاویل اور معانی و مطالب، آیات و احادیث میں اپنی مرضی کے مطابق رد و بدل کرنے کی ناجائز کوشش کریں گے۔ کیونکہ نفسیاتی طور پر سابقہ راسخ اور جمے ہوئے باطل کو عقائد کو دماغ سے نکالنا بہت دشوار ہے ان کی یہی کوشش ہوگی کہ سابقہ و قدیم خیالات محفوظ رہ جائیں اور عوام میں بھرم برقرار رہے۔

• بعض لوگ جو علمی سرمایہ سے عاری جرأتِ جواب سے محروم بحث کی سکت سے عاجز پرانے خیالات کے حامی نہایت ڈھٹائی سے کہیں گے۔ ہم یہ باتیں نہیں مانتے یہ سب غلط ہیں۔ ہمارا دل نہیں مانتا ہمارے پاس خاندانی علم ہے۔ ہم صدری راز رکھتے ہیں۔ ہم بزرگوں کو سچا سمجھتے ہیں گویا ان پر اور ان کے بزرگوں پر وحی نازل ہوتی رہی۔

ہم اس بحث کے آغاز میں بھی درمیان میں بھی لکھ آئے ہیں اور آخر میں بھی لکھتے ہیں کہ علم غیب کے بارے میں آیات قرآنی احادیث صحیح رحمانی اور ارشادات علماء ربانی سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہ درج ذیل ہے:۔

• انبیاء و ائمہ علیہم السلام کا علم غیب ذاتی نہیں ہے۔ یعنی ذاتی طور پر بغیر تعلیم خدا وہ غیب نہیں جانتے ان کا علم وہبی ہے مستفاد ہے۔ ائمہ علیہم

السلام کا علم بطور وراثت رسول پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے یا بطور القاء علیم و حکیم ہے۔

- انہیں کل علم غیب حاصل نہیں۔ گو گذشتہ اور آئندہ واقعات کا علم ان کو من جانب خدا عطا کیا گیا۔ مگر کل کا کل اور سارے کا سارا نہیں بہت سے علوم پنہاں رکھے گئے ہیں۔
- یہ کہنا غلط ہے کہ ان کا علم حضوری تھا۔ یعنی تمام کائنات ان کے سامنے ہے۔ سارا جہان اُن کے سامنے بنا۔ اور تمام دنیا ان کے سامنے ہاتھ کی ہتھیلی کی مانند ہے۔ پانچ انگلیوں کی مثال علوم شرعیہ اور فقہی و شرعی مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے ہے۔ علوم غیب کے لئے نہیں۔
- ان کا علم علم حصولی اور مستفاد ہے۔ کئی واقعات ان سے اوجھل رہے اور کئی علوم ان سے پوشیدہ رہے۔
- جو کچھ جاننا چاہیں حسب مصلحت اور مشیت ایزدی کے تحت جان سکتے ہیں اور جہاں جاننا چاہیں باذن خدا تحت مشیت ایزدی حسب مصلحت جا سکتے ہیں۔

ہمیں رب نہ کہو

ہمیں رب کا مقام نہ دو

اہل غلو کی طرف سے اپنے مسلک کی تائید میں ایک حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔ ہم اس حدیث کے سلسلہ اسناد اور اس کی صحت و وضعی ہونے سے قطع نظر کرتے ہوئے اس کے اصل مضمون پر بحث کرتے ہیں کہ اس کا مفہوم غالیوں کے مسلک کی تردید کرتا ہے یا تائید متن حدیث یہ ہے: نَزِّلُوْنَا عَنِ الرَّبُوْبِيَّةِ وَ قُوْلُوْا فِيْنَا شِئْتُمْ وَلَنْ تَبْلُغُوْا: ترجمہ ہمیں ربوبیت کے مقام سے نیچے رکھو اور اس کے سوا ہمارے بارے میں جو چاہو کہو اور ہرگز حد تک نہ پہنچ سکو گے۔

اس حدیث میں جسے بڑے طمطراق سے اپنے مقصد کی حمایت میں پیش کرتے ہیں۔ یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہمیں مطلقاً رب نہ کہو اور نہ رب کا مقام دو۔ رب مطلق کے مقام و مرتبہ سے نیچے رکھو۔ دوسرا جملہ یہ ہے کہ ہمارے بارے میں جو چاہو کہو اس جملہ میں عموم ہے۔ ہم ان دو جملوں پر بحث کرتے ہیں۔ قارئین کرام خود اس کا نتیجہ معلوم کرلیں گے۔ ربوبیت کے مقام سے نیچے رکھنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ رب کہنے اور ان امور کی نسبت ہماری طرف دینے سے باز رہو، جن امور کا تعلق صرف ذات رب العالمین سے ہے اور وہ صرف شان رب العالمین سے مخصوص ہیں۔

ہر عہدہ دار اور ہر مرتبہ کے مالک کے خصوصی اختیارات ہوتے ہیں جو اس سے کم عہدہ والے کو حاصل نہیں ہوتے۔

ایک ملک کے حاکم اعلیٰ کا ایک منصب اور عہدہ ہوتا ہے اور اس عہدہ و منصب کے ساتھ کچھ خصوصی اختیارات و امور وابستہ ہوتے ہیں جو اس سے

کم عہدہ والے کو نہیں دیئے جاتے۔

ظاہر ہے کہ ایک ملک کے صدر حاکم اعلیٰ کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ صوبے کے گورنر کو حاصل نہیں اور جو اختیارات ایک صوبے کے گورنر کے لئے مخصوص ہیں وہ ایک ضلع کے افسرِ اعلیٰ کو حاصل نہیں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا مرتبہ اور مقام ہے۔ اور اختیارات کی تقسیم مناصب کے لحاظ سے ہے۔ ہم صوبہ کے حاکم کو گورنر کہہ سکتے ہیں ملک کا صدر نہیں کہہ سکتے مگر صدر نہ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ صرف صدر کا لفظ نہ استعمال کیا جائے بلکہ وہ اختیارات و امور بھی گورنر کی طرف منسوب نہ کئے جائیں۔ جن کا تعلق صرف ملک کے صدر کے ساتھ مخصوص ہے۔

کسی کی صدارتِ ملک کی نفی کر دینے سے اور اس کی صدارت سے انکار کر دینے سے ان تمام اختیارات اور امور کی بھی نفی ساتھ ہی ہو جائے گی جو صدر کی ذات اور اس کے عہدہ سے مخصوص تھے۔ اسی طرح ائمہ علیہم السلام کی ذات سے ربوبیت کی نفی کرنے سے صرف لفظ رب کی نفی نہیں ہو گی بلکہ ان تمام امور و لوازم اور ان تمام اختیارات کی نفی ہو گی جو مقام و منصب ربوبیت اور شان رب العالمین کے ساتھ مخصوص ہیں۔

اس واسطے ہم قارئین حضرات کی بصیرت کے لئے شان رب مقام و منصب رب اور اس کے ساتھ لوازم ربوبیت بیان کرتے ہیں۔

رَبّ: پروردگار۔ پرورش کرنے والا۔ مجازی طور پر ہم اللہ کے سوا اور لوگوں پر بھی جزوی لحاظ سے اضافت کے ساتھ رب کا اطلاق کر سکتے ہیں۔ جیسا رَبُّ البَیْتِ گھر کا مالک۔ رَبُّ الْاِبِل اونٹوں کا مالک۔ لیکن حقیقی طور پر اور بغیر اضافت کے علیٰ الاطلاق لفظ رب کا اطلاق اللہ کے سوا کسی پر نہیں ہو سکتا یہاں جس ربوبیت کی ائمہ علیہم السلام سے نفی کی گئی ہے وہ ربوبیت حقیقہ اور مطلقہ کی نفی کی گئی ہے۔ کیونکہ جزوی اور مجازی حیثیت سے جب عام افراد پر اس کا استعمال صحیح اور جائز ہے تو ائمہ علیہم السلام کے لئے کس طرح ناجائز و ممنوع

ہوگا۔ لیکن اس طرح مجازی و جزوی طور پر رب کہنے سے ان کو کوئی خاص فضیلت حاصل نہیں کیونکہ اس میں تو اور عام افراد بھی شامل ہو سکتے ہیں۔

رب مطلق و حقیقی:۔ تمام مخلوقات و کائنات کی پرورش کرنے والا۔ ربوبیت کی اصطلاحی تعریف یہ ہے۔ کسی چیز کو رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ اس درجۂ کمال تک پہنچانا جو اس کے لئے مناسب و موزوں ہے۔ کسی نوع کے فرد کی اس طرح پرورش کرنا کہ وہ اپنے مقام کمال تک پہنچ جائے جو اس نوع کے لئے انتہائی مقام کمال ہے۔ تربیت کے دو ذریعہ ہیں: اور انحصار دو باتوں پر ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو پرورش نہیں ہو سکتی۔

۱۔ جسمانی بڑھوتری اور اس کے درجۂ کمال تک پہنچانے والے اسباب مہیا کرنا۔

۲۔ تربیت اور تدریجی کمال میں رکاوٹیں پیدا کرنے والی اشیاء کا دور کرنا اور ان سے مربوب کو محفوظ رکھنا۔

ماں بچے کی اور مالی باغ کا مجازی پروردگار ہے۔ ماں بچے کو وہ تمام اسباب مہیا کرتی ہے جو اس کی جسمانی تربیت کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً بچے کو رحمت اور شفقت کے ساتھ غذا دیتی ہے۔ خوراک اور پانی مہیا کرتی ہے۔ جس سے بچہ پرورش پاتا ہے۔ گرمی اور سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے اسے لباس پہناتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ بیماری جو اس کی تربیت اور بدنی نمو کے لئے رکاوٹ پیدا کرتی ہے اسے دور کرتی ہے۔ دوا پلاتی ہے۔ اس کے سکون و آرام کا خیال کرتی ہے۔ گرم و سرد ہوا سے اس کی حفاظت کرتی ہے۔ یہ امور بچوں کی پرورش کے لئے نہایت ضروری ہیں اس طرح باغ کا مالی پودوں کو خوراک بہم پہنچاتا ہے۔ از قسم کھاد و پانی وغیرہ۔ اور ایسی بوٹیوں کو تلف کرتا ہے جو پودے کے آس پاس اس کی نمو و ترقی میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں۔ اسی طرح ضرر پہنچانے والی گرمی و سردی اور پرندوں چرندوں اور نقصان رساں کیڑوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ تب بچہ صحیح پرورش پا کر جوان ہوتا اور پودا درخت کی شکل اختیار کرتا ہے۔

غرضیکہ پرورش کرنے والے کے لئے ان دو چیزوں اسباب نمو کا پیدا کرنا۔ اور

موانع کا دور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور پرورش کرنے والے کے لئے ان دونوں پر اختیار و قدرت لازمی ہے۔

اسی طرح رب العالمین جو تمام جہانوں کا حقیقی اور مطلق پروردگار ہے۔ عالمین کی پرورش کے لئے یہ دونوں باتیں اس کے لئے لازم ہیں۔ اسباب تربیت اور موانع درکاوٹ پیدا کرنے والی اشیاء کا ہٹانا۔ ان کا تعلق رب سے ہے۔ اگر رب ہے تو یہ دونوں اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اور جس کے اختیار اور قبضہ میں یہ دونوں چیزیں ہیں وہی رب ہے۔ اگر کسی کو رب مان لیں تو یہ دو چیزیں اس کے لئے لازماً ماننا پڑیں گی اور اگر اسے رب تسلیم نہ کریں تو ان دونوں چیزوں کی اس سے نفی کرنا پڑے گی۔ عقل سلیم کبھی یہ تسلیم نہیں کرے گی کہ اسباب تربیت اور دفع موانع پر قادر و مختار ہوتے ہوئے اسے رب نہ کہا جائے اور جسے رب نہ تسلیم کیا جائے یہ دونوں باتیں اس کی طرف منسوب کرنا اور باوجود رب نہ ہونے کے اسے اسباب تربیت و دفع موانع پر قادر و مختار مانا جائے۔ لہٰذا ربوبیت کی نفی کے ساتھ ان دونوں چیزوں کی نفی بھی لازماً ہو جائے گی۔

اسباب تربیت جسمانی :- اس کائنات میں جاندار مخلوق خصوصاً انسان کی نشو ونما اور بقاء و ارتقاء کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے۔ وہ مکتوب ذیل ہیں:-

قرارگاہ : وہ زمین ہے۔ جاندار مخلوق کی رہائش کے لئے زمین کو مسکن بنایا گیا۔ حشرات الارض، چوپائے، رینگنے والے خصوصاً اشرف المخلوقات انسان اسی زمین پر آباد ہے۔

غذا : حیوان کی عموماً غذا نبات ہے وہ زمین سے اُگتی ہے۔ اور انسان کی نبات و حیوان غذا ہے۔

پانی : آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے۔ چشموں، نہروں اور دریاؤں کی صورت میں زمین پر بہتا ہے۔ جس سے انسان، حیوان اور کھیت سیراب ہوتے ہیں۔

ہوا: زندگی برقرار رکھنے کے لئے بری جانوروں کے لئے ہوا نہایت ضروری ہے بغیر ہوا کے کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔

لباس: جب انسان نے عقل ادراک سے کام لیا اور قادر کریم نے اس کی عقل کی رہنمائی کی تو زمین سے خام مال کی پیداوار کو عقل کی رہنمائی میں بطور غذا و لباس استعمال کیا اور ان سے زندگی کی بقا و ارتقار کا کام لیا۔

مکان: خام مال قدرتی زمینی پیداواروں سے حاصل کر کے سردی و گرمی سے محفوظ رہنے کے لئے بذریعہ عقل و شعور اسے مکان بناتے اور اس میں بہنے سہنے کا ڈھنگ سکھایا۔

یہ جملہ اسباب اور اس کے علاوہ جن امور کی تربیت کے لئے ضرورت ہوتی ہے ان کی فراہمی رب کے ذمہ ہوتی ہے۔ لہذا رب کی شان صرف لفظ رب کہلانا نہیں بلکہ امور تربیت کا پیدا کرنا اور تربیت کے عہدہ کے لوازم پورا کرنا یہ رب کی شان اور رب کا کام ہے۔ لہذا جسے حقیقی رب کہا جائے گا۔ مقدمات تربیت کا خالق بھی اُسے تسلیم کرنا پڑے گا اور جس سے ربوبیت کی نفی کرنا پڑے گی۔ اسے مقدمات تربیت اور اسباب ربوبیت کی تخلیق سے بھی بری ماننا پڑے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم آئمہ معصومین علیہم السلام کو رب تو نہ مانیں مگر اسباب ربوبیت کا خالق انہیں تسلیم کریں۔ رب حقیقی کے لئے خلق اشیار اور امانت و احیار لازم ہے۔ امور تکوینیہ کی نسبت رب حقیقی کی ہی طرف دی جا سکتی ہے اور جسے رب حقیقی نہ مانیں تو مذکورہ امور یعنی خلق، مارنا، جلانا اور نفع و ضرر کے اوصاف کی نسبت سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ لہذا اس حدیث سے بنا بر صحت حدیث یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ ہمیں ربوبیت سے نیچے سمجھو یعنی شانِ ربوبیت کام ربوبیت اور مقام ربوبیت سے بھی نیچے سمجھو۔ یہ مطلب نہیں کہ صرف لفظ رب کا اطلاق نہ کرو اور شانِ رب کام رب اور وہ امور جن کا مقام ربوبیت سے تعلق ہے ہماری طرف منسوب کرو۔

مثل دوسرے امور کے نفع پہنچانا اور ضرر روکنا یہ رب ہی کا کام ہے۔ ایصال

منفعت اور دفاعِ ضرر ربوبیت ہی سے متعلق ہے۔

یہ بحث تو عقلی ہے اور اہلِ عقل کی تفہیم کے لئے کافی ہے۔ مگر اس عقلی بحث کی صداقت کے ثبوت میں ہم قرآنی شواہد بھی پیش کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں رب کی شان اور ربوبیت کا مقام مذکور ہے۔ ملاحظہ فرماویں:۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ٥ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ سورہ بقرہ پارہ اول آیت ۲۱، ۲۲۔ اے لوگو! عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ وہ رب جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور اس نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اسی نے تمہارے لئے پھل بطورِ رزق پیدا کئے پس تم اس کے شریک نہ بناؤ، حالانکہ تم خوب جانتے ہو۔

اس آیت مبارکہ میں رب کی شان یہ بیان کی گئی ہے کہ رب وہ ہے جس نے انسان کو پیدا فرمایا وقت خطاب جو لوگ تھے ان کو اور ان سے پہلے لوگوں کو رب ہی نے پیدا کیا۔ زمین کا فرش بنایا آسمان کی سقف بنائی اور من جانب آسمان مینہ برسایا اور اس مینہ کے ساتھ پھل پیدا کئے جو بندوں کی روزی ہے۔ یہ تمام امور رب کی طرف منسوب ہیں اور جو ذات ان امور کی خالق ہے وہی رب ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ تم خدا کے ساتھ شریک اور مقابل نہ بناؤ۔ گویا مذکورہ امور کی کسی اور کی طرف نسبت دینا ان کو اپنے رب کا شریک بنانا ہے۔ کیونکہ ان امور کا تعلق اور اختصاص مقام ربوبیت کے ساتھ ہے۔ یہ امور غیر رب کے اختیار میں نہیں۔

جلانا اور مارنا رب کے ساتھ مخصوص ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے دربار میں شان ربوبیت بیان فرماتے ہیں: رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ۔ میرا رب وہ

ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ حضرت خلیل علیہ السلام جلانے اور مارنے کو رب کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ جلانا اور مارنا رب کا کام ہے اور اسی کے اختیار میں ہے۔ جس کے اختیار میں یہ ہے وہ رب ہے اور جو رب نہیں اس کے دائرہ اختیار سے یہ کام باہر ہے۔ اگرچہ نمرود نے جواب میں کہا کہ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ۔ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ لیکن اس کا یہ دعویٰ سچا نہ تھا۔

گو حضرات آئمہ معصومین علیہم السلام بطور معجزہ مردوں کو زندہ کرتے اور بطور دعا زندوں کو موت کی آغوش میں سلا دیتے تھے۔ لیکن وہ اس کام کے لئے خدا سے دعا مانگتے تھے اور بطورِ معجزہ یہ کام سرانجام دیتے تھے۔ تاہم یہ خدا سے کراتے تھے فاعل حقیقی پھر بھی رب العالمین تھا۔ اس کام کے لئے بارگاہِ رب العالمین میں دعا مانگنا یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ امور ان کے اختیار میں نہ تھے۔ خدا سے کراتے تھے خود نہ کرتے تھے۔ اگر یہ اختیارات مطلقاً ان کو تفویض ہوتے تو خدا سے دعا نہ مانگتے بغیر دعا کے خود ہی کرتے۔

معجزہ اور معمول کی بحث آئے گی۔

ایک مقام پر شان رب العالمین بیان کی گئی ہے: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ سورہ اعراف، آیت تمہارا رب وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن (کی مقدار) میں پیدا کیا۔ وہ رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے اور سورج چاند اور ستارے اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ آگاہ رہو پیدا کرنا اور مخلوق پر امر کرنا یعنی حکومت کرنا اسی کا کام ہے۔ برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

زمین و آسمان کی پیدائش عرش پر غلبہ دن کو رات پر اور رات کو دن پر غالب کرنا رب کا کام ہے۔ اور سورج چاند تارے اسی کے تابع امر ہیں۔ خلق کرنا

اور مخلوق پر حکم چلانا اسی کا کام ہے۔ آیت کے اس جملہ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ میں لَهٗ کی ضمیر رب کی طرف لوٹتی ہے اور وہی اس کا مرجع ہے۔ لَهٗ کا تعلق ایک محذوف لفظ ہے۔ مختصٌ لَهٗ: یا حق لَهٗ یا ثابت لَهٗ جو خبر بنتی ہے اور اَلخلق معطوف علیہ واو حرف عطف اَلْاَمْرُ معطوف: معطوف علیہ معطوف کے ساتھ مل کر مبتدائے موخر اور ثابت یا حق لہٗ خبر مقدم۔ نحوی قاعدہ کے مطابق جس جملہ میں خبر مقدم اور اسم مؤخر ہو اس میں تخصیص اور انحصار کا فائدہ ہوتا ہے۔

یعنی پیدا کرنا اور حکم دینا رب ہی کا کام ہے۔ غیر رب نہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ مخلوق پر حکم جاری کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اگر فرماتا کہ وہ پیدا کرتا اور حکم دیتا ہے تو اس میں غیر کے شریک ہونے کا احتمال تھا لیکن یہ فرمانا کہ وہی پیدا کرتا اور وہی امر جاری کرتا ہے۔ تو ما سوی اللہ غیر کی شرکت کا احتمال ختم ہوتا ہے اور یہ دونوں کام اسی کی ذات میں منحصر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

فرعون نے حضرت موسیٰ سے پوچھا: قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۔ سورہ طٰہٰ آیت ۵۰۔ تمہارا رب کون ہے تو حضرت موسیٰ نے کہا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کے مناسب صورت عطا کی اور اس نے آداب زندگی بتائے۔

لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى۔ طٰہٰ، آیت ۵۔ وہ رب جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا اور تمہارے لئے اس میں راہیں نکالیں اور آسمان سے پانی برسایا اور مختلف قسم کی نبات نکالی۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝ سورہ بنی اسرائیل۔ آیت ۳۰۔ بے شک تیرا رب جسے چاہے کھلا رزق دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں سے باخبر اور ان کی دیکھ بھال رکھنے والا ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ لَہٗ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ

سورہ سبا آیت ۳۶ - اے رسول! تم کہہ دو کہ میرا رب جسے چاہے روزی زیادہ دیتا ہے اور جسے چاہے تنگ کر دیتا ہے لیکن بہتیرے لوگ نہیں جانتے۔

وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ مَا کَانَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ○ سورہ قصص۔ آیت ۶۸۔ تیرا رب جو چاہے پیدا کرتا اور جسے چاہے پسند واختیار کرتا ہے۔ ان لوگوں کو کوئی اختیار نہیں اللہ پاک ہے اور بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔

بَلْ رَّبُّکُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَھُنَّ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکُمْ مِّنَ الشّٰھِدِیْنَ ○ سورہ انبیاء۔ آیت ۵۶۔ بلکہ تمہارا رب تو وہ ہے جو آسمان اور زمین کا رب ہے اور میں خود اس بات کا گواہ ہوں۔

ان آیاتِ مبارکہ میں خلق رزق، زندہ کرنا اور مارنا رب کے کام بتائے گئے ہیں۔ یعنی رب ہی پیدا کرتا، رزق دیتا اور مارتا و جلاتا ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۔ سورہ ہود۔ آیت ۱۰۷۔

تیرا رب جو چاہے کرتا ہے۔

وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ○ سورہ انبیاء۔ آخری آیت

ہمارا رب بہت رحم کرنے والا ہے اور اسی سے مدد مانگی جاتی ہے۔ ان باتوں میں جو تم بیان کرتے ہو۔

رب العالمین کی تشریح کرتے ہوئے جناب امام حسن عسکری علیہ السلام ان کی طرف منسوب کردہ تفسیر میں بیان فرماتے ہیں: اَیْ مَالکھم وخالقھم وسائق ارزاقھم یعنی ان کا مالک ان کا خالق اور ان کو روزی پہنچانے والا بلفظ رب کی انہوں نے یہ تفسیر فرمائی ہے۔ ان کی زبانی رب کا معنی ومفہوم بیان کیا ہے۔

عقل اور فلسفی بحث اور شواہد قرآن وحدیث سے یہ امر پایۂ ثبوت و درجۂ یقین تک جا پہنچا ہے کہ پیدا کرنا، رزق پہنچانا، مارنا جلانا، نظام عالم چلانا اس

کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنا، کائنات میں تصرف، تدبیر امور، مینہ برسانا، زمین سے سبزی و پھل اُگانا، یہ سب کام رب حقیقی کے لئے مخصوص ہیں لہذا ان امور میں سے کسی ایک کو آئمہ معصومین علیہم السلام کی طرف منسوب کرنا گویا ان کو رب تسلیم کرنا اور ان کو رب کا مقام دینا ہے۔ اور اسی چیز سے امام معصوم نے منع فرمایا کہ ہمیں مقام ربوبیت سے نیچے رکھو۔ یعنی ان امور مذکورہ کو ہماری طرف منسوب نہ کرو کوئی عہدہ یا مقام و مرتبہ ہو اختیارات سے تمیز پاتا اور پہچانا جاتا ہے۔ جس کے پاس صدر کے اختیارات ہوں درحقیقت وہی صدر ہے خواہ کوئی ہو۔ جس کے پاس گورنر کے اختیارات ہوں وہ گورنر ہے کسے باشد کوئی ہو، جس کے پاس رب والے اختیارات ہوں وہی رب ہے۔

میرے محترم و عزیز شیعہ بھائیو! اختیارات کے اثبات سے عہدہ کا وجود اور اختیارات کی نفی و محرومی سے عہدہ کی نفی ہوتی ہے۔ جس کسی کو عہدہ دیا جاتا ہے اس کو اس عہدہ کے اختیارات بھی تفویض کر دیئے گئے ہیں اور جس سے عہدہ لے لیا جاتا ہے اختیارات بھی لے لئے جاتے ہیں۔

سابقہ آیات کی روشنی میں اور عقلی دلائل سے ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ مذکورہ اختیارات مقام و عہدہ رب کے ساتھ مخصوص ہیں۔ لہذا جنہیں آپ عہدہ رب نہیں دینا چاہتے انہیں رب والے اختیارات بھی سپرد نہ کریں۔ یہی مطلب اور مفہوم ہے نَزِّلُوْنَا عَنِ الرَّبُوْبِيَّةِ۔ ہمیں مقام رب نہ دو اس سے نیچے رکھو۔ اس حدیث کے پہلے جملے کا مفہوم تو ہم نے واضح کر دیا ہے اب دوسرے کا مطلب آپکو سمجھائے دیتے ہیں ؎

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے   ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں

قُوْلُوْا فِيْنَا مَا شِئْتُمْ۔ ہمارے متعلق وہ سب کچھ کہو جو تم چاہو۔

گو بظاہر اس جملہ میں عموم پایا جاتا ہے۔ یعنی سب کچھ وہ کہہ سکتے ہو جو تم چاہو مگر قرائن اس عموم کو عقل و نص کی پابندیوں میں مخصوص کر دیتے ہیں۔ دراصل کوئی عام

بھی اپنے عموم پر باقی نہیں رہتا وہ شرطوں میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ اور وہی شروط و قرائن اس کی تخصیص کر دیتے ہیں عربی میں ایک مقولہ مشہور ہے۔

مَا مِنْ عَامٍ اِلَّا قَدْ خُصَّ ۔ کوئی عام ایسا نہیں جس کی تخصیص نہ کی گئی ہو۔

مثلاً حدیث ہے جس میں بظاہر عموم ہے: مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ جس نے بھی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ حالانکہ جناب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی امت کے تہتر فرقے یہی کلمہ پڑھتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان تمام تہتر فرقوں کو جنت میں جانا چاہیئے۔ لیکن صرف ایک جنت میں جائے گا اور بہتر جہنم میں جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ یہ حدیث عموم پر باقی نہیں رہی۔ یہ حدیث امام رضا علیہ السلام سے بھی منقول ہے مگر ان کے آخری جملے میں پہلے جملے کی تخصیص کر دی وَلٰکِنْ بِشَرْطِهَا وَشُرُوْطِهَا۔ لیکن شرط اور شرطوں کے ساتھ وَاَنَا مِنْ شُرُوْطِهَا۔ ان میں سے ایک شرط میں بھی ہوں۔ اسی طرح رونے اور رلانے والی حدیث کہ جو بھی حسین علیہ السلام پر رویا یا اس نے کسی کو رلایا یا رونے کی صورت بنائی اس پر جنت واجب ہو گئی۔ کیا سب رونے والے جنتی ہیں؟

اس مظلوم بے نوا اور شہید بے خطا پر تو دوست بھی روئے اور دشمن بھی روئے ان کے اصحاب اور اقربا بھی روئے اور خود اشقیاء اور قاتل بے حیا بھی روئے لیکن اس حدیث کے عموم کو بھی خاص کرنے والی حدیثیں ہیں۔ ولایت علی کا قائل ہونا، خلوص و محبت سے رونا، محمد و آلِ محمد علیہم السلام کے زمرہ تابعین میں ہونا۔

اسی طرح کی جتنی احادیث ہیں اور ان میں وَجَبَتْ لَہُ الْجَنَّۃُ "جنت اس کے لئے ضروری ہو گئی" کے جملے مذکور ہیں وہ سب قرآن کی شہادت کے ساتھ پابند مشروط ہیں۔ عقل و نقل (قرآن و حدیث) ان کی تخصیص اور صحت عقیدہ و عمل صالح کی شرط کے ساتھ وجوب جنت کو مشروط کر دیتی ہیں ورنہ دین کی تمام ہدایات اور اسلام کی تمام تعلیمات اصول و فروع اور امر و نواہی، حلال و حرام، پاک و پلید سب بیکار ہو کے رہ جائیں۔ حقوق اللہ اور حقوق الناس کا معاملہ بھی ختم ہو

جائے۔ قرآن اس کی تفسیریں، حدیثیں اور ان کی تشریحیں، فقہی قواعد و ضوابط سارے کے سارے صرف ایک جملہ وجبت لہ الجنۃ سے اڑ جائیں اور کھلی چھٹی مل جائے۔

اس حدیث کے عموم پر عمل کرتے ہوئے ہم آئمہ معصومین علیہم السلام کو رب تو نہ کہیں گے لیکن کیا رسول کہہ سکتے ہیں؟ نبی مان سکتے ہیں؟ کیا ان کو خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شان و مرتبہ میں برابر کہہ سکتے ہیں؟ کیا مثل رسول خدا ان تمام آئمہ کا مقام قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى پر معراج مان سکتے ہیں؟ کیا ایسے امور ہم ان کی طرف منسوب کر سکتے ہیں جو ان سے وقوع پذیر نہیں آئے؟ کیا اُن کی شان میں ایسے جملے استعمال کر سکتے ہیں جو ان کے شایانِ شان اور ان کے مرتبے سے پست ہیں؟ اسی طرح وہ جملے ان کے حق میں ادا کر سکتے ہیں جو ان کے مقام و مرتبہ سے بلند ہیں؟ ایسی باتیں جو انہوں نے کہی نہیں ایسے کام جو انہوں نے کئے نہیں ان کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔

"مَا شِئْتُمْ": (جو تم چاہو) کا جملہ شرطوں اور قرآن مخصصہ کی پابندیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس سے مراد ہے کہ ہر وہ فضیلت اور خوبی ہر وہ شرف اور نیکی ہر وہ معجزہ و کمال جو امامت و ولایت کی حدود کے اندر ہے اور وقوع و وجود ظہور و منصۂ شہود کی شرط سے مشروط ہے۔ ہماری طرف منسوب کر سکتے ہو اور ان حدود کے اندر رہ کر ہمارے فضائل و مناقب، مکارم و معارف جو ہماری شان اور ہمارے مقام کے لائق و مناسب ہیں بیان کر سکتے ہو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ان کے فضائل و کمالات کا سمندر اتنا وسیع ہے کہ اس قلزم کا شناور لاکھ کوشش کرے ساحل کو پا نہیں سکتا اور ان کا علمی و عرفانی عملی اور ایقانی بشری و روحانی اعجازی و نورانی پایہ اتنا بلند ہے کہ طائر بشری ہزار پرواز کرے ان کے حدود و کمال کو چھو نہیں سکتا۔ کاتب امکان ان کے لکھنے سے عاجز اور جن و انسان ان کے شمار کرنے سے قاصر ہیں۔ تاہم امامت و خلافت کی حدیں اس وسیع و عریض فضائل سمندر کو احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے جتنے نام ہیں وہ سب صفاتی ہیں سوائے "اللہ" کہ وہ ذاتی

نام ہے۔ اس کے علاوہ رب مطلق اور رحمٰن دو ایسے نام ہیں کہ غیر اللہ پر ان کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ سورہ مبارکہ الحمد میں اللہ کے بعد اس کی پہلی صفت رب العالمین کا ذکر ہے۔ دراصل تدبیر امور تصرف در کائنات اور نظام عالم پر قدرت و قبضہ یہ ربوبیت سے متعلق ہیں اور ان کا رب ہی کے ساتھ تعلق و واسطہ ہے۔

پیدا کرنا، رزق دینا، حفاظت کرنا، نفع پہنچانا، نقصان پہنچانا، مخلوق کی جسمانی و روحانی تربیت، نشوونما، صحت و شفا، امانت و احیاء، بقا و ارتقاء، حیات و قضا، حاجات کے جملہ امور رب العالمین سے وابستہ ہیں۔ اسی واسطے خاصانِ خدا مرسلین و انبیاء، مخلصین و صلحاء، زاہدین و اتقیاء، علماء و اولیاء نے اپنی دینی و دنیوی حاجات کے لئے اللہ تعالیٰ کو لفظ رب کے ساتھ پکارا ہے۔ خود اللہ سبحانہٗ نے بھی ایسے ہی مقامات پر اپنی صفت رب کا زیادہ استعمال کیا ہے۔ عباد صالحین نے رَبِّ۔ رَبَّنَا۔ رَبِّیْ کا زیادہ استعمال کیا ہے۔ اور اللہ جل شانہٗ نے رَبُّكَ، رَبُّكُمْ۔ رَبُّهٗ، رَبُّهُمْ۔ کے الفاظ بکثرت استعمال کئے ہیں۔ جنہیں حق سبحانہٗ نے قرآن پڑھنے پڑھانے تلاوت کرنے، مطالعہ کرنے کی توفیق دی ہے۔ ان سے پوچھو کہ لفظ رب کتنی بار دعاؤں اور احکام میں وارد ہوا ہے۔ بطور نمونہ ہم چند ان دعاؤں کا ذکر کرتے ہیں جو رب کو مخاطب کر کے مانگی گئی ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام: فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (سورہ بقرہ۔ آیت ۳۷)۔ پس آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے پس اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝

سورہ اعراف۔ آیت ۲۳۔ اے ہمارے رب! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام: وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۝ سورہ نوح۔ آیت ۲۶۔ اور نوح

نے کہا کہ اے میرے رب زمین پر اب کوئی کافر نہ چھوڑ۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ۝ سورہ نوح۔ آیت ۲۸۔ اے رب مجھے اور میرے والدین کو اور جو مومن میرے گھر میں داخل ہو اور تمام مومنین و مومنات کو بخش دے۔ اور ظالموں کو زیادہ سے زیادہ ہلاک کر۔

فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ ۝ سورہ قمر۔ آیت ۱۰۔ پس نوح نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہوں پس میری مدد کر۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام: وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۝ سورہ بقرہ۔ آیت ۱۲۶۔ اس شہر کو امن والا شہر قرار دے اور اس شہر کے باشندوں میں سے جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لائے ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما۔

یہ تمام حضرت خلیل علیہ السلام کی دعائیں ہیں :۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ۔ سورہ بقرہ۔ آیت ۱۲۷۔ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ۝ سورہ ابراہیم۔ آیت ۴۱۔ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ تا آخر آیت سورہ ابراہیم۔ آیت ۳۷۔ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ۝ سورہ صافات۔ آیت ۹۹-۱۰۰۔ اور ابراہیم نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں وہ مجھے راہ لگا دے گا۔ اے رب مجھے صالح فرزند عطا فرما پھر ہم نے اسے بُردبار لڑکے کی خوشخبری دی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام: قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝ سورہ اعراف۔ آیت ۱۵۱۔

حضرت موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي الی اخر آیت۔ سورہ طٰہٰ۔ آیت ۲۵-۲۶۔

قَالَا رَبَّنَا إِنَّنَا نَخَافُ أَن يَفْرُطَ عَلَيْنَا أَوْ أَن يَطْغَىٰ۔ سورہ طٰہٰ۔ آیت ۴۵۔ موسیٰ و ہارون نے کہا اے ہمارے رب! ہم فرعون کی زیادتی و سرکشی سے ڈرتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔ سورہ قصص۔ آیت ۲۱۔ حضرت موسیٰ نے کہا اے رب! مجھے ظالم قوم سے نجات دے:

رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ۔ سورہ قصص۔ آیت ۲۴۔ اے میرے رب! اس وقت جو نعمت میرے پاس بھیج دے میں اس کا بہت محتاج ہوں۔

حضرت ایوب علیہ السلام:

رَبِّ إِنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ سورہ انبیاء۔ آیت ۸۳۔ اے میرے رب مجھے بیماری نے گھیر لیا ہے اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام:

رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ سورہ آلِ عمران۔ آیت ۳۸۔ میرے رب! مجھے پاکیزہ اولاد عطا فرما بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔

حضرت مریم کی والدہ (سلام اللہ علیہا) کی دعا:

قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي۔ سورہ آلِ عمران۔ آیت ۳۵۔ عمران کی بیوی مادرِ مریم نے کہا۔ اے رب! میں نے تیری نذر کر دیا ہے جو میرے پیٹ میں ہے۔ پس تو مجھ سے قبول کر۔

حضرت مریم بتول سلام اللہ:

قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ۔ سورہ آلِ عمران۔ آیت ۴۷۔ مریم نے کہا اے میرے رب! مجھے لڑکا کیونکر ہو گا جب کہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام: رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ۔ سورہ یوسف۔ آیت ۳۳۔ میرے رب مجھے زندان پسند محبوب ہے اس چیز سے جس کی یہ زنان مصر دعوت دیتی ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام: قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ سورہ ص۔ آیت ۳۵۔ حضرت سلیمان نے کہا اے میرے رب! مجھے بخش دے اور ایسا ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کے شایانِ شان نہ ہو۔ بیشک تو ہی بڑا بخشنے والا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام: قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔ سورہ مائدہ۔ آیت ۱۱۵۔ عیسیٰ بن مریم نے کہا اے اللہ اے ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک دسترخوان نازل فرما۔

جناب محمد مصطفیٰ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ: وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔ اے پیغمبر تو کہہ دے اے میرے رب میرا علم زیادہ کر۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا۔ سورہ اسرا۔ آیت ۸۳۔ اے پیغمبر کہہ کہ اے میرے رب مجھے داخل کر داخل کرنا سچائی کا اور...

ہم نے بطور نمونہ پیغمبران ماسلف اور جناب خاتم المرسلین صلوٰۃ اللہ علیہم کی صرف چند دعائیں نقل کی ہیں ورنہ قرآن مجید ایسی دعاؤں سے بھرا پڑا ہے جن میں رب کو مخاطب کیا گیا اور لفظ رب کے ساتھ پکارا گیا ہے۔

اسی طرح امت محمدیہ میں سے صالحین کی دعائیں: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ + رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ + رَبِّ اغْفِرْ

وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ ٥ اس قسم کی بکثرت دعائیں قرآنِ پاک میں مذکور ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کی تخلیق، تربیت، تصرف اور تدبیر اور جملہ امور تکوینیہ کا تعلق ذات رب العالمین سے ہے۔ درحقیقت وہی رب ہے جو ان امور کو سرانجام دے اور جس میں ان کے امور کے سرانجام دینے کی اہلیت نہیں وہ رب نہیں اور جو رب نہیں اس میں ان امور کی انجام دہی کی اہلیت نہیں۔ لہذا چہاردہ معصومین علیہم السلام کی ربوبیت کے عقیدہ سے برگشتگی ان امور تکوینیہ کو ان کے سپرد کرنے اور ان کی طرف منسوب کرنے کے اعتقاد سے دست برداری کا دوسرا نام ہے۔

معجزہ اور دائمی معمول: عقل حکیم قرآن کریم نے شانِ ربانی کے وضاحت اور سلسلہ میں ثابت کر دیا ہے کہ چونکہ چہاردہ معصومین علیہم السلام رب نہیں مربوب ہیں اس واسطے خالق و رازق بھی نہیں۔ مخلوق و مرزوق ہیں۔ اور امور تکوینیہ در نظام عالم تدبیر و تصرف در کائنات صرف قبضہ رب العالمین میں ہے۔ خالق ذوالجلال اور مالک حقیقی نے یہ اختیارات کسی نبی و امام کے سپرد نہیں کئے۔ اسی واسطے ہم تمام دعائیں رب العالمین سے مانگتے ہیں کیونکہ یہ تمام امور اور اسباب زندگی اور اس مخلوق کی بقاء و ارتقاء صرف اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اگر اللہ سبحانہٗ نے یہ امور ائمہ علیہم السلام کے سپرد کر دیئے ہوتے اور خود ان سے دست بردار ہو گیا ہوتا تو کوئی نبی کوئی رسول کوئی ولی کوئی وصی کوئی صالح و متقی اپنی دعائیں رب العالمین اور احکم الحاکمین اللہ جل شانہٗ سے نہ مانگتا اس سے سوال کرتا نہ اس کی بارگاہ میں التجا کرتا اور نہ اپنی دعاؤں میں ربّ اور ربّنا کے لفظ استعمال کرتا اور نہ خدا کو مخاطب کرتا بلکہ سب کچھ ائمہ معصومین علیہم السلام سے مانگتا انہی کو مخاطب کرتا خدا سے بے نیاز ہو کر ائمہ علیہم السلام خصوصاً پنجتن پاک علیہم السلام کے آگے اپنی دینی و دنیوی حاجات پیش کر کے انہی سے قضاء حاجات کا سوال کرتا کیونکہ جب نظامِ عالم اور خلق و رزق، زندگی اور موت کلیتہً ان کے

سپرد کی گئی تو پھر خدا کی طرف متوجہ ہونے اور اس کی طرف رجوع کرنے کا کیا فائدہ جیسے ہاتھ میں کچھ نہیں اسی سے مانگا جاتا ہے جس کے پاس کچھ ہو۔

ہاں بطورِ معجزہ اور باذن اللہ کائناتِ عالم میں تصرف کر کے خرق عادات اور اعجاز و کرامات دکھا سکتے ہیں، جن سے ناظرین کو یقین ہو جائے کہ واقعی یہ خدا کے نمائندے ہیں اور اسی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے مافوق العادت اور خلاف معمول ایسا کام کر دکھایا ہے جو بشری طاقت سے باہر ہے اور تمام انسان اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں۔ اگر انسانی مقدور میں یہ کام ہوتا تو دوسرے انسان انفرادی طور پر نہ سہی اجتماعی طور پر تو کر لیتے لیکن نبی و امام کے معجزہ کے مقابلہ میں تمام انسانوں کا مل کر بھی نظیر پیش کرنے سے عاجز آجانا یہ دلیل ہے کہ نبی و امام کے پاس اس وقتِ اعجاز خدا کی عطا کردہ قوت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے زمانہ بھر کے لوگوں پر غالب آجاتا ہے۔

اور معجزہ مختلف صورتوں میں مختلف و متعدد زمانوں میں اقوام کے مناسب حال ہر رسول و نبی اور ہر امام و ولی کے پاس ہوتا ہے۔ الخ

لیکن معجزہ و خارق عادت امر سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ خدا نے سارے عالم کا نظام خلق و رزق، زندگی و موت، دکھ سکھ صحت و بیماری اور تمام امورِ کائنات کلیتہً ان کے سپرد کر دیئے ہیں۔ جب چہاردہ معصومین علیہم السلام اور انبیاؑ و مرسلین کے معجزات پیش کئے جاتے ہیں تو سامعین کرام اور مومنین عظام یہی تاثر لیتے ہیں کہ خدا نے کائنات کی باگ ڈور اور نظام عالم سارے کا سارا انہیں کے مطلقاً سپرد کر دیا ہے۔

اس میں سامعین کا اتنا قصور نہیں جتنا واعظین و ذاکرین کا ہے کہ معجزہ پیش کرتے وقت پوری کیفیت بیان نہیں کرتے اور معجزہ و معمول میں فرق نمایاں نہیں کرتے اور اسی فرق کو ظاہر نہ کرنے کی وجہ سے غلو کی حدود میں وسعت پیدا ہوئی اور مومنین حضرات کی نگاہیں توحید سے پھر کر ائمہ معصومین کی طرف جم گئی

ہیں۔ ان کے دلوں میں خدا کی عظمت گھٹ گئی ہے اور توجہ خدا سے ہٹ گئی ہے زبانی طور پر کچھ کہتے پھریں۔ لیکن ان کے معمول سے پتہ چلتا ہے کہ خدا ان کی نظر میں حقیر ہے اس کی ان کے دلوں میں کوئی وقعت نہیں۔ بس جو کچھ ہیں پنجتن پاک اور بارہ امام علیہم السلام ہیں۔

اگر یاد ہے تو صرف انہی کی توجہ ہے تو صرف انہی کی طرف دھیان وخیال میں ہیں تو بس یہی جو مقام توحید کا تھا معجزات کی برکت سے ان کو مل گیا۔ خدا خیالوں سے محو ہو گیا نہ اس کی عظمت وکبریائی رہی اور نہ اس کی وحدت و یکتائی رہی۔ پھر عظمت و بڑائی رہے تو کیسے؟ جب سب کچھ ان کو دے بیٹھا خود خالی ہاتھ ہو گیا اس کے پاس رہا کچھ۔ جو کچھ تھا ائمہ علیہم السلام کے پاس آگیا پھر اس کے پاس کیوں جائیں۔ اسی کے پاس جاتے ہیں جس کے پاس کچھ ہو۔ یہ سب مہربانیاں ہمارے واعظین و ذاکرین کی ہیں۔ جو جوشِ خطابت یا جذبۂ جہالت یا ہوسِ دولت میں معجزہ بیان کرتے وقت خدائی اختیارات کلیتہً اس سے لے کر ائمہ اطہار کے سپرد کر دیتے ہیں۔ خدا کی ملکیت کا انتقال ائمہ معصومین کے نام کر دیتے ہیں اور خدا کو عاجز و مغلوب بنا کے اس کے گھر میں جھاڑو پھیر دیتے۔ پھر خدا صرف بے چارہ و بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام اپنی نبوت و امامت کی تصدیق اور اپنے دعوے کے ثبوت میں معجزات پیش کرتے ہیں اور مختلف و متعدد معجزات پیش کرتے رہے۔ جن میں ہر قسم کا معجزہ ہے۔ مثلاً روزی کا بڑھانا، بے اولادوں کو اولاد دلانا، مینہ برسانا، مردوں کو زندہ کرنا، بیماروں کو شفا دینا، غیب کی باتوں سے آگاہ کرنا، نار کو گلزار میں تبدیل کرنا، پرندوں کو زندہ کرنا، عصا کو اژدہا بنانا وغیرہ۔ بکثرت اور ہر قسم کے معجزات قرآن اور روایات میں مذکور ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن معجزہ یہ نہیں ثابت کرتا کہ تمام خدائی اختیارات اور امور تکوینیہ کُل کے کُل ہمیشہ کے لئے ان کے سپرد کر دیئے گئے اور خدا عالمین کی ربوبیت سے

فارغ ہو گیا ہے۔
معجزہ میں یہ اختلاف کیا گیا ہے کہ آیا معجزہ فعلِ خدا ہے یا فعل معجزہ نما ہے۔ فعل معجزہ نما کی صورت میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ معجزہ ایک وقتی کمال ہے جو صاحبِ اعجاز کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں وقتی اور عارضی طور پر نبی و امام کو حق تصرف دیا جاتا ہے۔ اور اذن اللہ کی پابندی لگی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اذن جزئی ہوتا ہے کلی نہیں ہوتا اور بغیر اذن خدا نبی و مرسل، امام و وصی کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے۔ اعجاز خدا دکھانے کے لئے اجازت خدا ضروری ہے۔
وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ سورہ مومن۔ آیت ۷۸۔ سورہ رعد آیت ۳۸۔ کسی رسول کے لئے یہ حق نہیں کہ کوئی معجزہ پیش کرے بغیر اللہ کی اجازت کے۔
کچھ لوگ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے حضور پاک سے درج ذیل معجزات طلب کئے مگر حضور پاک نے معذوری ظاہر کی۔ ہم وہ آیات باترجمہ پیش کرتے ہیں:
وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۝ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ۝ پارہ ۱۵۔ سورہ الاسرا۔ آیت ۹۰ تا ۹۳ - ان لوگوں نے کہا کہ ہم آپ پر ایمان نہیں لاتے جب تک کہ آپ زمین سے چشمہ پیدا نہ کریں یا آپ کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اس میں آپ نہریں جاری کریں یا جس طرح کہ آپ کا دعویٰ ہے ہم پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرائیں یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے بطور گواہ پیش کریں یا آپ کا سونے کا گھر ہو یا ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور آسمان پر آپ کے چڑھنے

کا ہم یقین نہ کریں گے۔ جب تک کہ ہم پر ایک کتاب نہ نازل کریں جسے ہم پڑھ سکیں۔ اے رسول کہ دو میرا رب ہر عیب و نقص پاک ہے۔ میں نہیں ہوں مگر ایک ایک بشر اور رسول۔

ان آیات قرآنی سے یہ ثابت ہوا کہ خود معجزہ بھی پیغمبر اور امام کے اپنے اختیار میں نہیں، جناب سید الانبیاء کا اس مقام پر معذوری کرنا اور ان کی منشاء و مرضی کے مطابق (ہو سکتا ہے کہ ان کا مقصد ایمان لانا تسلی کرنا نہ ہو بلکہ استہزاء و تمسخر ہو) ایسے امور کا بطور اعجاز پیش نہ کرنا بلکہ اپنی بشریت اور رسالت ظاہر کرنا ثابت کرتا ہے کہ امور تکوینیہ میں تصرف بشر (خواہ رسول بھی ہو) کے مقدور میں نہیں جب تک اذن خدا نہ ہو۔

معجزہ اور معمول: معجزہ کبھی کبھی ہوتا ہے اور دست نبی و امام پر ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن معمول دائمی ہے۔ کائنات میں تمام افعال خدا معجزہ ہیں۔ عالم کا پیدا کرنا۔ زمین بچھانا آسمان کو سقف کی صورت میں بلند بنانا۔ ہوائیں چلانا، مینہ کرنا، پہاڑوں کو میخوں کی حیثیت سے قرار ارض کا باعث بنانا، دریاؤں کا جاری کرنا، گونا گون مخلوق پیدا کرنا، انواع و اقسام کے اشجار اور طرح طرح کے پھول و اثمار یہ بشر کے بس سے باہر ہیں اور تمام خدائی فعل ہیں انسان ان کے بنانے سے عاجز ہے لیکن چونکہ ہمیشہ سے ہیں جب تک عالم ہے یہ دائمی ہیں اس واسطے ان کو معجزہ نہیں کہا جاتا اور پیغمبر و امام کبھی کبھی خوارق عادات پیش کرتا ہے۔ اس کا دائمی معمول نہیں لہذا ان کا وہ عمل معجزہ کہلاتا ہے۔ اس واسطے معمول ہمیشہ جاری رہتا ہے اور معجزہ کبھی کبھی اور وہ بھی اذن خدا کی پابندی میں گھرا ہوا اور وقت کی حد بندی میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ اگر اس صورت میں کہ معجزہ فعل نبی و امام ہے۔ تو کائنات میں تصرف اور مداخلت کا اختیار اور امور تکوینیہ کی تفویض جزئی و وقتی ہے۔ کلی اور مستقل نہیں جزئی و وقتی اختیار و تفویض سے دائمی و کلی و مستقل اختیارات ثابت نہیں ہو سکتے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کے بہت سے معجزے کتب میں مذکور ہیں۔ کسی کو فرزند دلانا کسی کے رزق میں برکت، کسی کو شفا وصحت، کسی کی عمر میں وسعت، کسی کو فتح ونصرت، کسی کو دشمن سے حفاظت، کسی کی سلامتی کے ساتھ وطن کو مراجعت ان تمام معجزوں میں ائمہ علیہم السلام کی دعائیں اور بارگاہ قادر کریم میں التجائیں شامل ہیں یعنی ان امور کے لئے انہوں نے رب العالمین کی بارگاہ قدس میں دعائیں کیں اور رب العزۃ نے ان کی دعائیں مستجاب فرمائیں جو ان کی مشیت تھی، مشیت ایزدی نے پوری کر دی۔ بھلا ان حقائق سے کون مومن انکار کر سکتا ہے۔ ایسی حقیقتوں کے منکر کو نہ مومن کہا جا سکتا ہے اور نہ محب اہل بیت۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دعا اس چیز کی مانگی جاتی ہے جو اس کے اختیار میں نہ ہو۔ اختیار وبس والی چیز کو خود عمل میں لایا جاتا ہے اور اختیار وبس سے باہر کی چیز ہے حصول کے لئے دعا مانگی جاتی ہے۔ لہذا جن معجزوں کو ائمہ علیہم السلام کی دعاؤں نے ظہور بخشا وہ خود ان کے اختیار وتصرف میں نہ تھے بلکہ رب العالمین کے تصرف واختیار میں تھے اگر خود اُن کے اختیار میں ہوتے تو دعا نہ مانگتے۔ خود ان کو ظہور ووجود بخشتے۔

مثلاً سورج کا لوٹانا: جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اللہ جل شانہ سے دعا مانگی۔ سورج مقام عصر پر لوٹ آیا۔ امیر علیہ السلام نے نماز عصر ادا کی یا جنگ صفین سے مراجعت کے وقت جناب امیر نے دعا مانگی اور سورج عصر کے مقام پر لوٹ آیا۔ ان کی دعا تھی لوٹانے والا خدا تھا۔ واقعات کتابوں میں اسی طرح ہیں آگے ذاکرین ومقررین کی مرضی جس انداز اور جس رنگ میں سامعین کو خوش کرنے کے لئے بیان کریں مگر کذب ہے اور صدق صدق۔ کسی روایت میں نہیں ملتا کہ جناب امیر علیہ السلام نے انگلی کا اشارہ کیا اذر سورج لوٹ آیا۔ بلکہ پہلی بار حضور رسول کریمؐ نے اور دوسری بار خود جناب امیر علیہ السلام نے دعا کی کہ پروردگار! سورج کو عصر کے مقام پر لوٹا

دے تاکہ ہم نماز عصر ادا کر سکیں۔ دعائیں مستجاب ہوئیں۔ اور سورج ان کے لئے دو مرتبہ لوٹایا گیا۔ واقعات پڑھیں پھر سمجھیں کہ دعا مانگنے والا کون ہے اور سورج لوٹانے والا کون ہے۔

اسی طرح اگر معجزات کا کتب میں مطالعہ کیا جائے نہ کہ سٹیج پر سنا جائے تو معجزہ کی صورت سمجھ میں آسکتی ہے۔ اور معجزہ دکھانے سے تمام اختیارات ربانیہ کا مطلقاً حصول ثابت نہیں ہوتا۔

اذن مالک کی طرف سے ہوتا ہے: کسی کی ملکیت میں تصرف اور دخل اس کے مالک کے اذن سے ہو سکتا ہے اور اذن وہی دیتا ہے جو مالک ہوتا ہے۔ معجزہ تصرف اور دخل امور کائنات میں ہوتا ہے اور بغیر اذن خدا اس کا وقوع نہیں ہوتا لہذا ماننا پڑے گا کہ کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ جب ہی تو اس کے اذن کی ضرورت ہے۔ اگر ائمہ و رسل علیہم السلام عالمین کے خالق و مالک ہوتے انہیں اذن خدا کی ضرورت نہ ہوتی اور بغیر اذن تصرف در کائنات کرتے اور بغیر اذن معجزات دکھاتے۔ اذن حاصل کرنے کی پابندی خود اس امر کی دلیل ہے کہ کائنات اور اس میں امور تکوینیہ از قسم خلق و رزق، موت و حیات، دکھ سکھ اور دیگر امور زندگی کا مالک خدا ہے اور تمام امور صرف اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر پرندہ کی شکل بنا کر اس میں رُوح پھونکتے۔ مُردوں کو زندہ کرتے، بیماروں کو شفا بخشتے، گھروں میں ذخیرہ شدہ اشیاء کی خبر دیتے تو باذنِ خدا سب کچھ کرتے۔ قرآن مجید میں جہاں ان معجزات کا ذکر ہے وہاں "بِاِذْنِی" کی قید اور پابندی لگی ہوئی ہے۔

اذن کی قید کلی اختیارات اور تفویض مطلق کی نفی کرتی ہے۔

باقی رہے ائمہ معصومین علیہم السلام کے فضائل و کمالات مناقب و کرامات علوم و معارف، محامد و مکارم تو ان کی وسعت و بلندی کو طائر خیال پہنچ نہیں

سکتا۔ ان کی ولادت کے پاکیزہ حالات ان کی زندگی کے خوارق و عادات ان کے مراتب عالیہ اور مدارج رفیعہ بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کو خدائی اختیارات بھی حاصل ہو گئے ہیں اور امور تکوینیہ کی ان کو تفویض بھی ہو گئی ہے۔

ہماری اس بحث اور واضح بیان سے یہ بات قارئین کرام کی سمجھ میں آگئی ہو گی کہ نَزِّلُوْنَا عَنِ الرَّبُوْبِيَّةِ وَقُوْلُوْا فِيْ فَضْلِنَا مَا شِئْتُمْ وَلَنْ تَبْلُغُوْا۔ ہمیں مقام رب کے نیچے رکھو مقام ربوبیت نہ دو اور ہماری فضیلت میں جو چاہو کہو اور ہمارے فضل کی حد تک ہرگز نہ پہنچ سکو گے۔ اس سے صرف لفظ رب کی نفی کی گئی۔ رب کے افعال مخصوصہ اور شان و اختیارات ربانی کی نفی بھی کی گئی ہے لہذا وہ امور و اختیارات جو صرف ذات رب العالمین کی شان کے لائق اور اسی کے مقام و مرتبہ کے ساتھ اختصاص رکھتے ہیں۔ کسی نبی و مرسل اور کسی امام و ولی وصی کی طرف منسوب نہ کرنے چاہئیں۔

اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ وَخَيْرُ الرَّازِقِيْنَ

اَللّٰہ سب خالقوں سے بہتر اور تمام رزق دینے والوں سے اچھا ہے۔

یہ دو جملے اللہ سبحانہٗ کی شان و توصیف کے بارے میں قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔ ایک مقام خالقیت میں فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ اور دوسرا سورہ جمعہ میں وَاللّٰهُ خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ۔

ان سے غالی حضرات یہ مطلب اخذ کرتے ہیں کہ اللہ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ اور خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے سوا اور بھی خالق اور رازق ہیں۔ جمع کا لفظ ہے جو بہتوں پر دلالت کرتا ہے۔ اگر اور خالق و رازق نہ ہوتے تو خدا اپنی مقدس کتاب ہدایت میں جمع کا صیغہ استعمال نہ فرماتا اور جب خود خدا فرما رہا ہے کہ اور خالق اور رازق ہیں تو ہم اگر ائمہ علیہم السلام کو خالق و رازق کہہ دیں تو کسی کو درد کیوں اٹھتا ہے اور وہ غلو و شرک کے فتوے کیوں جاری کرتے

اور شانِ ائمہ میں جرم و تقصیر کے مرتکب کیوں ہوتے ہیں۔

یہ اہلِ غلو کا اعتراض اور استدلال ہے جو ہم نے بیان کیا ہے اور انہی کی زبان میں بیان کیا ہے۔

اب ہم اس پر بحث کرتے ہیں اور نتیجہ خود قارئین کے سپرد کرتے ہیں کہ آیا ہمارا بیان سچا ہے یا اُن کا۔

دستور اور معمول کے مطابق سلسلۂ خلق و رزق مادی اسباب پر موقوف ہے آپ نے کوئی ایسی مخلوق دیکھی کہ بغیر اسباب اور مروجہ قوانین قدرت کے بغیر عالم وجود میں آئی ہو سوائے حضرت آدم و حوا اور جناب عیسیٰ علیہم السلام کے یا رزق کی کوئی ایسی صورت دیکھی کہ پکی پکائی روٹی اور پکا پکایا سالن کسی کے گھر میں آسمان سے نازل ہوا ہو سوائے من سلویٰ کے جو چند دن امت موسیٰ علیہ السلام کے لئے آسمان سے نازل ہوتا رہا۔ یہ دنیا عالم اسباب ہے خلق بھی اسباب پر منحصر ہے اور رزق بھی رہینِ منت اسباب ہے کوئی شخص کہہ دے کہ وہ بغیر ماں باپ کے ملاپ کے پیدا ہوا یا خدا نے کسی کو آسمان سے پھینکا۔ خدا مسبب الاسباب ہے اس نے پیدائش کے بھی اسباب پیدا کئے ہیں اور رزق کے بھی۔ خدا رزق دیتا ہے ان معنوں میں کہ وہ سبب بنا دیتا ہے۔ کسی شخص کی روزی کا ورنہ روزی تو آدمی خود کماتا ہے۔ مزدور دن بھر یا رات بھر مزدوری کرتا ہے۔ کاریگر کارخانوں میں کام کرتا ہے۔ اہل کار دفتروں میں، معلمین مدارس میں، دکاندار دوکانوں میں، ذاکر اور واعظ مجالس کے ذریعہ اور کسان کاشتکاری سے، تاجر تجارت سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ مختلف قسم کے کاروبار ہیں اور ہر شخص کاروبار کے ذریعہ پیٹ پال رہا ہے۔ انسان اپنا رزق خود حاصل کرتا ہے کماتا ہے۔ کیا خدا اس کے لئے چھت پھاڑ کر کھانا و لباس بھیجتا ہے؟ کبھی دیکھا کہ گھر میں رکھے ہوئے روپوں میں گندم میں آٹے میں گھی میں کپڑوں میں زیورات میں برتنوں میں خود بخود اضافہ ہو گیا ہو۔

برادرانِ من! آپ نے خلق و رزق کا مطلب نہیں سمجھا۔ خلق اور رزق اسباب سے ہے اور ان اسباب کا خالق اللہ ہے۔ خالق حقیقی اور رازق حقیقی علی الاطلاق خدا ہے باقی مجازی ہیں جو اسباب خلق و رزق ہیں۔ کبھی سبب کی طرف بھی خلق و رزق کی طرف ہوجاتی وہ مجازی ہوتی ہے۔ اور کبھی مسبب الاسباب کی طرف ہوتی ہے جو حقیقی ہوتی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے نہر بہ رہی ہے بہتا تو پانی ہے۔ لیکن نہر چونکہ اس کا ظرف مکان ہے اس واسطے سے اس کی طرف مجازاً نسبت ہے۔ دوا نے شفا بخشی یا طبیب نے صحت عطا کی۔ شافی مطلق تو خدا ہے۔ البتہ طبیب و دوا سبب شفا ہے۔ مجازاً شفا کی نسبت دوا کی طرف ہے۔ طبیب اور دوا سبب ہے اور خدا مسبب الاسباب ہے۔ کسی غریب کے گھر فاقہ ہے افلاس ہے۔ کوئی کریم ان کو غذا اور نقدی دیتا ہے اسے مجازی رزاق کہہ سکتے ہیں اور یہ ہر کوئی ہو سکتا ہے۔

بیج ڈالنا انسان کا کام اور بیج سے اس قسم و نوع کی مخلوق پیدا کرنا رحمٰن کا کام اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ سورہ واقعہ۔ آیت ۵۸، ۵۹۔ وہ نطفہ جو تم عورت کے رحم میں ڈالتے ہو کیا اس سے انسان کے خالق تم ہو یا ہم ہیں۔ ملاپ تمہارا کام ہے اور اس بیج سے انسانی شکل تیار کرنا ہمارا کام ہے۔ تم خالق نہیں ہم خالق ہیں۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ سورہ واقعہ۔ آیت ۶۳، ۶۴۔ تم لوگ جو کچھ بوتے ہو اس سے تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔

جو تمہارا عمل ہے وہ تمہاری طرف منسوب اور جو عمل تمہارے سے بلند ہے وہ خدائے کریم کی طرف منسوب۔

اس مقام پر نطفہ سے انسانی پیدائش اور بیج سے اشجار و اثمار کھیت اور غلوں کی پیدائش خدا نے اپنی طرف منسوب کی ہے اور غیر کی طرف نسبت کی نفی،

بھی کر دی ہے۔ حقیقی خالق وُہ ہے جو نطفہ سے حیوانی و انسانی شکل بنائے۔ اور بیجوں سے سبزیاں، درخت، چارے، پھل اور غلات اگائے۔ یہ دونوں کام خدا کے ہیں، غیر اللہ کے نہیں۔ اور سبزیاں، چارے، پھل، غلات۔ یہی انسانوں اور حیوانوں کی روزی ہیں۔

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ۔ سورہ بقرہ پارہ ۱

آسمان سے مینہ برسایا اور اس سے تمہارے لئے پھل نکالے جو تمہاری روزی ہیں۔

عدم سے وجود میں لانا، نیست سے ہست میں لانا اور مختلف اقسام کے بیجوں سے ان کی انواع کا پیدا کرنا خدا کا کام ہے اور وہی خالق حقیقی ہے۔ البتہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو ترکیب دے کر نئی شکل والی چیز بنانا۔ مثلاً لکڑی سے کرسی میز یا فولاد اور دھاتوں سے کئی حیرت انگیز چیزیں ایجاد کرنا اس قسم کے صانع کو خالق مجازی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اسباب رزق کو پیدا کرنا اور بیجوں سے پھل نکالنا یہ رزق ہے اور اس کا خالق ہی رازق حقیقی ہے۔ جو اسباب رزق پیدا کرتا ہے۔ البتہ ذریعۂ رزق بننا مثلاً کسان، کارخانے وغیرہ ان کو رازق مجازی کہہ سکتے ہیں۔ خالق و رازق حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور مجازی اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ کوئی فضیلت و امتیازی شان کی بات نہیں اس میں عام لوگ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ والد اولاد کے لئے، مل مالک مزدوروں کے لئے مجازی رازق ہیں۔

ایک روایت جو نہایت جھوٹی اور خلاف عقل ہے۔ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ کہ مولا صبح و شام رزق مٹھی میں لے کر مشرق و مغرب کی طرف پھینکتے ہیں اور تقسیم کرتے ہیں۔ نہ معلوم وہ رزق کس کا ہے؟ زمین کے باشندوں نے کبھی دیکھا ہے؟ اگر زمین پر آتا تو کوئی تو دیکھتا؟ آسمان والوں کو ضرورت نہیں۔ وہ اس قسم کے خورد و نوش سے بے نیاز ہیں۔ اس قسم کے خود ساختہ روایات اپنے تئیں بڑا محب ظاہر کرنے اور سامعین کو خوش کرنے کے لئے سنائی جاتی ہیں البتہ کسی معصوم کی دعا کسی کی پیدائش و رزق کا ذریعہ ہو تو مجازاً اس کی طرف

خلق ورزق کی نسبت صحیح ہے۔

حقیقی خالق کی یکتائی کے لئے یہی آیت کافی ہے۔ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ۔ پارہ ۲۴۔ سورہ حم سجدہ۔ استفہام انکاری کی صورت میں ازراہ تعجب پوچھا جارہا ہے کہ کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے؟ یہ آیت غیر اللہ کے خالق ہونے کی نفی کرتی ہے۔ اسی طرح اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ؁ بے شک اللہ ہی رزاق ہے جو طاقت ور اور مضبوط ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے اللہ ہی رزاق ہے اس کے سوا کوئی رزاق نہیں۔ جس طرح رب مجازی اللہ کے سوا اور بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ماں باپ، مالک، استاد جنہیں دوسرے لفظوں میں مُرَبّی بھی کہا جاتا ہے اسی طرح مجازی رازق اور بھی ہیں۔ لیکن یہ اتنے عظیم الشان نہیں ان میں اتنا فضل وشرف نہیں کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کو فخریہ طور پر مجازی خالق اور مجازی رازق کہا جائے۔ ان میں اور بھی شریک ہیں معمولی آدمی کو بھی کہہ سکتے ہیں۔

حصہ سوم

باب عزاداری

سٹیج و منبر کی اصلاح

شیعہ قوم میں جتنی اصلاحات کی ضرورت ہے ان میں سٹیج کی اصلاح بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ سٹیج کی غیر ذمہ داری قواعد و ضوابط کی پابندی سے مطلق آزادی شرعی معاشرتی و اخلاقی اقدار کی پائمالی مذہبی حدود سے تجاوز اور غلط روایات و من گھڑت کہانیوں کی نشر و اشاعت تجارتی منڈی اور کاروباری اڈے کی حیثیت سے اس کا بلا جھجک استعمال سٹیج کا بگڑا ہوا انتظام ہے جس میں بانیانِ مجالس واعظین و ذاکرین اور سامعین برابر کے شریک ہیں۔

یہ وہ مقدس مقام تھا جہاں دینِ اسلام کے احکام اور مسلک اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات نشر کی جاتی تھیں۔ توحید و نبوت اور امامت و ولایت کے اسرار سمجھائے جاتے اسلامی ہدایات اور الہامی تعلیمات کی اسی جگہ سے نشر و اشاعت ہوتی۔ قرآن کی تفسیر احادیث کی تشریح اور علمی مسائل بیان کئے جاتے۔ مکارم اخلاق اور اقدار انسانیت کے درس دیئے جاتے اس روحانی مرکز سے غیر مسلموں کے اعتراضات اور مذہب اہل بیت علیہم السلام پر وارد ہونے والے سوالات کے تسلی بخش جواب دیئے جاتے۔ تزکیہ نفس و تطہیر اخلاق کی تربیت دی جاتی۔ واعظین و مقررین وکلاء و محافظین اسلام۔ تعلیمات آلِ محمد علیہم السلام کے فرائض انجام دیتے تھے۔ منبر و سٹیج روحانی تربیت کی ایک مقدس درسگاہ تھی۔

مودت قربیٰ میں سرشار زبانیں سچے فضائل اور صحیح مناقب سے قلوب سامعین کو منور کرتیں اور کربلا کے شہیدوں اور کوفہ و شام کے اسیروں کے صحیح مگر دل سوز اور جگر پاش واقعات سے حاضرینِ مجلس کی آنکھیں آنسو

بہاتیں ظالم سے نفرت اور مظلوم سے الفت کے جذبات برانگیختہ ہوتے۔ رُوحانی بزم اور مقدس محفل سے پڑھنے اور سننے والے ثواب کی جھولیاں بھر کر لوٹتے۔ پنجتن پاک کی مقدس ارواح ان رُوحانی مجالس سے مسرور ہوتیں اور مذہب حق مسلک اہل بیت رسول علیہم السلام ان ہی مجالس کے ذریعہ زندہ پائندہ رہا اور ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ کیونکہ تعلیماتِ آلِ محمد اور ان کے فضائل و مصائب کے نشر کا سب سے بڑا مرکز یہی سٹیج و منبر تھے۔

آج اس کا بگڑا ہوا نظام اور مجلس کے مقصد کی پائمالی دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ رُوحانی تربیت تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق کا کام ختم ہو چکا ہے۔ یہ ایک کسبِ معاش اور تجارتی کاروبار کی منڈی بن گئی ہے۔ غلط بیانی جھوٹی روایات من گھڑت افسانے اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق قرآن کی تفسیر اور ضعیف و جعلی احادیث بلاخوف بیان ہو رہی ہیں۔ خوفِ خدا قیامت کا ڈر اور باز پرس کا اندیشہ نہیں رہا ہے۔ بیان کرنے والا اپنی من گھڑت روایات و حکایات اس ڈھٹائی اور بے پرواہی سے پڑھتا ہے۔ اسے نہ سامعین کا نہ بانیین کا اور نہ خدا کا خوف محسوس ہوتا ہے۔

ذاکر و واعظ شاید یہی خیال کرتا ہے کہ یہی تو ایک خاص مقام ہے جہاں جھوٹ بولنے کی مکمل آزادی ہے۔ خوش الحان اپنی سُروں اور مقرر اپنے لفظوں و جملوں اور چہرے اور ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ہماری قوم کی کمائی آج اس فن کی نذر ہو رہی ہے۔ اور گھنٹہ بھر کے فنی مظاہرہ کی فیس ہزاروں روپے ادا کی جا رہی ہے۔ حقیقت مٹ رہی ہے بناوٹ ابھر رہی ہے۔ افادیت ختم ہو رہی ہے۔ نمائش بڑھ رہی ہے۔

سامعین داد و تحسین کے نعروں میں بخل نہیں کرتے۔ مگر نعروں کا زیادہ زور غلط نکتوں اور بے جا جملوں پر ہوتا ہے۔ گریہ و بکا کی کثرت ہے۔ مگر زیادہ گریہ غلط روایات اور جھوٹے فقرات پر ہوتا ہے۔ لاکھوں کروڑوں روپے خرچ

ہو رہے ہیں مگر ہدایت کی بجائے ضلالت پھیل رہی ہے۔ قوم کا کثیر سرمایہ نمائش کی نذر ہو رہا ہے۔ تبلیغ نہیں رہی تملیع کی کثرت ہے۔ افسوس کہ قومی متاع اور مذہبی دولت لٹ رہی ہے۔ اور قوم تماشا دیکھ رہی ہے۔ حقیقت بدل رہی ہے اور ہمیں احساس نہیں۔ اصلاح جس قدر نہایت ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔

سٹیج کی غیر ذمہ داری اور اس کے نظام کا بگاڑ اور قواعد و ضوابط سے آزادی میں تین حصہ دار ہیں: بانیانِ مجالس، واعظین و ذاکرین، حضرات سامعین ہم ان تینوں حصہ داروں کو ان کی غلطیوں، خامیوں اور ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ اور پھر اُن کے لئے اصلاحی تجاویز اور عملی تدابیر پیش کرتے ہیں شاید ان پر عمل پیرا ہونے سے مجالس کا بگڑا ہوا نظام سنور سکے۔ اور قوم کی عظمت وارفتہ بحال ہو سکے۔ کام بڑا دشوار اور کٹھن ہے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ۔ وَاِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ۔

"ہمارے ملک میں مجالس کی ابتداء":

ؔ مظلوم سے پیدا الفت ہو اور روح یزیدی مٹ جائے
اس واسطے تیرے درد بھرے حالات سنائے جاتے ہیں

عزاداری کی حقیقت و افادیت

تعزیت کا معنی ہے، پرسا دینا: شریکِ غم ہونا۔ جس کا کوئی عزیز انتقال کر گیا ہو اس کے پاس جا کر افسوس کا اظہار کرنا۔

تعزیت سے غمزدہ شخص کو ایک طرح تسکین ہو جاتی ہے اس کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ پرسا دینے سے ہمدردی اور مواسات کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اس واسطے عیادت (بیمار پرسی) اور تعزیت (ماتم پرسی) کی شریعتِ محمدی میں

تاکید کی گئی ہے۔ یہ ایک اخلاقی اور شرعی فریضہ ہے۔ جو انسانی اقدار کو بلند کرتا ہے۔ اور رحمدلی اور مواسات کا سبق دیتا ہے۔

واقعہ کربلا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا اور شہدا کربلا کی قربانیاں نہ تھیں۔ مصائب و آلام کی انتہا تھی اور مقصد شہادت جو بقائے اسلام حفاظت دین اور انسانی قدروں کی نگہداشت پر مشتمل تھا۔ نہایت عظیم الشرف تھا نہایت بیدردی اور بے حد مظالم کے ساتھ آل رسول پاک شہید کر دی گئی اور نہایت بے رحمی اور ظلم و تشدد کے ساتھ ہاشمی شہزادیاں اور دختران علی و بتول قید کی گئیں۔ جن کی بے کسی، غربت اور مظلومی پر دوست و دشمن روئے۔ اس حادثہ پر جتنا ہی گریہ کیا جائے اور کتنا ہی ماتم کیا جائے کم تھا۔ اس واسطے اہل بیت رسول نے شام سے واپسی کے بعد صف ماتم بچھائی اور ائمہ معصومین علیہم السلام نے اس غم کو تازہ رکھا، مجالس عزا اپنے گھروں میں قائم کی جن میں واقعات کربلا بیان کئے جاتے جنہیں سن کر خود ائمہ اطہار بھی روتے اور اہل ایمان حق ماتم داری ادا کرتے سننے والے مومنین کو ثواب کی ترغیب دی جاتی اور بیان کرنے والے ذاکرین کو اجر اخروی کے علاوہ مال دنیا سے بھی نوازا جاتا تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور ثواب دنیا و آخرت کی چاہ میں واقعہ کربلا کی اشاعت کریں۔ مظلومیت کا پرچار کریں اور ظالموں کو بے نقاب کریں۔

مجالس عزا کے انعقاد سے قومی و مذہبی و دینی و دنیوی بہت سے فوائد ہیں؛ محبت اہل بیت کا تقاضا پورا ہوتا ہے۔ کیونکہ محبت اہل بیت جو اصل ایمان ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ روح رسول اور علی و بتول کو ان کی اولاد کی شہادت و اسیری کے صدمات اور دل فگار واقعات پر تعزیت پیش کریں۔ کھلے میدان میں ان کے گھروں کے برباد ہونے اور ان کے آباد چمن اجڑنے کا پرسا دیں اور اس صورت میں محبت کے عملی فریضہ کو ادا کریں۔

مومنین کے اجتماع سے باہمی تعلق واقفیت روشناسی اور روا بط پیدا

ہوتی ہے۔ اس طرح ایک دوسرے کی حاجت روائی اور دکھ درد میں مواسات کا موقع ملتا ہے۔

- گریہ و بکا کا ثواب حاصل ہوتا ہے اور تاریخ سے واقفیت اور فضائل و مصائب سننے کا موقع ملتا ہے۔ معلومات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔
- مجلس ایک بہترین درسگاہ ہے۔ جہاں قرآنِ مجید کی تفسیر احادیث رسول و اہلِ بیت رسول علیہم السلام کی تشریح، علم کلام، فقہ و اصول فقہ، تاریخ اور علمی نکات بیان کئے جاتے ہیں اور اس طرح سننے والے اس مجلس کی خلیج سے بیش بہا موتی رولتے اور علمی جواہر سے جھولیاں بھر لے جاتے ہیں۔
- مجلسِ عزا میں ؎

قسمتِ نوعِ بشر تبدیل ہوتی ہے یہاں
اک مقدس فرض کی تکمیل ہوتی ہے یہاں

معصوم افراد کے واقعات سے سامعین اپنی روحانیت کو فروغ دیتے ہیں اور ان کے اسوہ حسنہ اور اخلاقِ کریمانہ سے اپنی سیرت تشکیل دیتے ہیں۔ اپنے نفس کو جواہرِ اخلاق سے آراستہ اور اخلاقِ رذیلہ سے پاک کرتے ہیں۔ تزکیہ نفس کی ریاضت اور تحسین عادات کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

- فطری بات ہے کہ اس قسم کے واقعات سن سن کر انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ظالمین و مظلومین کے بار بار واقعات سننے اور ظالم کے ظلم کی کی برائیاں اور ظلم کے عذاب اخروی اور ان کے انجام سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد فطرتاً انسان کو ظلم اور ظالم سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اور عملی طور پر ظلم سے کنارہ کش رہتا ہے اور کنارہ کش ہو جاتا ہے۔
- ان مجالس میں شمولیت سے انسان میں ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اعلائے کلمۃ الحق کی جرأت اور سچائی و حق گوئی کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ دروغ بیانی، باطل پرستی اور حق چھپانے کی مذموم عادات سے نفرت پیدا ہوتی

ہے۔

• اہل بیت علیہم السلام کا ذکر زندہ رہتا ہے۔ ان کے مراتب و درجات ان کے اخلاق و عادات ان کے معجزات و کرامات کی معرفت ہوتی ہے ان کی امامت و خلافت کے دلائل ان کی حقانیت کے ثبوت اور ان کے مخالفین و مقابلین کے دعووں کا بطلان معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح احقاق حق اور ابطال باطل کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ ایمان میں پختگی آتی اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے فوائد ہیں ہم نے مختصر بقدر ضرورت تحریر کئے ہیں۔

ہمارے ملک میں مجالس کی ابتدا

ہمارے ملک میں شیعوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ علم کم تھا۔ علماء و واعظین نہایت کمیاب تھے۔ مجالس کی ابتدا ذاکرین حضرات سے ہوئی وہ چند لوگوں میں اپنے مرثیوں، دوہڑوں، نوحوں کے ذریعہ امام مظلوم اور باقی شہداء کربلا و اسیران کوفہ و شام کے درد بھرے واقعات اور ان کی مظلومی کی داستان سناتے۔ چونکہ دردناک آواز اور سُریلے کلام میں کشش اور مظلوم کے فسانے میں جاذبیت ہوتی ہے اس واسطے لوگ شوق سے مظلوموں کا قصہ سنتے اور امام پاک اور انکی مظلومیت سے متاثر ہو کر آنسو بھی بہاتے اور مزید برآں دردناک لہجے اور سُر کے اثر سے گریہ و بکا میں اضافہ ہوتا۔ ایک سراسر اور انتہائی مظلوم جس پر مظالم کی انتہا ہو چکی ہو اگر با اثر لہجے اور موثر انداز میں اس کا بیان کیا جائے تو سامعین کے دل و دماغ پر کیوں نہ اثر ہو۔

ابتدا میں یہ مجالس مخصوص مقامات اور امام بارگاہوں میں منعقد نہ ہوتیں۔ جو جگہ مناسب ملی وہیں یہ داستان ذکر کر دی۔ بلا تخصیص مذہب سنی شیعہ دونوں اس تقریب غم میں شریک ہوتے مگر زیادہ تعداد ان پڑھوں کی ہوتی کیونکہ اس زمانہ میں پڑھے لکھے کمیاب تھے کہیں کہیں مذہبی علوم سے شناسا افراد نظر آتے۔

چونکہ شعر اور خوش الحانی سے وابستگی فطرت انسانی ہے اور قصہ گوئی اور حکایات و واقعات سننے کی خواہش ہر نفس میں ہوتی ہے اس وجہ سے یہ مجالس شہدائے کربلا کامیاب ہوتی اور بڑھتی گئیں۔ ابتداء میں عام سنی لوگ انہیں صرف تفریح طبع اور مشاغل فرصت کے طور پر سنتے اور دستور کے مطابق پڑھنے والوں کو روپے پیسے بھی دیتے۔

جس مظلوم کی داستانِ غم ان مجالس میں سنائی جاتی اور جن قیدیوں کے مصیبت بھرے قصے ان میں دہرائے جاتے وہ خانوادۂ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ ان کے خاص افراد یعنی نواسے اور نواسیاں تھیں۔ بالکل ہی قریبی اجزا تھے۔ ذریت رسول اور اولادِ علی و بتول ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو عقیدت بھی تھی اس وجہ سے مسلمان سنی و شیعہ کسی قدر معرفت حاصل کرنے کے بعد عقیدت اور ثواب سمجھ کر بھی شامل ہوتے پڑھنے والوں کو ہدیہ اور نیاز بھی ملتی جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی اور سننے والوں کو اُن کی طبعی خواہش کے مطابق لذت و سواد اور مذہبی عقیدت کی بنا پر ثواب بھی ملتا۔ چونکہ یہ مجالس صرف سانحات کربلا اور واقعات کوفہ و شام تک محدود تھیں یا مختصر فضائل سادہ روایات و معجزات پر مشتمل ہوتیں اس واسطے اہلِ سنت حضرات باقاعدگی اور دلچسپی سے ان میں حصہ لیتے۔ سننے والوں اور نیاز دینے والوں میں مذہبی تفریق نہ تھی۔

ذاکرین حضرات علمی سرمایہ سے تہی دامن تھے۔ کتب تفسیر، احادیث تاریخ و مقاتل پر عبور نہ تھا۔ حتیٰ کہ اُردو تعلیم سے بھی اکثر بہرہ ور نہ تھے۔ اس واسطے جو کچھ وہ بیان کرتے وہ مستند بھی اور غیر مستند بھی ہوتا۔ ان کا بیان معتبر و غیر معتبر دونوں حصوں میں شامل تھا۔ تاہم وہ خلوص اور محبت اہلِ بیت علیہم السلام سے ضرور بہرہ ور تھے۔ اور تبلیغ حسینیت اور واقعہ کربلا کی نشر و اشاعت میں اُن کا خاصہ حصہ ہے اور ان کی ابتدائی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ

ان کو اس کا اجر عطا فرمائے گا۔

لیکن اس کا دوسرا پہلو کہ غلط روایات اور غلط عقائد بھی نشر ہو گئے۔ وہ ان کی کم علمی کی وجہ سے بعض قدامت پسند حضرات انہی روایات اور عقائد کو اپنے دماغوں میں پختہ کئے ہوئے ہیں۔ آج اگر وہ مرحومین و مغفورین ذاکر حضرات زندہ ہوتے اور ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کی خامیوں اور غلطیوں سے اُن کو آگاہ کیا جاتا تو وہ ہرگز بُرا نہ مناتے اور اپنی غلطیوں کا ازالہ اور اپنی خامیوں کی اصلاح شکریہ کے ساتھ کرتے۔ کیونکہ وہ فنی کم اور مذہبی زیادہ تھے۔ اور اُن کا مقصد ان مجالس سے صرف کسبِ معاش اور تحصیلِ زر نہ تھا۔ خدمت اہلِ بیت اور واقعہ کربلا کی اشاعت اور گروہِ ظالمین و اشقیاءِ کربلا کے مظالم کی نقاب کشائی بھی تھی۔ رونا رُلانا، عزاداری اور حسینیت کے پرچار کا مقدس نصب العین بھی تھا۔

سامعین کا قلبی میلان ذوقِ سماعت جذبۂ مودّت اور ذاکرین حضرات کا خلوص و محبت اور قوم کے دلوں میں ان کی قدر و عزت اور کسی قدر حصولِ مال و دولت بھی مجالسِ عزا کی کامیابی و ترقی کے اسباب بنے۔ شہیدوں کا ناحق خون بھی رنگ لایا۔ اور تائید خداوندی بھی شامل رہی۔ ہر شے ابتدا میں تھوڑی اور سادہ ہوتی ہے۔ رفتارِ زمانہ اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اس میں کثرت اور تنوعات و تکلفات پیدا ہوتے ہیں۔

قوم نے ذاکرین کو دل سے قبول کیا۔ ان کی قدر کی اور مالی امداد بھی کھلے دل کے ساتھ کی اور یہ سب کچھ قوم نے محبت و عقیدت اہلِ بیت علیہم السلام کے تحت کیا۔ جس کے نتیجہ میں ذاکرین کی پیداوار بڑھ گئی۔ اور ذاکرین نے بھی وہ رنگ اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے سامعین کی کثرت ہو گئی۔ جونہی قلت کثرت میں بدلنے لگی، خلوص گھٹنے لگا، سادگی رخصت ہونے لگی، تکلفات آنے لگ گئے۔ نام و نمود اور نمائش و آرائش نے بانیانِ کے دل قابو کر لئے۔ لذت سماعت

اور شوق خوش الحانی اور الفاظ کی سحر بیانی نے سامعین کو کھینچ لیا۔ مال و دولت کی ریل پیل اور معاوضہ کی بھاری رقوم نے ذاکرین سے خلوص چھین لیا۔

قدیم ذاکرین کی سادگی

قدیم ذاکرین نے اپنی وسعت کے مطابق مجالس عزا کو قائم کیا۔ اور عزاداری کو فروغ دیا۔ مگر علم کی کمی کی وجہ سے غلط روایات رواج پا گئیں۔ اور غلط عقائد ذہنوں میں پختہ ہو گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے واقعہ کربلا کو ایک ظالم و مظلوم کی داستان تک محدود رکھا۔ اور سامعین نے بھی دو فریقوں کی لڑائی یعنی ظالم و مظلوم کی جنگ (یزید و حسین) کی زیادتی اور مظالم آلِ محمد کی مظلومی و بیکسی تک سُنا لیکن علمی معلومات کی کمی اور ذہن کی محدود قابلیت کی بنا پر اس واقعہ کے اثرات و نتائج سے سامعین کو آگاہ نہ کر سکے اور مقصد شہادت کی وضاحت نہ کر سکے پڑھنے اور سننے والوں نے مظالم کی داستان اور واقعات مصائب بیان کرنے اور سننے پر اکتفا کی۔ ان کے اذہان کی سوچ آگے نہ بڑھ سکی اور یہ نہ بیان کر سکے کہ واقعہ کربلا کے اسباب کیا تھے؟ یہ دو شخصیتوں یعنی یزید و حسین کی لڑائی نہ تھی بلکہ حق و باطل کی جنگ تھی۔ اس جنگ کا پس منظر کیا تھا؟ اور امام حسین علیہ السلام کی قربانی کا مقصد کیا تھا؟ فرزند رسول اور اُن کے ساتھیوں نے اپنے سر کیوں قربان کئے اور اسیرانِ کوفہ و شام نے قید کیوں قبول کی؟ بیعت کا مفہوم کیا ہے؟ یزید نے بیعت کا مطالبہ کیوں کیا اور فرزند رسول نے اس کا مطالبہ کس بناء پر ٹھکرا دیا۔

علمائے کرام کی آمد

مجالس کا سلسلہ جاری تھا کہ پاکستانی علاقوں میں علمی شعاعیں نمودار ہو گئیں۔ گو ان کی روشنی محدود اور مدھم تھی۔ تاہم مجالس میں فلسفہ، علمی نکات، تفسیر

آیات و تشریح احادیث اور استنباطی فضائل کو دخل ہو گیا۔ اُدھر سے قصیدوں میں راگ رنگ مراثی میں غنا داخل ہو گیا اور پڑھے لکھے علمار کرام اور مستند ذاکرین بھی سٹیج و منبر پر آ گئے۔ بعض پرانی غلط روایات و پرانے غلط عقائد کی اصلاح بھی ہونے لگی اور بعض جدید غلط روایات اور جدید غلط عقائد شامل ہونے لگے۔

مذہبی مجالس میں فن کو بھی جگہ مل گئی۔ نثر اور نظم دونوں میں فن کی آمیزش ہو گئی۔ علمی نکات اور روایات کے ساتھ فلسفہ اور لفاظی جملوں کی خصوصی ترکیب چٹکلے، لطائف، قافیہ و سجع سے مزین عبارات اور سر و دست کی مخصوص حرکات مجلس کی زینت نظم میں قصائد کا خاص رنگ سُر تال خوش الحانی دو ہڑوں کی جدید طرزیں مجالس کی خاص رونق کا سبب بن گئیں۔

مذہب بھی ترقی کرتا گیا۔ سامعین بھی بڑھتے گئے۔ ذاکرین و ذاکرین کی کثرت ہو گئی۔ معاوضہ بھی معقول ملنے لگا۔ اس طرح مجالس ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچ گئیں جو موجودہ حالت آپ کو نظر آ رہی ہے۔

موجودہ حالت

ہماری مجالس اس وقت خلوص سے خالی ہو کر کاروباری اور تجارتی منڈی کی حیثیت اور حصولِ زر جلبِ منفعت حرص دولت کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ جو کچھ آج سٹیج پر بیان ہو رہا ہے۔ خلافِ حقیقت خلاف واقعہ خود ساختہ روایات اور من گھڑت فضائل و مصائب ہیں آج کل سٹیج سے غیر ذمہ دارانہ بیانات نشر ہو رہے ہیں قابلِ اعتبار نہیں نہ ان پر یقین رکھا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں خرافات یاوہ گوئیاں پھبتیاں لطیفے چٹکلے مجالس کے مقاصد کو پامال اور ان کے تقدس کو ختم کر رہے ہیں۔

سننے والے ذہنی عیاشی اور تفریح طبع کے لئے سنتے ہیں اور حقائق اور علمی باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ جن مجالس میں ان کی لذت سماعت کا

سامان ہو صد شوق سے کثیر تعداد میں شامل ہوتے ہیں۔ اور جن میں حقائق سچی روایات تبلیغ و ہدایات کی باتیں ہوں بے دلی بے رغبتی سے اور نہایت قلیل تعداد میں بانیانِ مجالس کے ذہن میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایسے آدمیوں کو مجالس کے واسطے دعوت دیں۔ جن کا نام سن کر خلق کا طوفان امڈ آئے۔ جن کا بیان عام مومنین کی طبیعت کے موافق ہو۔

دوسرا ایسے بیان کرنے والے مہنگے اور پسندیدہ عوام ہوں کہ لوگ ہماری تعریف میں رطب اللسان رہیں۔ مجلس کے بعد لوگ ہماری تعریف کریں۔ نام و نمائش کچھی طرح ہو۔ چونکہ ان مجالس میں خرابیاں پیدا کرنے والے اور قابل اصلاح تین قسم کے گروہ ہیں۔ ہم بصد معذرت ان تینوں حضرات کی الگ الگ خرابیاں و خامیاں بیان کرکے اصلاحی تدابیر عرض کریں گے۔ آگے ان کی مرضی دشنام طرازی سے کام لیں یا بندہ نوازی سے مانو نہ مانو جان جہاں اختیار ہے۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں۔ یہ تین گروہ ہیں۔ ذاکرین و واعظین، مجالس کے منتظمین و بانیان و حضرات سامعین ھداھم اللہ اجمعین۔

(۱) منتظمین و بانیین :-

(نوٹ) ہم جن افراد اور جس گروہ کی طرف خرابیاں اور خامیاں منسوب کریں گے ان سے مراد سارے افراد یا تمام گروہ نہ مراد لئے جائیں۔ بلکہ اس گروہ یا افراد کی اکثریت سمجھی جائے کیونکہ تمام کے تمام اور سارے کے سارے افراد خراب نہیں ان میں ان کلیات سے مستثنیٰ کچھ افراد ابھی موجود ہیں جن میں خدا ترس رحمدل دین کی پابندی حق جوئی حق گوئی حق پسندی اصول پرکار بندی حرص وہوا سے اجتناب اور حلال طریقوں سے معاش کا اکتساب خوشنودئ الٰہی اور خلق سے بے پرواہی اور رضائے ائمہ معصومین علیہم السلام ان کا شعار ہے اور رہا ہے۔ ہر گروہ میں ایسے مقدس نیک طینت صالح اور مخلص و سچے محب با اصول بندگان خدا موجود ہیں۔ گو قلیل ہیں اس واسطے سارے ان کلیات

کو کثرت پر محمول کیا جائے۔ تمام پر اطلاق نہ سمجھا جائے۔ نیز وہ افراد جو ان کلیات کی زد میں آتے ہوں اور جو خرابیاں مذکور ہوں گی ان کی طرف نسبت کھا جائیں اور ان پر صحیح بیٹھیں تو ہم پر ناراض نہ ہوں۔ ہمارا مقصد آپ کی غیبت اور نقصان رسانی نہیں۔ بلکہ آپ کی اصلاح، اصلاح دنیا و آخرت ہے۔ اگر آپ اپنے میں واقعاً یہ خامیاں پاتے ہوں تو بجائے ہم پر ناراض ہونے کے ہماری معروضات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور فرمادیں۔ ذاتی مفاد اور کسی خاص فرد کی منفعت سامنے نہ رکھیں۔ بلکہ پوری قوم کا مفاد اور ساری قوم کی اصلاح و ارشاد پیش نظر رکھ کر غور کریں اور وہ خامیاں دور کرنے کی کوشش فرمادیں۔

ہماری نیت نیک ہے۔ مقصد شریف ہے غرض بے لوث ہے۔ مذہبی خلوص اور قومی ہمدردی کی وجہ سے اسی وادیٔ پُرخار میں گامزن ہوئے اور اصلاح کی دشوار گزار وادی میں قدم رکھا ہے۔ اگر ہمیں ہماری خامیوں سے مطلع کیا جائے تو ہم اس کی اصلاح بصد شکریہ کریں گے۔ لیکن جوابی حملہ اور الزامی جواب سے مسائل حل نہیں ہوتے نہ فساد، صلاح میں اور نہ ضلالت رشد میں تبدیل ہوتی ہے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ۔

منتظمین اجلاس و بانیان مجالس : رضائے ربانی اور مرضیٔ معصومین علیہم السلام کی روشنی میں مجالس و جلسوں کا مقصد متعین کریں پھر دیکھیں کہ اجلاس و مجالس کے قیام کی غرض کہاں تک پوری ہو رہی ہے۔ کیا اس رنگ اور اس انداز میں مجالس منعقد ہو رہی ہیں جو خدا و رسول اور ائمہ اطہار کو پسند ہے اگر رنگ خدا میں رنگی ہوئی اور مرضات معصومین کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہیں اور اپنی غرض کو پورا کر رہی ہیں تو پھر یہ مجالس حسینیہ ہیں۔

یاد رکھیں کہ مجالس کی غرض و غایت تفسیر و احادیث اور تاریخ فضائل و

مصائب اہل بیت صحیح و مستند صورت میں بیان کرنا۔ تبلیغ و ارشاد سے اخلاق مومنین کو سنوارنا اور سیرت اہل بیت کی اتباع کرانا۔ مذہب اہل بیت پر اغیار کے ہونے والے حملوں کا موثر اور مہذب طریقہ پر جواب دینا۔ اپنے مذہب کی صحیح تشریح کرنا اور بیرونی حملوں کا دائرہ تہذیب میں رہتے ہوئے دفاع کرنا۔ دل آزاری اور طعن و تشنیع سے اجتناب۔ یہ مجالس عزا کے بنیادی مقاصد ہیں۔ ان کے پیشِ نظر مجالس برپا کریں۔ اگر آپ کی مجالس ان مقاصد سے دُور ہیں ان کا نام مجالسِ حسینیہ نہ رکھا جائے۔ بلکہ نام و نمود کی اور عروستانی و نمائش کی غرض ہو تو یہ آپ کے تفریحی مشاغل اور باہمی دلچسپی کے معاملات ہیں۔ یار دوستوں کی ملاقات کے لئے ایک تقریب اور فالتو پیسے کا ایک مصرف ہے۔ مزید برآں غلط تشریحات کی صورت اور خلافِ واقعہ بیانات کی شکل میں مذہبی تعلیمات کو مسخ، دینی اقدار کو پامال کرنا اور اخلاقی نظام کو بگاڑنا ہے۔

خرابی کی صورتیں

بانی مجلس انعقاد مجالس کے ارادہ کے وقت یہ سوچتا ہے کہ کون کون سے ذاکرین و واعظین کو دعوت دوں۔ اس کے پیشِ نظر یہ ہوتا ہے۔ کہ میری مجلسیں کامیاب ہوں اور ان کی کامیابی پر لوگ میرے قصیدے پڑھیں میری ثنا و ستائش میں مجھے کامیاب مجالس کی زبانی سند دیں۔

کامیابی کے دو معیار ہیں: ۱۔ کثرت سامعین ۲۔ فضائل میں نعرہ ہائے داد و تحسین اور مصائب میں رونے کی اُونچی صدا اور کہرام گریہ و بکا۔

ہم اغراض و مقاصد مجالس بیان کر چکے ہیں۔ اگر ان اغراض کے سایہ اور ان کی پابندی میں یہ معیار کامیابی حاصل ہے تو بے شک کامیاب ہیں اور یہ مثبت طریق انعقاد ہے۔ اگر ان سے بغاوت اور ان کی بے رحمی کے ساتھ پامالی ہے تو لوگوں کے نزدیک کامیاب ہوں گی مگر خدا اور پنجتن پاک

علیہم السلام کی نگاہ میں مقبول و کامیاب نہیں۔

- بانیانِ مجالس کا ذاکرین و واعظین کو مدعو کرنے کا طریق فکر غلط ہے۔
- مجالس کی کامیابی کا یہ معیار نہیں کہ عوام نے بیحد پسند کیا۔ فضائل میں نعروں کی گونج زیادہ تھی اور مصائب میں نالہ و شیون کا کہرام بلند تھا۔ یہ دو تو باتیں آج کل عموماً غلط فضائل اور غلط مصائب پر ہوتی ہیں۔

کامیابی کا معیار یہ ہے کہ کتنے غیروں نے مذہب اہلِ بیت نظریاتی طور پر قبول کیا اور کتنے اپنوں نے عملی محب بننے کا عہد کیا۔ کتنوں نے کسی ایک عادی برائی سے اجتناب اور کسی ایک نیکی کے اکتساب کا عزم ظاہر کیا ہے۔ پھر واعظ اور ذاکر پابند روایات صحیحہ اور افکار صالحہ رہتے ہوئے فضائل و مصائب عوامی نقطۂ نظر سے بھی کامیاب پڑھے۔

- بعض اوقات ذاتی دوستی اور ذاتی مراسم کی بنا پر بھی ذاکرین و واعظین کو دعوت دی جاتی ہے۔ اور یہ کوئی مذموم بات اور شرعاً ممنوع امر نہیں۔ لیکن باہر سے مدعو ہو کر آنے والے واعظین کے ساتھ مقامی پیش نماز اور مقامی و علاقائی عالم کا بھی حق ہوتا ہے۔ اور اسے ضائع کرنے سے روزِ محشر باز پرس بھی ہوگی۔ جو بانیانِ مجالس ذاتی دشمنی، حسد یا بے اعتنائی سے مقامی و علاقائی عالم یا پیشنماز کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور لوگوں کی عدم دلچسپی کا بہانہ تراشتے ہیں وہ مقامی و علاقائی عالم کی حق تلفی نا قدر شناسی کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور وہ عالم روزِ قیامت اپنے سلب حقوق کا دعویٰ کرے گا۔ اسی طرح مقامی ذاکرین کا بھی حق ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ شرعاً ممنوع نہ ہوں۔ ایسا ہی وہ بیرونی علماء کرام جو مقامی و علاقائی عالم کی حق تلفی دیکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور مقامی لوگوں کو ان کی اس مجرمانہ غفلت و کوتاہی کی طرف متوجہ نہیں کرتے وہ بھی عند اللہ و عند الرسول و المعصومین علیہم السلام ایک قسم کے مجرم ہیں۔

یا بعض اوقات مقامی عالم و ذاتی پیش نماز کے حقوق غصب کرتے ہیں۔

کہ کوئی امر واجب یا مستحب کوئی امر شرعی یا رسمی یا رواجی مقامی عالم کا حق ہے اور وہ اس کا حق بعض جاہل و بے وقوف اور خوشامدی و پُر غرور غاصب حقوق مومنین کے کہنے پر غصب کر لیتے ہیں اور اس کا حق ادا نہیں کیا جاتا۔ وہ روز قیامت غاصب حقوق لوگوں میں سے اٹھیں گے۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ اور اس کی طرف نہ علماکرام کی توجہ ہے اور نہ مقامی رؤسا و امراء اور جہلاء و بے دین عوام کی۔

ہر امر کو ادا کرنے سے پہلے بیرونی علماکرام کو دیکھ لینا چاہیئے کہ یہ مقامی عالم کا حق ہے اور اگر شرعاً حق ہے تو اس کی ادائیگی اور حق کو حق کے مالک تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے نہ کہ الٹا خود اس کے حق کو غصب کرنا چاہیئے۔ علماء کو چاہیئے کہ وہ جاہلوں کے کہنے میں نہ آئیں۔ جاہلوں کو اپنے کہنے میں لائیں اگر وہ کہنے میں نہیں آتے تو ان کو چھوڑ دیں حق کو نہ چھوڑیں۔ اسی طرح مقامی مومنین کو خواہ وہ امیر کبیر مغرور و متکبر رئیس ہوں یا غریب اور سادہ لوح عوام اس امر کی طرف خاص توجہ دینی چاہیئے اور باوجود کراہت نفس اور طبیعت کی ناواقفیت کے اپنے آپ پر جبر کر کے مرضی خالق کو مرضی مخلوق پر غالب کر کے اس کی حق رسی کرنا چاہیئے۔ سلب حقوق ناشناسی حقوق سے سخت پرہیز کرنا چاہیئے۔ ورنہ غاصبین حقوق کو لعنت کرتے وقت خود اسی زمرے میں شامل ہو جائیں گے۔ اور جس چیز پر شیعہ قوم تقریباً چودہ سو سال سے روتی چلی آتی ہے اور رو رہی ہے وہی چیز آپ خود اپنے میں پیدا کر رہے ہیں۔

کسی عالم کے حق کا معیار اس کا علم اور عمل ہے لوگوں کی وابستگی یا نفرت معیار نہیں۔ کسی کے نہ ماننے سے حقدار کا حق ختم نہیں ہوتا اور کسی کے مان لینے سے ناحقدار حقدار نہیں بن سکتا۔ یہ ایک ایسا اہم ضروری اور قابل توجہ امر ہے۔ جسے بے اعتنائی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ادائیگی حقوق سلب و غصب حقوق اور ناشناسی حقوق کا مسئلہ ہے جو فوری توجہ کا مستحق ہے۔

مومنین کرام عموماً اور بانیان کرام و انجمنیں خصوصاً اس پر ٹھنڈے دل د

دماغ سے غور کریں۔ تنہائی کے وقت فرصت کے لمحات میں خصوصاً رات کو سوتے وقت جب دن بھر کے معاملات کا خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے۔ اسے سوچیں اور حق و باطل کے معیار پر تولیں۔

امرأ و رؤسا کے لئے

مجالس کا معاوضہ اور ہدیہ پیش کرنے میں بخل سے کام نہ لینا چاہیے۔ فراخدلی سے علما کرام واعظین و ذاکرین ذوالاحترام کی خدمت کرنا چاہیئے لیکن دو باتوں پر غور ضروری ہے۔ آپ کے روپیہ پیسہ اور مال و دولت کا حساب روزِ محشر ضرور ہوگا۔ جیسا کہ جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: فِي حَلَالِهَا حِسَابٌ وَ فِي حَرَامِهَا عِقَابٌ۔ حلال میں یہ حساب ضرور لیا جائے گا کہ اس کو کہاں اور کس طرح خرچ کیا گیا؟ بے جا تو خرچ نہیں ہوا؟ کسی گناہ کی اعانت تو نہیں ہوئی؟ جو غربا، فقراء مساکین آپ کے شہر میں آپ کے گرد و نواح میں آپ کی مالی امداد کے حد درجہ محتاج ہیں ان پر نظر شفقت رکھیں اور کوئی مریض دوا کا محتاج ہے؟ کسی کے پاس تن چھپانے کو کپڑا نہیں کوئی نانِ شبینہ کا محتاج ہے۔ کسی کے گھر میں فاقہ ہے۔ بچے بھوک سے گریاں والدین دل گرفتہ افلاس کے ستائے ہوئے۔ دکھ درد کے مارے جگر پر ہاتھ رکھ کر بچوں کی بدحالی کا المناک نظارہ دیکھ کر سینہ پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور آپ دماغی عیاشی اور تفریحی شغل پر ہزاروں روپے بے دریغ لٹا رہے ہیں۔ تو اس صورت میں روزِ محشر اُن کا ہاتھ اور آپ کا گریبان ہوگا۔ اور محاسب روزِ جزا سے آپ بچ نہ سکیں گے مجالس کی اہمیت اور افادیت سے کسی مومن کو انکار نہیں مگر واجبات زکوٰۃ و فطرہ اور خمس کو تقدم حاصل ہے پہلے ان کی ادائیگی کا احترام کریں۔

ماشاء اللہ آپ دولت مند اور صاحبِ ثروت ہیں۔ اللہ تعالیٰ بتصدق معصومین آپ کو ہمیشہ با اقبال و سعادت رکھے مگر آپ واعظین و ذاکرین کو

ہدیہ دیتے وقت یہ سمجھا دیں کہ ہر مقام پر اس ہدیہ کو مجلس کے معاوضہ کا معیار نہ قرار دیں۔ آخر آپ نے متوسط سفید پوش اور مسکینوں کے ہاں بھی مجالس پڑھنی ہیں آپ اس معیار کا ہدیہ ان سے وصول نہ فرمادیں۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں نے دیدیا ہے۔ اور جو کچھ اُن سے بن پڑے اسی طبیعت کے ساتھ اور اسی کشادہ روی کے ساتھ ان سے بھی وصول فرمالیں۔

آج رؤسا قوم کی بھاری فیسوں نے واعظین و ذاکرین کا مزاج بگاڑ دیا ہے۔ جس قدر کسی سٹیٹ اور بنگلوں سے وصول کرتے ہیں۔ مسکین کی جھونپڑی سے اسی کی تمنا کرتے ہیں۔ اور معاوضہ میں کمی کی وجہ سے غریبوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ نیز واضح رہے کہ دین اسلام اور مذہب شیعہ میں عزاداری مجالس اور جلوسوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اور بجا حاصل ہے۔ مگر ہمارا مذہب صرف اسی میں محدود و محصور نہیں، اس میں بہت کچھ وسعت ہے۔ مساجد ہیں مدارس ہیں۔ یتیم خانے اور کتب خانے ہیں، ہسپتال ہیں۔ صحافت ہے، پریس ہے۔ یہ سب دولت مندوں اور امیروں کی نظر کرم کے محتاج ہیں۔

علاوہ ازیں رفاہی امور: سڑکیں پلیں، شفا خانے اور دیگر ایسے امور جن کا تعلق خدمت خلق سے ہے۔ از قسم عبادت ہیں۔ ان پر بھی توجہ دینا ضروری ہے۔ مخلوق خدا کی خدمت کرنا۔ معاشرہ کی اصلاح کرنا۔ دکھی انسانوں کی خبر گیری کرنا۔ بیواؤں، یتیموں، مسکینوں کی کفالت، حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنا عبادت ہے۔ خوشنودیٔ خدا اور مرضی معصومین علیہم السلام کا بہترین ذریعہ ہے۔

صرف نماز روزہ یا عزاداری ہی عبادت نہیں ہر وہ کام جو خوشنودی خدا کے لئے اور مخلوق کی بھلائی کے لئے کیا جائے عبادت شمار ہوتا ہے۔ مظلوم کی نصرت، مغموم کی حمایت، مکروب کی دلجوئی، غریبوں بیکسوں کی ہمنوائی، حاجت مندوں کی حاجت روائی نیز خدمت خلق کے اور مخلوق کو سکھ پہنچانے کے لئے

جملہ امور عبادت خدا میں شامل ہیں۔

- بعض اوقات بانیانِ مجالس نام و نمود اور نمائش و ستائش کے چکر میں آ کر اس قسم کی مجالس برپا کرتے ہیں کہ دوسروں پر فوقیت حاصل ہو اور ہمارا جلسہ فلاں کے جلسہ سے بڑھ جائے۔ ہم دنیا کو دکھا دیں کہ ہمارے جیسا جلسہ کسی کا کامیاب نہیں ہوا۔ فلاں ہمارے مقابلہ میں کیا ہیں؟ ہم نے ایسا جلسہ کر دیا کہ کسی کو ہمت ہی نہیں کہ ہمارا ریکارڈ توڑ دے۔

- نیز بعض اوقات دوسروں کی مجالس کے مقابلہ میں بیک وقت یا کچھ پہلے اس غرض سے مجالس منعقد کرتے ہیں کہ ان کی مجالس فیل ہو جائیں۔ حیلوں بہانوں سے سامعین کو اپنی طرف کھینچتے اور ان مجالس میں جانے سے روکتے ہیں دوسروں کو ناکام کر کے اپنے آپ کو کامیاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں یوں ضد اور باہمی مقابلہ کا مقصد پورا کیا جاتا ہے:

- لائسنسدار بعض اوقات الجھ پڑتے ہیں کہ جلوس میں میرا تعزیہ پہلے اور آگے ہو اور تمہارا اس کے پیچھے ہو۔ چڑھاوے اور ہدیوں کا چکر ہوتا ہے مقابلہ بازی ہوتی ہے۔ مقدموں اور افسرانِ حکومت تک نوبت پہنچتی ہے۔ سر بازار مذہب کی توہین اور قوم کی رسوائی ہوتی ہے غیر مذاق اڑاتے ہیں۔

مذکورہ بالا قسم کے جلسے اور اس قسم کی مجلسیں اور اس نوع کے جلوس منفی اثرات پیدا کرتے ہیں۔ غیروں میں اپنی تضحیک کا سامان پیش کرتے ہیں عزاداری کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ نام و نمائش جلب منفعت اور معاشی کمائی کی تصویر سامنے آتی ہے اور ہزاروں روپیہ اپنی قوم کا اپنی بربادی پر خرچ ہوتا ہے ان سے حسینیت کی ترویج نہیں ہوتی بلکہ یزیدیت پروان چڑھتی ہے۔ ارواح معصومین علیہم السلام غمگین اور ابلیس اور یزیدی خوش ہوتے ہیں۔ ایسی صورت جب اور جہاں پیش آئے تو جو "بانی" مقابلہ سے دستبردار ہو جائے۔ صبر و تحمل سے کام لے کر پیچھے ہٹ جائے۔ عزاداری کا صحیح مفہوم

سمجھ کر صحیح مقصد کی خاطر اپنے جذبات پر قابو پاکر حسینیت کی خاطر تواضع وانکساری قبول کرلے۔ ذاتی عزت پر قومی غیرت اور ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دے کر صلح کا علم بلند کرکے اختلاف وعناد کو دفن کرکے اتحاد کو مضبوط کرکے قومی وحدت کو قائم و برقرار رکھے۔ بے شک وہ "مجاہد حسینی" ہے۔ اس کی قربانی قوم کی سرفرازی کا سبب ہے۔ ایسے ہی مجاہدین کو جناب سید الشہدا علیہ السلام کا استغاثہ پہنچتا ہے اور یہ خلوص و وفا کے پیکر نفسانی جذبات پر قابو پاکر روحانی قدروں کو بلند کرتے ہوئے نصرت امام کرتے ہیں۔ اور روز محشر شہدائے کربلا کے ساتھ اٹھنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اور جو اس امر کے خلاف چلتے ہیں۔ وہ روح جناب سید الشہدا کو ناخوش اور یزید، ابن زیاد کی روحوں کو خوش کرتے اور شیطان کی نصرت کرتے ہیں۔ اس طرح وہ قوم و مذہب کی توہین اور عزاداری کو تباہ کرنے کے جرم عظیم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

- آجکل مجالس وجلسوں کی رَوح عزاداری، تبلیغ اسلام اور پرچار حسینیت کے عنوان سے نہیں قائم کیا جا رہا بلکہ ذاکرین کے سٹیج . واعظین کے مقابلہ اور اور حسینی نمائش کا میدان قرار دیا گیا ہے۔

دولت مند کی دولت، زمیندار کی جنس گراں کا سرمایہ اور رئیس کی فالتو پونجی قومی تعمیر مذہبی ترقی کے بجا مصرف پر نہیں بلکہ تفریحی شغل اور نمائش کے بے جا مصرف پر خرچ ہو رہی ہے۔

جلسہ ہے کہ دن رات جاری ہے. کوئی گروہ اٹھتا ہے کوئی بیٹھتا ہے نماز کا وقت بلکہ کئی نمازوں کا وقت جلسہ گاہ میں گم ہوجاتے ہیں۔ فلمی ہنگاموں اور الفاظ کی سحر بیانیوں میں اس قدر محویت ہوتی ہے کہ جناب سید الشہدا علیہم السلام کی مرغوب و محبوب عبادت نماز حقارت کی نذر ہو کر یاد مومن سے ہٹ جاتی ہے رشتہ مجالس سے کٹ جاتی ہے اور دل مسلم سے مٹ جاتی ہے اور یوں مقصدِ شہادت حسین حسینی جلسوں میں پائمال کردیا جاتا ہے۔ کیا ہی اچھی

بات ہوگی کہ مجالس و جلسے اپنے صحیح مقاصد و صحیح اغراض کے تحت منعقد کئے جائیں اور اگر عین مجالس میں نماز کا وقت آجائے تو پڑھتا ہوا ذاکر خاموش ہو جائے روتے ہوئے مومن رک جائیں بہتے ہوئے آنسو تھم جائیں اور ذکر حسین سے مقصد حسین کی طرف رجوع کر لیا جائے۔ اذان کی آواز گونجے حسینیوں اور ماتمداروں کی صفیں سجادہ پیش نماز کے عقب میں ایستادہ ہوں پڑھنے اور سننے والے تمام قبلہ رو ہو کر شاہِ حجاز اور شہنشاہِ شہادت کے مقصد کو اپنی عمل محبت اور پُر خلوص و پُر شکوہ و پُر شان عبادت سے ثابت کریں۔

• یہ امر رواج پا چکا ہے اور معمول بن گیا ہے کہ جو ذاکر اور واعظ آسمانِ شہرت پر چمکا اور جس کا ستارۂ اقبال بلند ہو۔ بانیان دعوت دینے کے لئے اور سامعین شوقِ سماعت کے لئے بے تحاشا دوڑتے ہیں۔ ایک تو اس واعظ و ذاکر کو بے چینی اور پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ کہاں کہاں جاؤں، کہاں جاؤں کہاں نہ جاؤں، کس کی مانوں اور کس کی نہ مانوں۔ بعض دفعہ فیس کا وزن اور بعض دفعہ حیا و لحاظ ذاتی تعلقات اسے مجبور کرتے ہیں۔ وہ انکار نہیں کر سکتا۔

علاوہ ازیں بانی مجلس خود بھی پریشان رہتا ہے نظریں راہ تکتی اور کان مختلف صدائیں سنتے ہیں اور مشہور واعظ و ذاکر کے انتظار میں مجلس میں افراتفری کھلبلی رہتی ہے۔ اضطراب کی فضا چھائی رہتی دوسرے پڑھنے والے ذاکرین و واعظین بے توجہی اور بے التفاتیٔ سامعین کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مشہور مدعو صاحب آئے، کار سے اُترے سٹیج پر گئے۔ ایک معین وقت میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے رخصت ہو گئے۔ جہاں ایک اور میدانِ فن میں جمع مخلوق ان کے انتظار میں بے چین تھی۔ ؎

آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم افسانہ ہو گیا

اس کے مضر اثرات! بھیڑ چال اور دیکھا دیکھی کرنے والے شہرت پر جاتے

ہیں لیکن سنجیدہ اور دانا لوگ حقیقت پر کھتے ہیں۔ ہر حال میں واعظ اور ذاکر کا شرعی عمل علمی اور فنی معیار ملحوظ رہے اور اغراض مجالس پر نظر رہے۔ اور اس معیار پر پورے اترنے والے سب واعظین و ذاکرین کو حصہ دینا چاہیے مقاصد مجالس اور اغراض محافل و جلسہ پورے کرنے والا، مشہور وغیر مشہور سب کو موقع دینا چاہیئے۔ ان کا بھی حق ہے۔ ان کی حق تلفی بروز قیامت باز پرس کا سبب بن سکتی ہے۔

مساواتِ محمدی کو عمل میں لاکر کسی کی حوصلہ شکنی اور دل آزاری نہ کریں۔ یہ نہایت مذموم عمل اور قبیح بات ہے۔ کہ ایک آدمی کے پیچھے تو سارا معاشرہ لپکے ایک دن اسے پانچ حصوں میں تقسیم کرنا پڑے اور اسی کے بھائی بند اور اسی معیار والے کنج تنہائی اور گوشہ گمنامی میں پڑے ہوں انہیں پوچھنے والا کوئی نہ ہو۔

چھوٹے بڑے پر موقوف نہیں دیر پا سرکار حسینی میں ہے حصہ سب کا

اسی طرح جہاں دولت کا ایک جگہ ارتکاز ہو گا اور مجالس کا خزانہ ایک شخصیت میں جمع ہو جائے گا۔ دونوں کی ناجائز ذخیرہ اندوزی ہو گی۔ مساوات محمدی اور مواخات اسلامی نہ رہے گی۔ ایک کی حوصلہ افزائی سے کئی ایک کی حوصلہ شکنی ہو گی۔ لہٰذا بانیانِ مجالس اس قاعدہ پر عمل کریں کہ معروف کو معروف نہ کریں۔ غیر معروف کو معروف کریں۔ خصوصاً ایام محرم میں سنجیدگی متانت اور دانشمندی سے کام لیں۔ بھیڑ کی چال نہ چلیں شیر کی چال چلیں۔ واعظین و ذاکرین بھی حرص و ہوا کے گھوڑے پر سوار نہ ہوں۔ قناعت سے کام لیں۔ چھ سات مقام آلاٹ نہ کرائیں اگر قناعت پر عمل کرتے ہوئے وہ اور متانت پر عمل کرتے ہوئے بانیان و منتظمین ایک واعظ اور ایک ذاکر کے حصے میں دو مقام تقسیم کر دیں اور وہ دو پر اکتفا کریں تو ان کے چھ میں سے باقی چار پر دو تین انہی جیسے ذاکرین و واعظین کا کام چل سکتا ہے۔ اسی طرح مجالس بھی

سکون واطمینان سے منعقد ہوں گی۔ پڑھنے والے بھی اطمینان سے پڑھ سکیں گے ہر ایک کو حصہ بھی مل جائے گا اور سننے والے دل جمعی کے ساتھ مجالس سن سکیں گے۔

عمارات اور شبیہیں

جس طرح معاشرتی طرزِ حیات میں رہنے سہنے کے لئے انسان کو مکان کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور گرمی وسردی کی تکلیف سے بچنے کے لئے چھتے ہوئے کمروں میں پناہ لینا پڑتی ہے۔ اسی طرح مذہبی امور کی ادائیگی اور عبادات کی بجا آوری میں شیعہ قوم کو مجلس خانہ (امام بارگاہ اگر امام باڑہ کے قدیم لفظ کو امام بارگاہ کے جدید اور مقدس لفظوں میں تبدیل کر دیا جائے تو مناسب و بہتر رہے گا) اور مسجد کی ضرورت درپیش رہتی ہے۔ اور ان کی بجا آوری میں مساجد اور مجلس خانے بنائے جاتے ہیں۔ جو ان ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان کی تعمیر کا بنیادی مقصد ایک ایسی عمارت کا وجود ہے جو پختگی اور وسعت کے اعتبار سے کافی ہو اور گرمی وسردی کی تکلیفوں سے بچاؤ کے علاوہ جو بھی مناسب سہولتوں سے آراستہ ہو۔ لیکن بے جا تکلفات اور اسراف کی حد تک نقش ونگار نہ ہوں۔ کیونکہ اللہ پاک اور چہاردہ معصومین علیہم السلام کو سادگی پسند ہے۔ اور وہ اپنی طرف منسوب تعمیرات کو سادہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

اگرچہ اس قسم کی پر تکلف اور عظیم عمارات قومی عظمت، فنِ عمارت اور شانِ ملت کی نشانیاں ہوتی ہیں مگر ان میں مقصود نظر مضبوطی، وسعت اور ضروریات کی کفالت ہوتی ہے۔ اور ان کی عظمت کو چار چاند لگانے والے ان کے ساتھ ملحقہ اوقاف از قسم اراضی و باغات دکانیں و مکانات ہوتے ہیں جو ان کی ضروریات و مصارف کی کفالت کرتے ہیں۔

ان کی تعمیر کا منتہائے مقصد ان کی عظمت شان کی نمائش نہیں بلکہ امور

عبادات کی ادائیگی ہے۔ مثلاً نماز باجماعت درس قرآن تعلیم دینیات کیونکہ پہلے عہدوں میں مساجد ہی مدارس رہی ہیں۔ اور مساجد ہی کے منبروں سے احکام دین اور امور شریعت نشر ہوتے رہے ہیں۔ اس مسجد کی عمارت اور اس کی زیب زینت کا کیا فائدہ جس میں پیش نماز و خطیب نہ ہو۔ جو جماعت سے محروم اور نمازیوں سے خالی ہو۔ ایسی مسجد کی عمارت لاکھوں روپے کی مالیت کی کیوں نہ ہو غیر آباد ہے جس میں تلاوت قرآن اور درس و تدریس کی صدائیں کانوں سے نہ ٹکرائیں اور وہ باوجود عظیم الشان عمارت کے نمازیوں کی کمی اور جماعت کے فقدان کی مرثیہ خوان ہو بے رونق ہے۔ مساجد کی رونق نقش و نگار سے نہیں بیا تلاوت و اذکار سے ہے۔ مسائل دینیہ کی تعلیم سے مساجد کی آبادی ہے۔ خواہ عمارت کچی اور کم قیمت ہو۔ اسی طرح امام بارگاہیں اور مجلس خانے ہیں۔ شیعہ قوم کے نزدیک مساجد کے بعد مجلس خانوں کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بھی قومی و مذہبی عمارات ہیں۔ جن کا منتہائے مقصود مجالس حسینیہ کا انعقاد ہے جن میں جناب سید الشہدا، و دیگر ائمہ علیہم السلام کو ان کی مصیبتوں، دکھوں قربانیوں کا پرسا دیا جاتا ہے۔ ان کے واقعات حیات بیان کئے جاتے ہیں اصول و فروع اسلام کی تشریح انبیائے ماسبق علیہم السلام کے تذکرے تفسیر حدیث و فقہ و تاریخ مواعظ و نصائح بیان کئے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں قومی و مذہبی امور کے متعلق صلاح و مشورہ اصلاح و ترقی کی تدبیریں مذہبی و قومی زندگی کو کامیاب و ترقی پذیر بنانے کے لئے لائحہ عمل تیار کئے جاتے ہیں۔ ان مقدس بارگاہوں میں بھنگی وسعت اور مناسب سہولتوں کا وجود پیش نظر رکھا جائے۔ لیکن بے جا تکلفات اور اسراف و غلط نمائش سے احتراز کیا جائے۔ قومی دولت کو بے جا مصرف پر خرچ نہ کیا جائے اور ایسی چیزوں سے ضرور پرہیز کیا جائے جو خدا و رسول اور ائمہ اطہار کو ناپسند ہوں۔ یہی دستور شبیہوں کے متعلق قائم رکھیں کہ یہ شبیہیں از قسم قلم

تعزیہ اور ذوالجناح مقصود بالذات نہیں یہ صرف ان واقعات کربلا کی نشاندہی کرتی ہیں جن کا تعلق ان سے ہے۔ مثلاً علم حضرت عباس علمدار حسینی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جب کہ جناب عباس کی لاش مبارک زخموں سے چور تھی اور جناب سید الشہداء علیہم السلام ان کی لاش نہ لائے اور علم مبارک خیموں میں لائے اور مستورات بنی ہاشم نے ماتم کیا۔

اسی طرح ذوالجناح حضرت سید الشہداء کے اس واقعہ کو یاد دلاتا ہے جب امام مظلوم تہ خنجر شہید کر دیئے گئے اور اس باوفا راہوار نے امام مظلوم کی شہادت کا پیام خیموں میں پہنچایا اور بے وارث سیدانیاں گھوڑے کے گرد ہالہ بنا کر اس مصیبت عظمیٰ پر گھر اجڑنے پر صحن برباد ہونے عزیزوں کی موت پر اور اپنی بے کسی پر دل کھول کر روئیں۔ اس شبیہ کو دیکھ کر ہمیں وہ حسینی قاصد موت مظلوم کا پیامی یاد آجاتا ہے۔ غم تازہ ہو جاتا ہے۔ گریہ و بکا میں اضافہ ہوتا ہے۔ چونکہ یہ شبیہیں مباح ہیں جائز ہیں۔ ان کی حرمت اور منع پر کوئی دلیل نہیں اور عزاداری میں شامل ہیں۔ ان کے دیکھنے سے واقعات کربلا کا نقشہ ذہنوں میں اتر جاتا ہے۔ اس واسطے ان کے بنانے میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ شعائر حسینی ہیں جو دلی وابستگی اور محبت و خلوص کی نشانیاں ہیں۔ لیکن ان کو صرف اسی مقصد کے اندر محدود و منحصر رکھا جائے کہ یہ واقعات کو تازہ اور غم کو زیادہ کرتی ہیں۔ کسی صورت میں ان کو مرکز قضائے حاجات نہ سمجھا جائے اور نہ ان کی پرستش کی جائے بحمد اللہ شیعہ ان کو معبود نہیں مانتے نہ ان کی پرستش کرتے ہیں اور نہ شبیہوں کو قاضی الحاجات خیال کرتے ہیں۔

بعض غیر مذہب شیعہ لوگ جو اعتراض کرتے ہیں کہ شیعہ ان کی پرستش کرتے اور ان کی قاضی الحاجات مان کر ان کے آگے دعائیں مانگتے ہیں ان لوگوں کا یہ اعتراض بے حقیقت ہے۔ شیعہ ان شبیہوں کو دیکھ کر صرف روتے ہیں۔ البتہ ان کا احترام ضرور کرتے ہیں۔ احترام اور چیز ہے اور عبادت اور چیز۔

شیعہ عبادت تو ان کی اصل کی بھی نہیں کرتے۔ تعزیہ روضہ امام حسینؑ کی نقل ہے۔ خود روضہ اقدس جو کربلا میں واقعہ ہے وہاں بھی احترام و تعظیم کی رسوم ادا کرتے ہیں خود قبر مبارک کو نہ سجدہ کرتے اور نہ عبادت بلکہ خود صاحب قبر مطہر کو بھی معبود نہیں مانتے۔ کوئی شیعہ چہاردہ معصومین علیہم السلام کی عبادت نہیں کرتا نہ ان کو بالاصل وعلیٰ الاستقلال قاضی الحاجات مانتا ہے۔ بلکہ بارگاہِ احدیت حریم کبریا میں ان کو مقبول وسیلہ اور مقدس و اعلیٰ ذریعہ قبولیت و نجات سمجھتا ہے۔

لہذا یہ صرف رسوم عزاداری میں معاون اور گریہ و بکا میں اضافہ کا ذریعہ ہیں۔ واجب و سنت نہیں بلکہ مباح و مستحب ہیں ان میں بھی حد اعتدال سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے۔ حدودِ شریعت کے اندر رہتے ہوئے ان مراسم عزا کو بجا لانا چاہیئے۔ یہاں بھی بے جا خرچ اور اسراف نہ ہو۔

یاد رکھیئے کہ دین اسلام اور شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا التحیۃ والسلام بنیادی امر اور بالذات مقصود ہے۔ مراسم عزا یا شبیہات میں کوئی چیز اگر شریعت محمدیہ کے خلاف ہو تو قطعاً حرام ہو جائے گی۔

اسراف سے بچیں

شبیہوں کو صرف ان کے مقصد تک محدود رکھتے ہوئے اسراف سے پرہیز کیا جائے۔ دیکھا دیکھی نمائش کی خاطر لاکھوں روپے تعزیہ مبارک یا لاکھوں روپے صرف زیورات ذوالجناح پر خرچ نہ کئے جائیں۔ اس سے رُوح عزاداری مجروح ہوتی ہے۔ سوگ اور ماتم نہیں رہتا۔ کاریگری و نمائش پر نظر پڑتی ہے۔ جس زمانے میں تعزیہ سادہ ہوا کرتے تھے انہیں دیکھ کر رونا آتا تھا اور امام مظلوم کی یاد تازہ ہوتی تھی آج تعزیوں کو دیکھیں تو فنی نمونہ سامنے آتا ہے اور کاریگر کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ اس طرح ذوالجناح بھی سادہ ہونا چاہیئے۔ کثرت سے

زیورات کا حامل نہ ہو۔ کیونکہ ان سے مقصود گریہ زاری و امام کی عزاداری ہے۔ مالی نمائش نہیں۔ علاوہ ازیں ایک غریب قوم کے قومی و دینی اور مصارف بھی ہیں جو ان سے اہم اور زیادہ ضروری ہیں۔ خصوصاً جب کہ ایک غریب سیدہ مومن دوا نہ ملنے سے کئی بچوں کو یتیم کر جائے۔ جن کا کوئی سہارا نہ ہو کئی مستورات مومنات اپنے تن چھپانے کے لئے کپڑے کی محتاج ہوں۔ کسی کے گھر میں متواتر فاقے آ رہے ہوں۔ اور ہم ان کی پرواہ کئے بغیر صرف مباح اور مستحب امور پر بے دریغ روپیہ خرچ کر دیں تو روز قیامت ہم جواب دہ ہوں گے اور حقوق العباد کی فراموشی کا بار ہماری گردنوں پر ہوگا۔

بہر حال ایک مومن کی جان و عزت بچانا نہایت اہم فریضہ ہے اور زکوٰۃ کا اولین مصرف مومن کی جان و آبرو کی حفاظت ہے۔

نماز کے بعد زکوٰۃ کی زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں نماز کی اقامت کا حکم آیا ہے وہاں ساتھ ہی زکوٰۃ کی ادائیگی کا بھی تاکیدی حکم آیا ہے اور زکوٰۃ کے بغیر نماز قبول نہیں۔

لیکن یاد رکھیں کہ زکوٰۃ عمارات اور شبیہوں پر خرچ نہ کریں۔ ایک تو اس وجہ سے کہ زکوٰۃ ایک صدقہ ہے۔ اور شبیہوں مساجد امام بارگاہوں پر واجب صدقہ خرچ نہ کریں۔ ان کا مقام اس بات سے بہت اونچا ہے کہ ہاتھوں کی میل اور صدقہ سے یہ مقدس عمارات و شبیہات بنائی جائیں۔

دوسرا یہ کہ مومنین مساکین و فقراء بیوگان و یتامیٰ اور معذور مومنین کی حق تلفی ہوگی۔ کیونکہ زکوٰۃ ہی تو ان کا بنیادی حق ہے۔ زکوٰۃ کا اولین و بہترین مصرف انسانی جان و آبرو ہے۔ ہاں اگر ملک میں غریب و مفلس مسکین و بے سہارا مومنین و مومنات نہ ہوں تو پھر رفاہ عامہ یا امور مستحبہ میں خرچ ہو سکتی ہے۔ لیکن غربت و افلاس اور تنگدستی میں مبتلا مومن کہاں نہیں ہیں؟ ان کے ہوتے ہوئے آپ مستحبی و نمائشی امور میں بے دریغ دولت خرچ کریں

روزِ قیامت وہ آپ کے دامن گیر ہوں گے اور آپ حقوق العباد کے سلسلہ میں جواب دہ ہوں گے۔

اصل اور نقل میں فرق

مساجد خانہ کعبہ کی اور تعزئیے روضہ ہائے مقدسہ کی نقل ہیں۔ جو احکام اصل کے متعلق ہوتے ہیں وہ نقل پر نہیں ہوتے؛ مثلاً مسجد خانہ کعبہ کی نقل ہے طواف وغیرہ کا تعلق اصل کعبہ سے ہے اس کی نقل مسجد سے نہیں۔ اسی طرح کعبہ اور مسجد حرام حرم ہیں، عام مسجد حرم نہیں کعبہ قبلہ ہے مسجد قبلہ نہیں اسی طرح مزارات مقدسہ اور روضۂ مطہرہ ائمہ معصومین صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہم اجمعین اصل ہیں اور ہمارے ہاں جو تعزئیے شبیہوں کی صورت میں بنائے جاتے ہیں۔ وہ ان کی نقل ہیں۔ لہٰذا جو احکام ان کے وہاں ہیں وہ ان کی شبیہوں کے یہاں نہیں۔ یہ صرف شعائر عزاداری تک محدود ہیں۔ یہ شبیہیں ہماری حاجت روا اور مشکل کشا نہیں نہ ان کا طواف کرنا چاہیئے نہ ان کو مرکز حاجات اور مقام عبادات تصور کرنا چاہیئے۔ ہاں ان کا احترام ضروری ہے۔ اور جس معصوم کی طرف کوئی شبیہہ منسوب ہو اس شبیہہ کے مقام پر اس معصوم کا واسطہ دے کر خداوند عالم قاضی الحاجات سے دعا مانگنا جائز ہے۔

ہدیہ دینا، نیاز دینا کسی امام معصوم یا کسی شہید مظلوم کے نام پر اس معنی میں کہ یہ نیاز و ہدیہ فلاں امام یا شہید کی طرف سے ہے کہ اس کا ثواب فلاں امام یا شہید کی روح مبارک کو پہنچے جائز اور مستحب ہے جس طرح درود شریف سلام زیارت ہم ہر روز پڑھتے ہیں یہ ان کے لئے دعا مانگتے ہیں ان کی شفاعت کی قبولیت کے لئے اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے ہم دعا مانگتے ہیں۔ وَتَقَبَّلْ شَفَاعَتَهٗ فِیْ اُمَّتِہٖ وَارْفَعْ دَرَجَتَهٗ؛

اور قائم آلِ محمد عجل اللہ ظہورہٗ کے ظہور کے لئے ہم دعا مانگتے ہیں۔ یہ ایک

روحانی محبت اور ہدیۂ عقیدت کے طور پر ہے۔ ورنہ ہم ان کے محتاج ہیں وہ ہمارے محتاج نہیں۔

مراسم عزا

مراسم و مجالس عزا مستحب ہیں۔ شیعہ قوم کو ان سے دلی وابستگی ہے اور ہونی چاہیئے۔ محبت و عقیدت کا ثبوت اور مذہبی پختگی کا باعث ہیں۔ انہی کے دم سے شیعوں کی پہچان اور قومی اتحاد ہے۔ مگر بہر حال یہ مستحب ہیں فرض و واجب نہیں ان کی بجا آوری کسی فرض و سنت کے ترک کا باعث نہ بنے۔ کسی شرعی امر سے تصادم نہ ہو اور غیر شرعی امور ان میں داخل نہ ہونے پائیں۔

حرام کے سرمایہ سے پرہیز

مساجد و امام بارگاہیں مقدس مقام ہیں یہ صرف عمارتیں ہی نہیں عبادت گاہیں ہیں۔ ان میں کسب حرام اور ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ روپیہ ہرگز خرچ نہ کیا جائے۔ جس کی حرمت کا علم ہو اس روپیہ سے پرہیز کیا جائے۔ حرام کمائی سے جو سرمایہ ان کی تعمیر میں لگایا جائے گا اس میں عبادت باطل ہو جائے گی۔ اسی طرح مکر و فریب غلط طریقوں اور غیر شرعی امور سے مومنین کے دل بہلا کر ان کو خوش کر کے ان کو جھوٹی امنگیں دلا کے جو روپیہ حاصل کیا جائے گا وہ ناجائز ہوگا اور اس کا مسجد و امام بارگاہ میں خرچ کرنا قطعاً حرام ہو گا۔ اس پختہ مزین اور شاندار عمارت سے جو حرام کی کمائی سے تعمیر کی گئی ہو وہ عمارت بہتر ہے جو کچی سادہ ہو مگر حلال کمائی سے بنائی گئی ہو۔ جس کی بنیاد زہد و تقویٰ پر ہو یاد رکھیے کہ تقویٰ ہی دین کی بنیاد ہے۔ مجلس خانے دین و شریعت کی درسگاہیں اور مقام عزا ہوتے ہیں نہ کہ ذاتی عزت و وقار بڑھانے کے اسباب اور ذاتی و مالی منفعت کے ذرائع۔

ذاکرین کرام اور واعظین عظام

یہاں بھی یہ کلیہ سب افراد ذاکرین و واعظین پر حاوی نہیں ہے۔ بلکہ اکثریت پر صادق آتا ہے۔ قلیل تعداد ذمہ داری محسوس کرتی ہے۔ اکثر غیرت دار ہیں۔ عنوان تو ہے مجالس حسین علیہ السلام اور مواعظِ دینیہ مگر ہوتی ان میں زیادہ تر فنکاری ہے۔ آج قصائد اور نثر کے ذریعہ غیر ذمہ دارانہ اور صداقت و اعتبار سے خالی بیان نشر ہو رہے ہیں۔ مجالس اپنی افادیت کھو چکی ہیں اور تبلیغ وہدایت مفقود ہے۔ صرف دکانداری رہ گئی ہے۔ اور جلب منفعت اور اپنا فنی کمال دکھانا مقصود ذاکرین و واعظین ہے۔

سٹیج اب تجارت گاہ بن گئی ہے۔ اور شہدائے کربلا کی قربانیوں کے مقاصد نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ فنکار حضرات اپنا فن شہدائے کربلا کے خون میں رنگین کر کے فروخت کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کا کاروبار چمکا ہوا ہے۔ دین کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔ اسلام کا مزاج بگاڑ دیا گیا ہے اور واقعہ کربلا ایک تجارتی مال بن گیا ہے۔ ہر عہدہ ہر ملازمت کا ایک معیار ہوتا ہے۔ مگر سٹیج پر آنے والوں کا کوئی معیار نہیں۔ آج ہر شخص جسے چند قصیدے اور دو ہڑے یاد ہوں ذاکر ہے اور ہر وہ شخص جسے چند تقریریں یاد ہوں واعظ بن گیا ہے۔

نہ کوئی معیار تعلیم ہے، نہ کوئی مذہبی پابندی ہے اور نہ آداب مجالس کا کوئی پاس ہے۔ کھلی آزادی ہے نہ خوفِ خدا نہ آئمہ معصومین علیہم السلام سے حیا نہ سامعین سے کسی خطرہ کا احساس نہ قیامت میں باز پرس کا ڈر نہ حفظِ مراتب کا خیال نہ اہلِ علم کا لحاظ نہ کتب کے ساتھ بیان کی مطابقت نہ روایات صحیحہ کی پابندی نہ اسلامی تشخص اور نہ دینی شکل وصورت۔ حالانکہ یہ مقام انبیاء اور مسند اوصیائے علیہم السلام ہے

یہ صورت حال ہے قوم خاموش تماشائی ہے۔ بے حسی کی انتہا ہو گئی ہے۔

احساس سو گیا ہے ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے
یہ امت روایات میں کھو گئی ہے

آج لاکھوں کروڑوں روپیہ سٹیج کی نذر ہو رہا ہے اور ملت کا بخت سو رہا ہے۔ ضلالت بڑھ رہی ہے۔ ہدایت گھٹ رہی ہے۔ قوم کے اس کثیر سرمایہ سے بجائے ہدایت کے گمراہی پرورش پا رہی ہے۔

روح عزاداری اور اصلیت تبلیغ مروجہ مراسم میں گم ہو گئی ہے۔ بعد معذرت و طلب عفو از ذاکرین کرام و واعظین ذوی الاحترام چند خامیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اور التجا یہ ہے کہ ان پر ٹھنڈے دل اور فارغ دماغ سے غور فرمائیں، کہ واقعی یہ خامیاں ان میں پائی جاتی ہیں؟ اور واقعی یہ خامیاں ہیں؟ یا یہ خامیاں نہیں خوبیاں ہیں۔ صرف اپنے پیشے کا پاس نہ کریں حقیقت کو مدنظر رکھیں۔ دینی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیں۔

اور اگر ان بیان کردہ خامیوں کو خامیاں تصور کریں تو ان کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ بجائے مصنف کتاب کو کوسنے کے اپنی اصلاح کی طرف توجہ دیں۔ آپ کسی مصلح کو اور مصنف کتاب کو ہزار دشنام دیں اسے دشمن عزاداری قرار دیں لیکن اس طرح آپ کی خامیاں خوبیوں سے بدل نہیں سکتیں۔ آپ کی خامیاں خامیاں ہی رہیں گی اور نہ آپ کے کہنے سے مصنف کتاب دشمن اہل بیت اور دشمن عزاداری بن سکے گا۔ یہ عادت ہے کہ انسان اپنی خامیوں کی طرف دھیان نہیں دیتا اور جو مصلح اسے خامیوں کی طرف متوجہ کرے الٹا اس پر کیچڑ اچھالتا ہے۔

آج کل ذاکر و واعظ و مقرر لالچ دنیا کی خاطر مجلسیں پڑھتے ہیں۔ ان کی لالچ و حرص کا یہ بڑا ثبوت ہے کہ ایک گھنٹہ کی سینکڑوں ہزاروں روپے فیس مقرر ہے اور پڑھنے والا ایک مقام پر اکتفا نہیں بلکہ محرم میں چار پانچ مقام اور

پر روزانہ مجلس پڑھتا ہے۔ ہانپتا ہوا آتا ہے۔ اطمینان سے نہیں بیٹھتا۔ سکون سے نہیں پڑھتا اور پڑھنے کے بعد چین سے بیٹھتا۔ مجھے فارغ کرو مجھے فارغ کرو کا وظیفہ پڑھتے ہوئے بانی کی طرف بار بار نگاہ اٹھاتا ہے۔ اور فارغ ہونے کے بعد ہانپتے ہوئے اگلے مقام کی طرف روانہ ہوتا ہے کوشش یہی ہوتی ہے کہ دو تین مقام پر پہنچ کر روپیہ بٹوروں اور آگے بڑھوں۔ ایک مقام پر قناعت نہیں حرص کے گھوڑے پر سوار باگیں ڈھیلی کئے ہوئے دونوں ہاتھوں سے روپے وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوڑ رہے ہیں ذاکر و واعظ دوڑ رہے ہیں، ہانپ رہے ہیں لپک رہے ہیں روپوں کے پیچھے ہائے دنیا! ہائے دنیا!!

اور سٹیج پر محمد و آل محمد علیہم السلام کے زہد و تقویٰ کے افسانے دہراتے ہیں اور یہ بیان کرتے کرتے نہیں تھکتے کہ ہمارے امام اول اور خلیفہ بلا فصل جناب امیرالمومنین علیہ السلام نے دنیا کو تین بار طلاق دی تھی۔

یہ مومنین نے نصیحت کرتے ہیں کہ تم دنیا سے دل نہ لگاؤ۔ زہد و تقویٰ اختیار کرو۔ اپنے پاس کچھ نہ رکھو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے ہمیں دیدو اور جس دنیا کو امام پاک نے طلاق دی تھی اسی مطلقہ کی طرف انہوں نے رجوع کر لیا ہے۔

اب یہ لوگ مصر ہیں کہ ہم جناب امام مظلوم کے خادم ہیں ہم واقعہ کربلا کے بیان کرنے والے حسینیت کی نشر و اشاعت کرنے والے مذہب اہل بیت کی تبلیغ کرنے والے ہیں۔ لیکن یہ قول ان کا اپنی زبانی ہے۔ ان کا رنگ ڈھنگ اور طور طریقہ صاف بتلاتا ہے کہ یہ طالب دنیا ہیں۔ طالب زر و مال ہیں ان میں قناعت نہیں حرص دھوا ہے۔

ہوس زر اور حرص مجالس کے مضر اثرات

مجالس کے توسیعی پروگرام سے جہاں ہوس زر اور حرص مذموم کا ظہور

ہوتا ہے۔ وہاں کئی مضر اثرات بھی پیدا ہوتے ہیں۔

اپنے دینی بھائیوں کی حق تلفی : ذاکر حضرات اور واعظین کرام! علمی معیار اور مذہبی و عملی استعداد میں آپ کے کئی بھائی آپ کے برابر ہیں بلکہ آپ سے بلند ہیں مگر ان کا دنیوی بخت آپ سے پست ہے ان کا ستارۂ اقبال مدہم ہے۔ اس وجہ سے قوم میں ان کی آپ کے برابر مانگ نہیں آپ خوش بخت و خوش نام ہیں اور وہ گمنام ہیں لیکن علم و عمل میں آپ سے کم نہیں اور آپ کی ہوس مجلس گیری سے ان کی حق تلفی ہو رہی ہے۔

جس طرح کہ کسی مارکیٹ میں کوئی خاص شے نمایاں ہو جائے۔ تو لوگ شہرت کی وجہ سے اس کی طلب زیادہ کرتے ہیں۔ یہی حال مجلس کی مارکیٹ کا ہے چند مولوی صاحبان اور چند ذاکرین حضرات جب آسمان شہرت پر نیر تاباں بن کر چمکتے ہیں تو مومنین بے تحاشا بے سوچے سمجھے دیکھا دیکھی انہی کی طرف لپکتے ہیں۔ چنانچہ مارکیٹ پر انہی مخصوص افراد کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ ایام محرم میں پانچ چھ مقامات سے کم پر وہ قناعت نہیں کرتے۔ جہاں تک ان کی طاقت بشری کام کرتی ہے۔ حرص کا دامن پھیلا کر ان مقامات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

اگر ان کی اس ہیضہ کی وبا کے متعلق دریافت کیا جائے تو عذر یہ کرتے ہیں کہ مومنین مجبور کرتے ہیں کہ ہم تو خود تنگ ہیں لیکن مومن نہیں چھوڑتے کیا کریں مجبور ہیں ان کا یہ عذر حقیقت کے ساتھ مذاق اور اپنی مقبولیتِ عوام پر ناز و اترانا ہے۔

عوام تو جاہل ہیں بے وقوف ہیں دیکھا دیکھی کے پیروکار اور شہرت کے پرستار ہیں مگر آپ تو ماشاءاللہ عالم فاضل واعظ ذاکر حق و باطل میں تمیز کرنے والے حقوق العباد سے باخبر غاصب کو برا سمجھنے والے حق تلفی کے گناہ سے واقف ہیں۔

عوام کی مرضی کے آگے آپ کیوں جھکتے ہیں؟ ان کی خواہش آپ کو کیوں مجبور کر دیتی ہے۔ آپ ان پر اپنی مرضی کیوں نہیں مسلط کرتے۔ بجائے ان کے ہم خیال بننے کے ان کو اپنا ہم خیال کیوں نہیں بناتے۔ حقوق العباد اور اپنے بھائیوں کے حقوق ان کو سمجھائیں۔ اور ان کا تعارف آپ کرائیں۔ یہ آپکا اخلاقی فرض ہے۔ ان کو منظر عام پر لائیں ہو سکتا ہے کہ ان کے مواعظ و بیانات سے کئی مومن سدھر جائیں۔ ان کو موقع دینے سے اور ان کے سٹیج پر لانے سے اُن کی قابلیت سے بھی قوم فائدہ اٹھائے اور ممکن ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ بھی آپ ایسے نامور بن جائیں۔ مجالس کی ذخیرہ اندوزی سے آپ تو مالدار بن جائیں گے۔ لیکن آپ کے آپ ایسے بھائیوں کی محرومی ان کی غربت اور ان کے افلاس کا سبب بنے گی۔

مجالس اور دولت کا ارتکاز ہو جائے گا۔ تقسیم صحیح نہ رہے گی نہ مساوات رہے گی اور نہ مواسات۔ کیونکہ عدم مواسات کی وجہ سے ہی مجالس کی ذخیرہ اندوزی ہے اگر آپ میں مواسات ہوتی تو آپ چھ مقامات کی بجائے صرف دو مقاموں پر قناعت کرتے اور تین چار واعظ و ذاکر آپ کی ہوس کثرت کا نشانہ نہ بنتے اگر ہر واعظ و ہر ذاکر ایام محرم میں صرف دو مقاموں پر اکتفا کرے۔ تو باقی واعظین و ذاکرین بھی اس دینی و دنیوی سعادت سے محروم نہ رہیں گے۔ مومنین کی مجبوری والا عذر نہایت ہی گندہ ہے۔ کیونکہ وہ تو جاہل بے دقوف ہیں۔ شخصیت کے پرستار ہیں اصول پرست نہیں۔ آپ کی حق بات نہیں مانتے۔ آپ کی صحیح آرزو پوری نہیں کرتے تو آپ ان کی غلط بات اور باطل آرزو کیوں مانتے رہیں۔

جب آپ انکار کر دیں گے اور کوئی دو سے زیادہ جگہ کا طلب گار نہ رہے گا تو مجبوراً وہ دوسروں کی طرف رخ کریں گے اور انہی گمنام واعظین و ذاکرین کو جب موقع ملے گا وہ بھی آپ جیسے ہو جائیں گے۔

"سرکارِ حسینی میں ہے حصہ سب کا"

۲۔ آپ کی صحت کا نقصان ہے اور بانیانِ مجالس کی پریشانی و بے چینی۔

۳۔ مجلس کی افادیت سکون و وقار ختم، کیونکہ عجلت ہر کام میں مضر ہوتی ہے سوائے ترکِ گناہ اور توبہ اور تعجیلِ حسنات کے۔

مجلس پر سکون اور باوقار اس وقت ہوتی ہے۔ جب مجلس شروع ہونے سے پہلے مجلس پڑھنے والے اس مقام پر موجود ہوں۔ اطمینان و وقار سے مجلس پڑھیں اور سننے والے دل جمعی و سکون سے مجلس سنیں۔

۴۔ اس طرح مجلس کا تقدس مجروح ہو جاتا ہے اور ایک کاروباری امر ظاہر ہوتا ہے۔ مذہبی درسگاہ کا تصور اڑ جاتا ہے۔ اور تجارت گاہ کا خیال جم جاتا ہے۔

سٹیج و منبر کی ذمہ داری

طرزِ عمل بتا کے رہا خود جو بے عمل ❊ بڑھنے لگا ہے ساحرِ گفتار کا عمل

منبر پہ چڑھ کے شور مچاتا چلا گیا ❊ ہر اک کو بے عمل وہ بناتا چلا گیا

اہلِ منبر اور اہلِ سٹیج واعظین و ذاکرین اپنے بیان کے ذمہ دار رنگین گفتار و مسئول کردار ہیں۔

اولاً تو انہیں اپنا مقام سنبھالے اور احساس ذمہ داری کے بغیر اس مقام پر آنا ہی نہ چاہیئے۔ اور اگر آئیں تو یہ سوچ اور سمجھ کے آئیں کہ یہاں جو کچھ زبان سے نکلے گا۔ وہ سینکڑوں ہزاروں کانوں میں پہنچے گا۔ سامعین میں سے ایسے بہت کم افراد ہیں جو غیر ذمہ دارانہ بیان کو جھٹک کر دُور پھینک دیں۔ اور کانوں کی راہ سے دل و دماغ میں نہ آنے دیں۔ کیونکہ پاکستانی شیعہ ذوق کتب بینی سے محروم اور شوقِ سماعت سے بھرپور ہیں وہ جو کچھ مذہب حاصل کرتے ہیں یہیں سے حاصل کرتے ہیں۔ قدیم شیعوں نے سٹیج سے مذہب لیا ہے

اور جدید شیعہ بھی سٹیج ہی کے دلدادہ ہیں اور اسی سے سب کچھ لے رہے ہیں۔ لہٰذا آپ جو بیان نشر کریں گے جو بات کہیں گے اور جو کچھ زبان پر جاری کریں گے وہ ہزاروں مومنین سامعین میں پھیل جائے گی اور سننے والے اسے مذہب اور صحیح خیال کرتے ہوئے قبول کر لیں گے۔ عوام کا اتنا معیار علم نہیں کہ وہ صحیح و غلط کو پرکھ سکیں۔

ایک واعظ و ذاکر کی طرف ہزاروں آنکھیں دیکھتی اور ہزاروں کان اس کی بات سنتے ہیں۔ اگر صحیح مصدقہ سچی باتیں صحیح عقائد نشر ہوں تو صحیح مذہب پھیلتا ہے اور اگر غلط باتیں غلط عقیدے اور غلط روایات غلط تفسیریں، غلط حدیثیں غلط استنباط بیان کئے جائیں تو مذہب ایک ایسے غلط رنگ میں پھیل جاتا ہے جس کی اصلاح اور تصحیح مشکل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ غلط صورت میں پھیلا ہے اور غلط صورت میں پھیل رہا ہے۔ یہ سب کچھ سٹیج کی غیر ذمہ داری اور غلط بیانی کا نتیجہ ہے کہ آج مذہب کی صحیح صورت سامنے نہیں بگڑی ہوئی شکل دکھائی دے رہی ہے۔ اور اگر صحیح طور پر اس سماعی مذہب کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے اکثر حصے غلط اور باطل ثابت ہوں گے تھوڑے ہی اجزا صحیح اور حق بجانب ہوں گے۔

معیار و حدود کا فقدان

سٹیج پر آنے والوں کا کوئی علمی و عملی معیار نہیں اور نہ بیان کی کچھ حدود مقرر ہیں۔ جن کے اندر رہ کر وہ اپنا بیان جاری کرے اس واسطے سٹیج آج کل اتنا غیر ذمہ دار ہے کہ ایک کلیہ وضع کرنے کی ضرورت درپیش آگئی ہے کہ سامعین حضرات جو کچھ سٹیج سے سنیں اسے صحیح نہ سمجھیں۔ سٹیج قابلِ اعتبار نہیں۔ ذوقِ سماعت کو تسکین دے لیں۔ آنسو بہانے اور آہ و بکا کرنے کی تمنا پوری کر لیں لیکن سٹیجی بیان کو دل میں نہ جگہ دیں اور نہ سٹیج والوں پر کلی اعتماد کریں واپس

گھر آ کر قابل اعتبار و مصدقہ ذرائع سے اس کی تصدیق کر لیں۔

اگر حکومت پاکستان کسی ادارے میں چپڑاسی اور چوکیدار بھرتی کرتی ہے تو اس کا بھی ایک معیار مقرر ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اسے صحتِ کردار کا ایک سرٹیفکیٹ بھی پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس کا طبی معائنہ بھی ہوتا ہے۔

لیکن اس روحانی اور تبلیغی مسند اور اسلامی تاریخ و تفسیر واقعات و احادیث فضائل و مصائب کی مقدس نشرگاہ پر بیان جاری کرنے والوں کا کوئی معیار نہیں کوئی پابندی نہیں کوئی حد و مقرر نہیں۔ مکمل آزادی اور مطلقاً آزادگی ہے جو آئے جس صورت میں آئے جس طرح آئے جو کچھ کہے مطلقاً آزادی ہے۔ جس کی وجہ سے باطل آزاد ہو گیا اور حق پابند ہے۔ جھوٹ آزاد ہے اور سچ پر پابندی عائد ہے۔ جب کسی شے کو مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے تو اس کی ضد مخالف پابند ہو جاتی ہے۔ آج مجالس و محافل میں اکثر واعظین حضرات تفسیر بالرائی کے اثم کبیرا اور من گھڑت تاویل اور وضعی و ضعیف روایات غیر ذمہ دارانہ فضائل اور غلو نوازی کے ظلم عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اکثر ذاکرین صاحبان مصائب کے میدان میں صرف بے ثواب رُلانے اور بے اجر گریہ کرانے کی خاطر خود ساختہ ضعیف غلط روایات کو نہایت ڈھٹائی کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ جس قدر یہ لوگ زیادہ گریہ کرتے ہیں اسی قدر وہ اسیران کوفہ و شام اور شہدائے کربلا کی توہین کر کے مجرم بنتے ہیں۔ ان کے بیانات سے ان کی بے صبری واویلا گھبراہٹ ظاہر ہوتی ہے۔ ان کا اطمینان و استقلال منفی نظر آتا ہے۔

نہ معلوم کس جرأت اور ڈھٹائی کے ساتھ اپنی گھڑی ہوئی روایات کو اہل بیت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اہل بیت علیہم السلام کی روحیں تو اس غلط نسبت سے کانپ اٹھتی ہوں گی۔ لیکن ان کو ضمیر ملامت نہ کرتا ہو گا اور ان کو شرم نہ آتی ہو گی۔ غالباً ان کا یہ خیال ہو گا کہ رُلانے کی خاطر غلط بیانی د

جعل سازی جائز ہے۔ حالانکہ غلط روایات پڑھنا اور رلانا ناجائز اور خالی از ثواب ہے اور کذب بیانی کا گناہ علیحدہ۔

ان کی ناجائز جرأت اور مذموم جسارت دو حال سے خالی نہیں۔

۱۔ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ قیامت نہ آئے گی۔ روزِ محشر کوئی نہیں اور ہمارے اعمال و اقوال کی باز پرس نہ ہوگی۔ یہ خیال غلط ہے قیامت ضرور آئے گی اور ہر شخص سے پوچھ گچھ ہوگی۔ ادنیٰ سے بھی اور اعلیٰ سے بھی سامعین سے بھی بانیین سے بھی واعظین و ذاکرین سے بھی حتیٰ کہ انبیاءؑ و مرسلین اور ائمہ طاہرین علیہم السلام سے بھی۔

سنہ ۴۰ھ ماہِ رمضان کی انیسویں رات شب ضربت کو جناب ام کلثوم بنت امیرالمومنین علیہما السلام نے اپنے امام المتقین بابا کے سامنے کھانا رکھا اور روٹی کھانے کے لئے دو چیزیں رکھیں نمک اور دودھ۔

امیرالمومنین نے فرمایا کہ بیٹی ایک چیز اٹھا لے، میں نہیں چاہتا کہ آج دو کھانوں سے روٹی کھالوں اور روز قیامت مجھے اس کا حساب دینے کے لئے میدانِ محشر میں زیادہ دیر کھڑا رہنا پڑے۔ (مزید آگے بیان ہوگا)

کھانے بھی نمک اور دودھ تھے، چنانچہ جناب ام کلثوم سلام اللہ علیہا نے دودھ اُٹھا لیا اور شہنشاہِ کشور زہد نے صرف نمک سے کھانا تناول فرمایا۔

اے ذاکرین و واعظین! آپ کے معصوم امام اس قدر خوفِ محشر اور احساس روزِ قیامت رکھتے ہیں تو آپ کس کھیت کے بتھوا اور کس باغ کی مُولی ہیں کہ نہایت ڈھٹائی، بے پرواہی اور بے حیائی سے تفسیر بالرائے من گھڑت فسانے جھوٹی روایات اور خود ساختہ تاویلیں بیان کریں اور آپ سے باز پرس نہ ہو۔

دوسرا حال یہ کہ شاید سمجھتے ہوں گے کہ مجلس حسینؑ میں سب کچھ بیان کرنا روا ہے جھوٹا معجزہ، غلط فضائل اور صرف رُلانے کی خاطر غلط مصائب یہ بھی خیال غلط ہے اور ان کی سوچ اور سمجھ گمراہ ہے۔

ہمارا مذہب حقائق سے بھرپور ہے۔ اغلاط سے پاک ہے۔ جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ اور اہل بیت علیہم السلام کی طرف قصداً و عمداً جھوٹ کی نسبت دینا زیادہ گناہ اور ظلم کبیرہ ہے۔ اغلاط اور جھوٹی باتوں کی نشر و اشاعت کا جرم علیحدہ اور اس سے ارواح اہل بیت علیہم السلام کو جو اذیت اور تکلیف ہوگی وہ الگ نوعیت کا گناہ ہے۔

کتنی بڑی مذموم جرأت اور کتنی زبردست جسارت ہے کہ نام و نمود کی خاطر اور مال و دولت کی لالچ میں خود اپنی بنائی ہوئی روایات اہل بیت کی طرف منسوب کرکے نام نہاد ذاکر و اعظ فخر سے بیان کرے۔ اور پھر شہنشاہِ مصائب کا لقب اختیار کرے"۔ آج کا شہنشاہِ مصائب وُہ ہے جو شہنشاہِ کذب ہے۔" اسی طرح شہنشاہِ فضائل وُہ ہے جو مملکتِ غلو اور کشور اکاذیب کا سلطان ہے" آج کے جلسے ذاکرین و واعظین کے میچ ہیں اور باہمی مقابلہ زبان و گفتار کا میدان ان میں متعدد و مختلف واعظین و ذاکرین اپنے فنی کرتب دکھاتے ہیں اور اُن کا بھاری بھرکم معاوضہ وصول فرماکر رخصت ہوجاتے ہیں۔ ویسے جلسہ کسی ایک ذاکر یا واعظ کے نام منسوب ہو جاتا ہے۔ جو اپنی فنی مہارت میں پہلا مقام فسٹ پوزیشن حاصل کرتا ہے۔ افسوس کہ مجلس مظلوم آج ان پہلوانوں کا اکھاڑہ بن چکی ہے اور قوم کا لاکھوں روپیہ فنی کرتبوں کی نذر ہو رہا ہے۔ اور اس چیز کو نام عبادت کا تذکرۂ معصوم کا اور روحانی مجلس کا دیا جاتا ہے اور قوم بے حسی کا اور قائدین قوم غفلت کا شکار ہیں۔ کوئی خیال نہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اور آگے بڑھ کر کیا ہوگا۔

کتابی اور سٹیجی مذہب کی عدم مطابقت

کتابی مذہب شیعہ کی تحریر سٹیجی مذہب کے بیان سے مطابقت نہیں کھاتی۔ جو مذہبی روح کتب سے مستفاد ہوتی ہے وہ اور ہے اور جو مذہب سٹیج سے

حاصل ہوتا ہے وہ اور ہے دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

اور اس کے ذمہ دار واعظین و ذاکرین ہیں جنہوں نے کتب مذہب کو جو دراصل اساس مذہب ہیں پس پشت ڈال دیا اور اپنی زبان کو لگام پابندی سے بے نیاز کر دیا۔ صرف سامعین کی خوشنودی اور ان کی خوشنودی

کو اپنے بیان کی کامیابی کا معیار قرار دے کر خلافِ کتب مواد پیش کر کے اپنی دکان کو چمکایا جس کا نتیجہ یہ نکلا سامعین حضرات نے آپ کے غیر ذمہ دارانہ بیان کو حقائق سمجھ کر اپنے دل و دماغ میں راسخ کر دیا۔ اور صرف اسی کو مذہبی حقائق تسلیم کر لیا۔ جب کچھ اہلِ دل اور اہلِ نظر نے ان کے نشر کردہ بیانوں کو غیر ذمہ دارانہ اور حقائق کے خلاف قرار دیا تو ان پر دشنام طرازی ہونے لگی اور انہیں وہابی اور دشمن اہلِ بیت کہا جانے لگا۔ ان سے نفرت پیدا ہو گئی۔ بجائے اس کے کہ آپ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے حق گو واعظین و ذاکرین کی حمایت کرتے الٹا آپ دشنام دہندہ حقائق سے بے خبر جاہل سامعین کی ہمنوائی کرنے لگے۔

مذہب کو ان دو حصوں میں تقسیم کرنے کتب مذہب سے شیعہ کو برگشتہ کرنے کے ذمہ دار آپ اور صرف آپ ہیں۔

ہم معتبر اور مستند کتب کو غلط نہیں قرار دے سکتے کیونکہ وہی ہمارے مذہب کی اصل و اساس ہیں۔ اگر یہ اصل و اساس مذہب کتب غلط ہیں، تو ہمارا مذہب بھی غلط اور باطل ہے: معاذ اللہ

ہم ان کتب کو حقیقت پر مبنی قرار دیتے ہیں اور ان کے خلاف چلنے کی صورت میں آپ کو غلط اور خلاف حقیقت جانیں گے۔

ذاکرین کرام

آپ سٹیج پر قدم رکھنے سے پہلے یہ سوچ سمجھ لیا کریں کہ آپ کا مشن کیا

ہے۔ آپ کی ذمہ داری کیا ہے آپ اپنی قابلیت کے مطابق بیان کریں۔ اور ایسی چیزوں میں مداخلت نہ کریں جو آپ کی علمی استعداد سے باہر ہوں۔ صحت روایات کی پابندی کو مدنظر رکھیں اور کسی ذمہ دار دیانت دار حق گو عالم سے اپنے اپنے جاری کرنے والے بیان اور بیان کی جانے والی روایت کی تصدیق کروا کر پڑھا کریں۔ آداب مجالس اور سٹیج کے تقدس اور زبان کی ذمہ داری کا خاص خیال رکھیں۔ خوش الحانی دردناک آواز غم خیز لہجہ شرع مقدس میں ممنوع نہیں ہے۔ آپ بے شک قصیدے، نوحے، مرثیے، دوہڑے پڑھیں مگر مجلس خانہ کو سینما ہال نہ بنائیں۔ بے دین ایکٹروں کی فلمی طرزوں راگ کی اقسام اور تان پلٹوں سے مجلس کی روح کو مجروح اور اس کے تقدس کو پائمال نہ کریں جب بھی نئی طرز سینما ہال سے جاری ہوتی ہے آپ لوگ اسے قبول کر کے مجالس میں اس کی دہرائی شروع کر دیتے ہیں اور آپ کی شاعرانہ قوت فوراً اس طرز پر قصیدے اور نوحے تیار کر دیتی ہے۔

ایک عذر اور اس کا ابطال

آپ کا یہ عذر کہ فلمی طرز اور راگ کے ذریعہ سے غیر مذہب ہماری مجالس میں شریک ہوتے ہیں اس طرح راگ کی کشش ہمارے مذہب سے واقف ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ غنا کی بدولت وہ غیر لوگ ہمارے مذہب میں داخل ہوتے ہیں اور ہمارے مذہب کی افرادی قوت بڑھ جاتی ہے۔

یہ عذر باطل بلکہ ننگ مذہب ہے۔ آپ کے عذر کو سامنے رکھ کر اہل خلاف یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیعہ مذہب حقائق اور صداقت اصول کی بنا پر نہیں پھیلا بلکہ راگ کے باطل ذریعہ سے پھیلا ہے۔ جس طرح کہ باطل مذاہب کو عموماً ناجائز ذرائع اور بے غیرت وسائل سے پھیلایا جاتا ہے۔ جس کا مقصد صرف افرادی قوت کا حصول ہوتا ہے۔ اسی طرح شیعہ مذہب بھی باطل ذرائع سے ترقی

پذیر ہو رہا ہے۔

مذہب وہ سچا ہوتا ہے اور وہی ترقی مستحسن ہوتی ہے جو حقائق اور صداقت کے اصول پر قائم ہو۔ مذہب میں داخل ہونے والا مذہب کی سچائی حسن معاشرہ اصول و فروع کو حقیقت پر مبنی سمجھ کر داخل مذہب ہو۔

اللہ پاک کو سچے مذہب کی تعداد کی وہ کثرت پسند نہیں ہے جو ناجائز ذرائع سے ہو بلکہ وہ تعداد پسند ہے جو حقیقت شناس حقیقت پسند اور حقیقت پر قائم ہو ورنہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس نے ہادی بنا کر بھیجے کہ لوگوں کو گمراہی سے نکال کر صراط مستقیم پر چلائیں اور کفر و شرک سے نکال کر حلقۂ اسلام میں داخل کریں۔ مگر کسی کو اس قسم کے مادی ذرائع کشش کے از قسم راگ عطا نہیں کئے کوئی پیغمبر یا امام اپنے سوز خوانوں کو ساتھ لے کر نہیں آیا اور نہ انہوں نے راگ کی کشش سے لوگوں کو اپنے پاس بلایا۔

اگر دعوت حق کا یہ سلسلہ حق بجانب ہوتا تو پیغمبر راگ کی محفلیں جماتے توحید کے ترانے راگ میں گاتے سریلی آوازوں اور تان پلٹوں سے مخلوق کو جمع کرتے پھر اپنا مشن پیش کرتے اسی طرح ہزاروں لوگوں کے ٹھٹھ لگ جاتے اور تبلیغ موثر ہوتی، ہدایت کامیاب ہوتی مگر عزیزان من ایسا نہیں ہوا اصول و حقائق پیش کئے گئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام راگ و غنا استعمال نہیں کرتے تھے نہ تان پلٹا مارتے تھے نہ سندرہ بھیرویں پہاڑی مالکونس ملتانی جنگلہ وغیرہ راگنیوں اور نہ فلمی طرزوں میں پڑھا کرتے تھے۔ ہاں ان میں خوش الحانی تھی ان کی آواز میں سوز تھا۔ جس سے وہ بارگاہِ رب العزت میں مناجات و تسبیح کرتے تھے۔

راگ کی مکمل تفصیل دیکھنا چاہیں تو رسالہ "حلال و حرام شیعہ" ملاحظہ فرمائیں۔

شکل وصورت

آپ کی شکل وصورت اسلامی ہو۔ فلمی ستاروں، تھیٹروں کے اداکاروں اور مجروں کے فنکاروں کی سی نہ ہو اور اگر آپ کو ان جیسی شکل پسند ہو اسے تبدیل کرنا گوارا نہ ہو تو پھر وہی کام کریں۔ یہاں مجالس میں آکر ارواح ائمہ خصوصاً لختِ دلِ رسول جناب سیدہ بتولؑ کو ملول نہ کریں۔ انہیں اذیت نہ پہنچائیں اور مجلس کا مذاق نہ اڑائیں یہاں آئیں تو مسلمان بن کر آئیں غلام حسینی کی شکل میں آئیں۔ سٹیج کو سرفراز فرمائیں۔ شرمسار نہ کریں۔
یہ آپ کے فائدہ کے لئے اصلاحی پیش کش ہے۔ "گستاخی معاف"

واعظین ذوی الاحترام

کم علم مولوی صاحبان جب عمامہ سر پر سجا کے تفسیر آیات و تاویل قرآن کے خود ساختہ و من گھڑت بیان جاری کرتے ہیں اور ان کی تفسیر بالرای تائید معصومین علیہم السلام سے خالی اور ان کی تاویل عقل کی تائید سے محروم ہوتی ہے۔ زنگ آلود ضمیر ملامت پر آمادہ نہیں ہوتا تو گو جاہل اور بے وقوف مجمع سامعین داد کے ڈونگرے برسا رہا ہوتا ہے۔ واہ واہ اور تحسین کا شور پنڈال کی فضا اور مجلس خانہ کی چھت کو چیرتا ہوا کرہ زمہریر میں جا پہنچتا ہے۔ مگر سٹیج کی مطلقاً اور بے جا آزادی پر مذہب آنسو بہاتا قرآن نوحہ کرتا ہے اور وارثانِ مذہب اس ناپاک جسارت اور غلط تشریحات کی نشر و اشاعت پر سخت غمگین و غضبناک ہوتے ہیں کیونکہ اس قسم کے واعظ و مقرر ان کی محنت پر پانی پھیرتے اور ان کی تعلیمات کو مسخ کر کے اور ان کے ارشادات کی روح کو کچل کے رکھ دیتے ہیں۔
چونکہ مقرر و واعظ کے لئے کوئی علمی معیار نہیں اس واسطے ہر وہ شخص جس کی رسائی تحفۃ العوام یا کسی اور رسالہ تک ہو جائے اور دو چار تقریریں

رٹ لے، جناح کیپ یا عمامہ سر پر رکھ کر شیروانی پہن کر سٹیج پر آدھمکتا ہے۔
پھر جو کچھ بے لگام زبان پر آیا پڑھتا گیا ؎
آئی جو منہ میں سب کو سناتا چلا گیا
یہ تو ان بے علم افراد کی حالت ہے جو جہالت مآب ہیں مگر بعض اوقات شریعت مآب بھی دکانداری کے روپ میں آکر پھسل جاتے ہیں، فضائل و مصائب میں وہ جو کچھ بیان فرماتے ہیں جن کا محققین مذہب اور مصنفین کتب کے ہاں وجود نہیں بلکہ بعض اوقات ان کی تصنیفات کے برعکس اور حقائق کے خلاف خوشنودیٔ خلق کی خاطر صریحاً کذب بیانی سے کام لیتے ہیں۔ اور مرضی مخلوق کے تابع ہو کر ناراضگی خالق کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے ضمیر کو حرص و ہوا کی منڈی پر چند سکوں کے عوض فروخت کر دیتے ہیں۔ جاہل جب گمراہ ہوتا ہے تو تنہا گمراہ ہوتا ہے لیکن ایک عالم فاضل جب گمراہی اختیار کرتا ہے تو قوم کے ایک حصہ کو اپنے ساتھ گمراہی میں لے جاتا ہے۔ اسی طرح اُس کی بھی ایک پارٹی بن جاتی ہے جو اس کی دکان ضلالت کے لئے گاہک مہیا کرتی ہے۔ اس طرح اس کی مجالس وغیرہ کی مارکیٹ میں پذیرائی ہو جاتی ہے اور اس کا سودا خوب بکتا ہے۔ ایسے فاضل علماسو غالباً قیامت پر یقین نہیں رکھتے۔ ایک نظریاتی مقرر، مشنری واعظ اور مذہبی ہادی کا کام ہوتا ہے، سامعین کو اپنا ہم خیال بنانا اور وہ کامیاب مقرر ہے جو اپنے قلبی خیالات اور اپنے فکری نظریات کو پیش کر کے سامعین کو اپنا ہمنوا بنا سکے۔

اور نہایت درماندہ بے چارہ اور بے ضمیر و بے اصول ہے وہ واعظ جو جہلا سامعین کو اپنے ساتھ ملانے کی بجائے خود ان کے ساتھ مل جائے ان کو ہدایت کرنے کی بجائے ان کی ضلالت کی تصدیق کر کے خود ان میں شامل ہو جائے۔

یہ بعض اوقات حرص و لالچ اور ہوائے نفس کی خاطر ہوتا ہے اور بعض اوقات موہوم خوف اور بے اصل ڈر کی وجہ سے اور کبھی کبھی کسی فرد کے ساتھ ذاتی

مخاصمت کی وجہ سے نظریات بدل کر انتقامی کارروائی کرنے کے لئے عقائد کی نظریاتی جنگ لڑی جاتی ہے۔ گو اس معاملہ میں ضمیر زبان کا ساتھ نہیں دیتا تاہم ضمیر مصلحت کے وزنی بوجھ تلے دبا رہتا ہے۔

ذاکرین کرام و واعظین عظام

آپ کو امیروں کے ہاں بھی مجالس کا موقع ملتا ہے۔ کارخانہ داروں تاجروں زمینداروں کے ہاں بھی مجالس پڑھتے ہیں اسی طرح فقراء و مساکین سفید پوش غریب مومن بھی آپ کی طرف نگاہ اشتیاق اٹھاتے ہیں۔ جو کچھ آپ کو امیروں رئیسوں سے وصول ہوتا ہے۔ اس کی غریبوں سے توقع نہ رکھیں اور نہ انہیں نظر انداز کریں جو کچھ اُن سے میسر ہو اسی پر آپ قناعت کر لیں۔ درحقیقت مجالس تو وہی ہیں جو آپ غریبوں کے ہاں پڑھتے ہیں۔ امیروں کے ساتھ تو کاروباری اور تاجرانہ حیثیت ہے۔

مومنین سامعین کرام

آپ مجالس و عزاداری میں مرکزی شخصیت رکھتے ہیں۔ آپ کا اجتماع ہی مجالس و جلوسوں کو کامیاب بناتا ہے۔ لیکن آپ کا ذوق سماعت اس قدر بگڑ چکا ہے کہ مشہور واعظ و ذاکر کے لئے تو آپ قبل از وقت جمع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہاں آپ لذت و حظ نفسی کے لئے جاتے ہیں۔ ثواب کم ملتا ہے غیر مشہور واعظ و ذاکر کی طرف آپ کی رغبت کم ہوتی ہے۔ حظِ نفس نہیں لیکن ثواب زیادہ ملتا ہے۔ اور آپ کے خلوص کا مظاہرہ بھی یہیں ہوتا ہے۔
آپ اگر سنور جائیں حدود و قیود کی پابندی کریں تو مجالس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ مکتوب ذیل امور کی اگر آپ پابندی کریں تو عزاداری کا سارا نظام درست چل سکتا ہے۔

۱۔ اہلِ غنا و سرود بدعمل بدکردار غیر اسلامی شکل والے مجلس کو مجرا، تعیٹر، سینما بنانے والے ذاکر کا سننا بند کر دیں۔

۲۔ بھاری فیسیں طے کرنے والے وعدہ خلافی کرنے والے مجالس کو تجارتی منڈی بنانے والے ذاکرین و واعظین کو سننے کے لئے ان کی مجالس و مواعظ میں نہ جائیں۔

۳۔ ضمیر فروش مولوی بے علم مقرر اور بے عمل واعظ سے نفرت کریں۔

۴۔ غلط تفسیر ضعیف و جعل حدیث جھوٹے فضائل پر دادِ تحسین نہ دیں۔ اور ضعیف و خود ساختہ مصائب کی روایات پر رونا آہ و بکا کرنا چھوڑ دیں۔

۵۔ حق و باطل میں تمیز کریں کھوٹے اور کھرے کی پہچان کریں اور یہی تمیز ہی مذہب کی جان ہے۔ اہلِ حق کے ساتھ محبت اور باطل سے بیزاری کریں۔

۶۔ جو واعظ و ذاکر بالواسطہ طور پر بے عمل بنانے کی کوشش کرے۔ ارزاں قیمت پر یا مفت جنت کا ٹکٹ دے۔ بے عملی یا بدعملی کی ترغیب دے وہ جھوٹا ہے اس سے دور رہیں۔ اور اس کی باتوں کو سچا نہ سمجھیں۔

۷۔ مشکوک واعظ و ذاکر سے جو کچھ سنیں علماءِ حق خدا پرست خدا ترس اور پابند شرع علماء کرام سے اس کی تصدیق کرا لیں۔

۸۔ اگر مجلس جاری ہو اور نماز کا وقت آجائے تو ذاکر و واعظ سے التماس کریں کہ نماز کے وقفہ کے لئے مجلس ملتوی کر دیں اور اگر آپ کی آواز کمزور بھی جائے مجلس جاری رہے تو آپ خود اٹھ آئیں اور فریضہ نماز ادا کر کے پھر مجلس سنیں۔ فریضہ اپنے مقام پر فریضہ ہے۔ مجلس اس کا قائم مقام نہیں ہو سکتی اور نہ مجلس و عزاداری سے فرائض دینیہ متروک ہو سکتے ہیں۔

۹۔ اگر مقابلہ کی مجلسیں ہوں یا مقابلہ کے جلوس ہوں۔ منتظمین باہمی رقابت اور مقابلہ کی مجالس و جلوس کا انتظام کریں تو پہلا فرض آپ کا یہ ہے کہ ان میں مصالحت کرا دیں۔ اگر مصالحت میں کامیابی نہ ہو سکے تو آپ حق کا ساتھ دیں سچے کی مدد کریں خواہ وہ غریب ہی کیوں نہ ہو۔ اور جھوٹے کا ساتھ

نہ دیں خواہ وہ امیر و رئیس و دولت مند ہی کیوں نہ ہو۔ حق و باطل میں تمیز اور سچے و جھوٹے میں فرق حق کی حمایت اور باطل سے نفرت شیعہ مذہب کی جان ہے۔

۱۰۔ عزاداری امام مظلوم علیہ السلام کی رسوم کی ادائیگی میں غیر شرعی امور سننے سے پرہیز کریں۔ کیونکہ شریعت کی پابندی ہر حال میں عزاداری پر مقدم ہے۔ عزاداری شرعی حدود کے اندر ہونی چاہیئے۔

عزاداری کی کوئی ادا اگر شریعت مقدسہ کے خلاف ہو گی تو وہ عزاداری نہیں رہے گی اور نہ امام مظلوم ایسی رسم پر راضی ہوں گے۔ بلکہ وہ حرام ہو گی اور اس پر تمام اخراجات حرام شمار ہوں گے۔

یہ امر خاص طور پر مد نظر رکھیں کہ امام مظلوم علیہ السلام نے شریعت کو اپنے اوپر قربان نہیں کیا بلکہ اپنے آپ کو اپنے کنبہ کو اپنے اصحاب کو شریعت کی بقا پر قربان کیا ہے۔

جب دو چیزوں میں کسی ایک کے بقا کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اس چیز کو باقی رکھا جاتا ہے۔ جو نہایت ضروری اور اہم ہو اگر امام پاک اپنا اور اپنے اعزہ و اصحاب کا وجود باقی رکھنے اور شریعت کو قربان کر دیتے تو ہم سمجھتے کہ امام پاک شریعت پر مقدم ہیں لیکن انہوں نے شریعت کو باقی رکھ کر اپنی جانیں عزیزیں اور مال قربان کر کے شریعت کا تقدم اور اس کی اہمیت ثابت کر دی تو ہمیں بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے ہر حال میں شریعت کو مقدم رکھنا ضروری ہے۔ اسی صورت میں ہم حسینی قرار پا سکتے ہیں ؎

ماتمی لاکھوں ہیں نفس بے ریا کس کس میں ہے
دیکھنا ہے تیرے اسوہ کی ادا کس کس میں ہے

ایک اہم گذارش

آخر میں ایک اہم گذارش ہے ان تینوں گروہوں کی خدمت میں عزاداری کی موجودہ کیفیت سخت بگڑی ہوئی ہے۔ مجالس کا نظام نہایت خراب ہے دینی اصول پائمال اور شریعت کی روح مجروح ہے۔ ذاکرین وواعظین کی ہوس زر بانیان مجالس کی بے راہ روی اور عیاشانہ مزاج سامعین کی لذت پسندی نے مجالس کو پہلوانوں کا اکھاڑہ تفریحی مشاغل بنا دیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں روپیہ بے مقصد خرچ ہو رہا ہے۔ تجارتی منڈی اور کاروباری حیثیت حاصل ہے۔

اگر اس پر قابو نہ پایا گیا تو خرابیاں انتہا کو پہنچ جائیں گی اور قومی دولت عیاشی سماعت کی نذر ہوتی رہے گی۔ اور لوٹ کھسو کا بازار گرم رہے گا۔

اس واسطے بانیان مجالس اور ذاکرین وواعظین کے پہلے الگ الگ اور پھر مشترکہ اجلاس بلائے جائیں اور ان میں سوچ سمجھ کر ضوابط اخلاق اور قواعد واصول وضع کئے جائیں۔ معاوضہ کی رقوم بڑوں کی گھٹائی اور چھوٹوں کی بڑھائی جائیں۔ اخلاقی شرعی معاشرتی قیود وحدود کا پاس کیا جائے اور وضع کردہ اصول وضوابط کی ہر دو فریق سختی سے پابندی کریں۔ بے شک حکومت سے بھی حقوق کا مطالبہ کریں مگر گھر کی بھی اصلاح کریں ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔

حصہ چہارم

اغلاطِ عامّہ

اس باب میں ہم ان متفرق امور کا ذکر کرتے ہیں جو غلط طور پر عوام شیعہ میں مشہور ہو گئے ہیں اور ان امور کی یہ غلط شہرت عوام مومنین کے عقائد و اعمال پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ جن کی وجہ سے عام شیعہ بدعقیدہ اور بدعمل بن جاتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ غلط طور پر پھیلے ہوئے اصولی و فروعی مسائل کی صحیح حقیقت عوام مومنین کے سامنے پیش کریں اور باقاعدہ ثبوت اور دلیل کے ساتھ پیش کریں شاید کہ یہ غلط نظریات و عملیات جو ان کے دماغوں میں عرصۂ قدیم سے چلے آرہے ہیں۔ قابلِ اصلاح ہو سکیں۔

کسی جھوٹ کو بار بار دہرانے اور کسی غلطی کا متواتر اعادہ کرنے سے سادہ لوح عوام کی نظروں میں اسے حقیقت اور سچائی کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ اور صدیوں کے جمے ہوئے باطل خیالات ان کے دماغوں سے بڑی دشواری کے ساتھ نکلتے ہیں۔ ان جمے ہوئے باطل خیالات اور غلط اعمال کے خلاف لوگ بات سننا تک بھی گوارا نہیں کرتے۔ غور و فکر تو دور کا مسئلہ ہے۔

میری نظر میں قوم اور افراد کے عقائد و اعمال کی اصلاح کا کام بہت بڑی عبادت اور عظیم جہاد ہے۔ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت سے ایک گمراہ شخص کی ہدایت اور غلط رو شخص کی اصلاح افضل عمل ہے۔

۱۔ شرعی فرائض اپنے مقام پر عینی فرائض ہیں اور ان کی ادائیگی نہایت ضروری ہے اور ان کے ترک کرنے میں عذاب خداوندی کی وعید ہے۔ کسی مستحب عمل کے بجالانے سے فرائض متروک نہیں ہوتے اور نہ کسی نیک عمل سے فریضہ ٹل سکتا ہے جیسا کہ مجلس و ماتم مستحب ہے۔ لیکن اس سے نماز و روزہ کی ادائیگی معاف

نہیں ہوتی آپ مجلس میں دھاڑیں مار کر روئیں بلند آواز سے گریہ کریں اسی طرح بڑے زور سے ماتم کریں۔ نوحہ خوانی کریں مرثیہ پڑھیں روئیں رلائیں۔ اپنے مقام پر یہ نیک عمل ہے اور اگر خلوص سے یہ نیک عمل بجا لا رہے ہیں تو ثواب کے مستحق ہیں۔ لیکن فرائض اور واجبات مثلاً ترک روزہ کا گناہ اس سے ٹل نہیں سکتا وہ اپنے مقام پر واجب ہیں۔ اور ان کی فرضیت برقرار رہے گی اور عدم ادائیگی کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مجلس و ماتم کے ثواب سے ترک نماز و روزہ کا گناہ بہت زیادہ ہو۔ اور آپ کے اس مستحبی عمل کے ثواب کو ترک فرائض کا گناہ کھا جائے۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مستحبی عمل کا ثواب آپ کو بعد میں ملے اور ثواب کی لذت سے آشنا ہونے سے پہلے عذاب کی وادیوں سے گزرنا پڑے اور پہلے جہنم میں ایک عرصہ قیام کرنا پڑے۔

اسی طرح فعل حرام کرنے کا گناہ اور شرعی محرمات کا ارتکاب اپنے مقام پر گناہ کبیرہ اور موجب عذاب خداوندی ہے۔ مجالس و ماتم اور دوسرے مستحبی امور بجالانے سے فعل حرام کا گناہ معاف نہیں ہو سکتا اور نہ ان کی عقوبت ٹل سکتی ہے۔ سوائے سچی توبہ اور گذشتہ نقصان کی تلافی کے مثلاً ایک زانی، شرابی، چور اگر عزاداری کرتا ہے۔ گریہ و ماتم کرتا ہے یا مجلس و جلوس کا اہتمام کرتا ہے اور یہ سچے دل اور خلوص نیت کے ساتھ کرتا ہے تو اس کا ثواب اسے ملے گا۔ مگر ان شرعی جرموں کی سزا بھگتنے کے بعد کیونکہ ان امور خیر کے بجالانے سے حرام امور کے ارتکاب کی سزا معاف نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے مقام پر برقرار رہے گی۔ فرائض کی ادائیگی اور حرام سے پرہیز کو تمام مستحبی امور اور دوسرے نیک کاموں پر تقدم اور اہمیت حاصل ہے۔

ہمارے مومن بھائی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ مجلس و ماتم برپا کر لینے سے شرعی ذمہ داریوں اور اسلامی احکام کی ادائیگی سے ہمیں چھٹی مل جائے

اور حرام امور ہمارے لئے حلال ہو جائیں گے۔ بس مجلس کرلی اور پیٹ لیا۔ پھر آزادی ہے جو چاہیں کریں کوئی گرفت نہیں اور آخرت میں کوئی سزا نہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس کے پھیلانے والے دین اور شرع کے دشمن ہیں۔ علاوہ ازیں دانستہ یا نادانستہ وہ خود مومنین کے بھی شدید دشمن ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور دشمنی کیا ہو سکتی ہے۔ کہ ایک انسان کو غضب خدا کا حق دار اور جہنم کا سزاوار بنا دیا جائے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اُمت جد کے نجات دہندہ ہیں کس معنی میں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب امام حسین علیہ السلام اپنے نانا کی امت کو نجات دلانے والے ہیں لیکن کیا اس معنی میں؟ کہ جس طرح عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ صلیب پر چڑھ کر اپنی امت کے گناہوں کا کفارہ ہو گئے۔ اور اب عیسائی جتنے ہی گناہ کریں انہیں اس کی پاداش نہیں ملے گی۔ اسی طرح حضرت امام حسین علیہ السلام شہادت پا کر اپنے شیعوں کے گناہوں کا کفارہ ہو گئے ہیں۔ لہذا شیعہ کتنے ہی گناہ کریں باز پرس سے مامون رہیں گے۔ یہ معنی اور یہ مطلب نہایت ہی غلط خلافِ عقل اور خلاف قرآن و حدیث ہے۔ جس طرح کہ عیسائیوں کا قول مردود اور غلط ہے۔

نجات دہندہ کا یہ معنی مراد لینا امام حسین علیہ السلام کی ذاتِ مقدس پر ایک حملہ ہے کہ امام پاک شہید ہو کر گناہوں کا دروازہ کھول گئے۔ گناہوں کو گویا مباح کر گئے اور مجرموں کی حوصلہ افزائی کر کے گناہوں کی رفتار بڑھا گئے۔ گویا ایک ہادی اسلام اور امام امت گناہوں کے گھٹانے کی جگہ بڑھانے کا اقدام کر گئے۔ اور مجرموں کے پست پناہ بنے۔

گویا اب شیعہ جتنے گناہ کرتے ہیں۔ اس حوصلہ پر کرتے ہیں کہ امام پاک ہمیں اس کی سزا سے بچالیں گے۔ جس طرح کہ چور اپنے پشت پناہ رسہ گیروں کے بھروسہ پر چوری کرتے ہیں اور وہ رسہ گیر اپنے اثر و رسوخ اور دیگر وسائل کی کی بنیاد پر اپنے کارکن چوروں کو قانون کے پنجوں سے چھڑا لیتے ہیں۔ گویا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی معرفت ہم نے یہی حاصل کی ہے کہ وہ ایک شہید اعظم اور (معاذ اللہ) مجرموں کے بہت بڑے پشت پناہ اور گناہ گاروں کی حوصلہ افزائی کرنے والے ہیں۔ لہذا گناہ کرلو امام پاک چھڑا لیں گے۔

یہ امام معصوم کی معرفت ہم نے حاصل کی اور مقصد شہادت تو گویا یہ ہوا کہ گناہ اب گناہ نہیں رہا۔ ان کے شیعوں اور رونے والوں کے لئے تمام گناہ جائز ہو گئے ہیں۔ جتنے چاہیں گناہ کریں۔ اللہ کی نافرمانیاں کریں حقوق اللہ تلف اور حقوق عباد ضائع کریں۔ زمین میں فتنہ و فساد پھیلائیں چوری جوا شراب زنا قتل کریں۔ بس اور بس۔ سینہ کوبی کرلیں، سیاہ لباس پہن لیں۔ سب گناہ معاف۔ تو گویا شریعت کی انہیں کوئی ضرورت نہیں (معاذ اللہ) ان کی شہادت کے ساتھ ساتھ شریعت بھی ختم ہو گئی۔ حلال و حرام کا تصور بھی ختم ہو گیا۔ رونے والوں اور پیٹنے والوں کے لئے سب پابندیاں ختم ہو گئیں آزادی ہی آزادی ہے۔

اس قسم کا خیال رکھنے والے شیعہ اور اس قسم کا بیان کرنے والے ذاکر و مولوی اس مقصد کے قائل ہیں جس کے لئے امام پاک نے شہادت پائی۔
ایک قاتل ہے بدن حسین اور نفس حسین کا وہ یزید ہے ابن زیاد ہے ابن سعد ہے شمر سنان خولی وغیرہ ہے۔ جنہوں نے جسم اقدس اور نفس پاک پر تیر و تلواریں چلائیں اور دوسری قسم کے وہ قاتل ہیں جو مقصد حسین علیہ السلام کے قاتل ہیں۔

مقصد شہادت تو گناہوں کو روکنا، نیکیوں کا پھیلانا شریعت کا زندہ

رکھنا اور دین کی بقا تھا اور ان خود غرض دین فروش لوگوں نے دنیاوی لالچ
کی خاطر نادان اور بے وقوف شیعوں کو خوش کرنے کے لئے مقصد شہادت کو قتل
کر کے رکھ دیا۔ ان لوگوں نے مقصد شہادت پر ضربیں چلائیں اور مستورات بنی
ہاشم کی قید و بند کی غرض اور ان کی اسیرانہ قربانیوں کو ضائع و برباد کرنیکی مذموم
وناکام کوششیں کیں۔ اور مقصد شہادت کو الٹا کے پیش کیا۔

امام حسین علیہ السلام اس معنی میں جد پاک کی امت کے نجات دہندہ ہیں
کہ وہ صراطِ مستقیم جس پر چل کر انسان عذاب خدا سے نجات حاصل کر سکتا ہے
اور اپنے خالق و مالک کی رضا و خوشنودی خرید سکتا ہے۔ اس صراطِ مستقیم کو یزید
اپنی لادین پالیسی سے مٹانا چاہتا تھا۔ دین اسلام جو انسانیت کی قدروں کو
اجاگر کرنے کے لئے آیا تھا یزید اسے منہدم کرنا چاہتا تھا۔ انسان کی اور انسانیت
کی نجات اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے میں تھی۔ یزید محو کرنا چاہتا تھا اگر
وہ یزید کی مذموم کوششوں سے ختم ہو جاتا تو انسان کی نجات کی راہ ناپید
ہو جاتی۔ لیکن امام حسین علیہ السلام نے اس راہ کو برقرار رکھنے اور نجات کے راستہ
کو روشن رکھنے کے لئے اپنی قربانی کی شمع جلائی۔ جس کی روشنی میں سالک
جادۂ نجات کو کوئی دشواری نہیں رہی۔ شہادتِ معصوم کے فانوس نے یزید کے
حملہ اور منصوبے کو ناکام بنا کر انسان کو نجات کی راہ اور منزل سے آشنا کر دیا
اب نجات اس راہ پر چلنے اور منزل کی طرف بڑھنے میں ہے۔ وہ نجات کی راہ
دین اسلام ہے۔ جس کے اصول کو ماننے اور فروع پر عمل کرنے کی صورت میں
نجات ہے۔

چونکہ امام حسین علیہ السلام نے اپنے اور اپنے رفقار کی شہادت اور اپنی
مستورات کی اسیری سے یزید کے ناپاک منصوبوں سے دین اسلام اور اس کی تعلیمات
کو محفوظ رکھا ہے اور نجات کے راستہ کو یزیدی یلغار سے بچا لیا ہے۔ اس معنی
میں امام حسین علیہ السلام امت کے نجات دہندہ اور اس کے محسن ہیں ہر مسلمان

امام پاک کی اس کامیاب محنت کا ممنون ہے۔

یہ معنی ہرگز نہ مراد لیا جائے کہ امام پاک شہید ہو کر امت کو عمل صالح کی پابندی اور حرام سے بچنے کی ضرورت سے آزاد کر گئے ہیں۔ خدانخواستہ خدانخواستہ اگر یہ مطلب مراد لیا تو اس سے تو خود یزید کا مقصد پورا ہو گیا کہ گناہ عام ہو جائے اور مقصد حسین پائمال ہو جائیں۔

ہاں انسان گنہگار ہے گناہ اس سے سرزد ہو جایا کرتا ہے، مگر گنہگار انسان گناہ کو گناہ سمجھے اور پھر اس پر پشیمان ہو اور اس سے تائب ہونے کا پختہ ارادہ کرے تو معافی کا امکان ہے۔ لیکن یہ سمجھ کر گناہ کرے کہ گناہ ہی نہیں یا بے پرواہی سے یہ کہہ کر کے گناہ کرے کہ چلو کیا ہے گناہ کرلیں۔ امام حسین علیہ السلام بخشوا دیں گے تو وہ گناہ ناقابلِ معافی ہے اور مستوجب سزا ہے۔

کیا حضرت علی علیہ السلام کی ولادت سے قبلہ کعبہ بنا؟

عام طور پر سٹیجوں پر بیان کیا جاتا ہے کہ کعبہ حضرت علی کی ولادت باسعادت کی وجہ سے قبلہ بنا گویا اگر جناب امیرالمومنین کعبہ میں پیدا نہ ہوتے تو کعبہ کو قبلہ بننا نصیب نہ ہوتا۔ یہ ان اغلاط عامہ میں سے ایک غلط بیانی ہے جو غیر ذمہ دار سٹیج سے نشر ہوتی ہیں۔ ہم اس کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب امیرالمومنین کی ولادت باسعادت، خانۂ کعبہ میں ہوئی اور یہ جناب امیر علیہ السلام کی امتیازی خاصیت ہے اور مخصوص شرف ہے۔ اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ جناب امیر علیہ السلام کعبہ سے افضل اور بلند مرتبہ رکھتے ہیں لیکن یہ کہنا کہ کعبہ جناب امیر علیہ السلام کی ولادت سے قبلہ بنا حقیقت نہیں نہ ثابت ہو سکتا ہے۔

کعبہ کا وجود روئے زمین پر حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ آیا۔ جب

حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اُترے تو انہوں نے استدعا کی کہ پروردگارا ! میں
کس جانب رُخ کر کے تیری عبادت کروں۔ اس وقت جناب جبرئیل نے نزول
فرمایا اور ایک کوٹھے کا چاروں طرف سے خط کھینچا۔ اس مقام پر حضرت آدم نے
ایک کوٹھا تیار کیا جس کا کعبہ نام ہوا۔

بلکہ یوں کہئے کہ قبلہ
ہونے کے لئے ہی وجود میں آیا۔ بعدازاں یہ انبیاء علیہم السلام کا مدتوں قبلہ رہا
پھر حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں طوفان کے وقت اسے آسمانوں پر اٹھا
لیا گیا۔ دوبارہ اسی مقام پر حضرت ابراہیم خلیل اور حضرت اسمٰعیل ذبیح علیہما
السلام نے اس کی بنیاد رکھی اور اسے مکمل کمرہ کی شکل میں تیار کیا جیسا کہ قرآن
مجید میں کئی مقام پر اس کی وضاحت آئی ہے اس کو یہ شرف رہا کہ بنی آدم
کا قبلہ رہا اور طواف اس کے گرد ہوتا رہا اور حج کے ارکان بھی اسی مقام پر
ادا ہوتے رہے۔

فلسطین کی سرزمین میں بیت المقدس تعمیر کیا گیا جو انبیاء بنی اسرائیل کا
قبلہ رہا۔ بہت سے نبی اس کی جانب منہ کر کے عبادت خدا کرتے رہے۔
جناب امیرالمومنین علیہ السلام کی جب خانہ کعبہ میں ولادت ہوئی تو اس
وقت جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر کم و بیش تیس سال تھی۔
اور چالیس سال کی عمر میں حضور پاک نے نبوت کا ادعا اور رسالت کا اظہار کیا۔
اس وقت امیرالمومنین کی عمر کم و بیش دس سال اور بروایتے تیرہ سال تھی۔
اظہار نبوت کے بعد حضور پاک تیرہ سال مکہ میں رہے اور بیت المقدس
کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ بیت اللہ میں اس وقت بت بھی موجود
رہے۔ اور تیرہ سال جب کہ جناب امیر علیہ السلام کی ولادت کی وجہ سے کعبہ قبلہ
بنا ہوتا تو بعد از دعویٰ نبوت تیرہ سال بیت المقدس قبلہ کیوں بنا رہا؟ گویا
جناب امیر علیہ السلام کی ولادت کے بعد بھی تیرہ سال بیت المقدس قبلہ بنا رہا۔

یعنی جب تک حضور مکہ میں موجود رہے۔ کعبہ قبلہ نہیں تھا بلکہ بیت المقدس تھا۔

حضور پاک نے جب مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو اس وقت آپکی خواہش ہوئی کہ کعبہ قبلہ ہو۔ اس کی دو وجہیں: ۱۔ مکہ میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے سے کعبہ کی طرف پشت نہیں ہوتی تھی۔ مدینہ میں آئے تو کعبہ پس پشت ہو جاتا تھا۔ کیونکہ مدینہ مکہ سے شمال مغرب کی جانب ہے اور بیت المقدس مدینہ سے مغرب کی طرف واقع ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ کعبہ دوبارہ حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا تیار کردہ تھا جو حضور پاک کے جد امجد ہیں اور خود حضور پاک ملت ابراہیمی کے پابند تھے اور اسی دین پر قائم تھے۔ دین خلیل اور ملت ابراہیم کا پابند ہونے اور ان کی نسل پاک سے ہونے کی وجہ سے ان کی ذاتی تمنا یہ تھی کہ میرے جد امجد ابراہیم کا قبلہ میرا بھی قبلہ قرار پائے۔ جس طرح قرآن مجید میں واقع ہے۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ

(پ۲۔ س بقرہ آیت ۱۴۴)

اے رسول قبلہ بدلنے کے واسطے بے شک تمہارا بار بار آسمان کی طرف منہ کرنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ تو ہم ضرور تم کو ایسے قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو آپ پسند کرتے ہیں اچھا تو (نماز ہی میں) تم مسجد حرام (کعبہ) کی طرف منہ پھیر لو۔ اور اے مسلمانو! تم جہاں کہیں ہو اسی (کعبہ) کی طرف منہ کر لیا کرو۔

قرآن پاک کے اس مقام پر متعدد آیات کعبہ کے قبلہ بنانے کی وضاحت کر رہی ہیں۔ صاحبانِ حاجت اس طرف رجوع کریں۔

پس ثابت ہوا کہ کعبہ کو قبلہ بنانے میں حضور کی ذاتی خواہش اور جد امجد کی یادگار کی حرمت کو برقرار رکھنا ہے۔

اگر ولادت علی علیہ السلام کعبہ کے قبلہ بننے کا سبب ہوتی تو مکہ میں پہلی نماز ہی میں کعبہ قبلہ مقرر ہوتا۔ کعبہ ہر حال میں حرم اور مقدس مقام ہے۔ خواہ بت اس میں کیوں نہ رکھے رہیں۔ جناب امیر کی ولادت کے وقت بھی بت اس میں موجود تھے۔ مکہ میں تیرہ سال حضور پاک رہے بت خانہ کعبہ میں بدستور موجود رہے۔ یہ تو فتح مکہ کے وقت آٹھ ہجری میں کعبہ بتوں سے پاک ہوا۔ اگر کعبہ بت خانہ بنا رہا تو اس کے حقیقی تقدس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خدا نخواستہ اگر اس وقت کعبہ غیر مقدس تھا۔ بت خانہ تھا۔ معاذ اللہ۔ خرابہ تھا تو جناب امیرالمومنین علیہ السلام کو ایسی جگہ پیدا ہونے سے کیا فضیلت ملی اور کیا شرف ملا۔

مقامِ ولادت میں نماز ہو جاتی ہے

عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ جس کمرہ میں کسی بچے کی پیدائش ہوتی ہے اس میں نماز نہیں ہوتی۔ اس کمرہ کا فرش دھلوایا جاتا ہے بلکہ اس کا فرش اکھاڑا جاتا ہے اور نیا فرش بنوایا جاتا ہے۔

یہ ساری بات غلط ہے۔ اس کمرے میں نماز ہو جاتی ہے۔ فرش اکھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اگر فرش پر نجاست نہ لگی ہوئی ہو تو فرش دھونے کی ضرورت بھی نہیں بغیر دھوئے بھی نماز صحیح ہے۔

نادِ علی کی سند

نادِ علی ایک رباعی ہے۔ جو جناب پیغمبر اسلام یا کسی امام کی بنائی ہوئی نہیں ان کی طرف اس کی نسبت غلط ہے۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جنگ خیبر میں جو چھ ہجری میں خیبر کی سرزمین پر واقع ہوا تھا۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کی متواتر ناکامیوں پر جناب امیر علیہ السلام کو بلایا تھا جو مدینہ میں رہ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا تھا کہ اس جنگ کو

فتح کرنے کے لئے علی کو مدینہ سے بلاؤ یہ حکم ملا تھا:۔

نَادِ عَلِیًّا مَظْهَرَ الْعَجَائِبِ تَجِدْهُ عَوْنًا لَّكَ فِي النَّوَائِبِ
كُلُّ هَمٍّ وَّ غَمٍّ سَيَنْجَلِي بِعَلِيٍّ بِعَلِيٍّ بِعَلِيٍّ

اس رباعی کا شانِ نزول بھی غلط ہے۔ کیونکہ جناب امیر علیہ السلام مدینہ میں نہیں رہ گئے تھے بلکہ حضور نبی پاکؐ کے ہمراہ ابتدا ہی سے مدینہ پاک سے آئے تھے اور آغاز ہی سے اسلامی فوج میں شامل تھے۔ مدینہ سے بلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی معتبر کتاب سے اس عوامی مغالطہ کی تصدیق نہیں ہوتی۔

ویسے تبرکاً اس رباعی کے پڑھ لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ نام علی بابرکت ہے۔ ویسے ہر معصوم کا نام بابرکت ہے۔ لیکن نادِ علی کی رباعی، کسی معصوم کی فرمائی ہوئی نہیں نہ اس کا کسی واقعہ کے ساتھ تعلق ہے۔ اور اس کے خواص و اثرات بھی کسی امام معصوم کے بیان کردہ نہیں۔

پردہ

پردہ مذہب اسلام میں واجب ہے اور ہر ایک مسلم مرد اور مسلمہ عورت پر یکساں حیثیت سے ہے۔ اس میں سادات کے لئے کوئی خاص رعایت نہیں۔ اس معنی میں کہ غیر سید عورتیں سادات مردوں سے پردہ نہ کریں۔ ایک بالغ عورت کے لئے ہر اس بالغ یا باسمجھ لڑکے سے پردہ واجب ہے۔ جس کے ساتھ اس کا نکاح ہو سکتا ہے۔ وہ مرد سید ہو یا غیر سید۔

بعض جاہل کہتے ہیں کہ چونکہ سادات کرام ہمارے باپ کی طرح ہیں۔ اس واسطے ان سے پردہ کیوں کیا جائے۔ یہ ان کی غلط فہمی اور مذہب سے لاعلمی ہے۔ سادات کرام بے شک قابلِ احترام ہیں اگر ان کا عمل صالح ہو تو انہیں بہت بڑی عزت حاصل ہے۔ مگر حقیقی باپ کے احکام ان پر جاری نہیں ہو سکتے اگر ان کو حقیقی باپ کا مقام دیا جائے تو غیر سید تمام عورتیں ان کی بیٹیاں بن

جائیں گی اور ان پر حرام ہو جائیں گی۔ ان کے ساتھ نکاح قطعاً حرام ہو جائے گا۔ حالانکہ اکثر سادات کرام کے گھروں میں غیر سید عورتیں ان کی منکوحہ بیویاں ہیں اور شرعاً ان کے ساتھ نکاح جائز ہے۔

اس سلسلہ میں خود سادات کرام کو اس مسئلہ کا علم ہونا چاہیئے اور خود انہیں اپنے مریدانِ باصفا کو بتا کر شرعی حکم پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے۔ ایک ذاتی عزت اور شان کے لئے شرعی حکم کو چھپانا یا بدلنا نہ چاہیئے۔

تکلیف شرعی

احکام شرعیہ ہر بالغ مرد اور عورت پر واجب ہیں۔ اس وجوب میں اپنی امت کے ساتھ انبیاء و ائمہ علیہم السلام بھی شامل ہیں۔ جس طرح کہ امت ان احکام کی مکلف ہے۔ اسی طرح نبی و امام بھی مکلف ہے۔ کوئی پیغمبر و امام اس تکلیف شرعی سے مستثنیٰ اور ان احکام کی پابندی سے آزاد نہیں۔ بلکہ نبی اور امام ان احکام کے دوہرے پابند ہیں۔ ایک بالغ و عاقل عبد خدا ہونے کی حیثیت سے اور ایک رہنما و ہادی کے لحاظ سے کہ چونکہ ان کا عمل حجت ہے۔ لوگوں کو زبان سے بھی سمجھانا ہوتا ہے اور عمل سے بھی سمجھانا مقصود ہوتا ہے۔ تاکہ امت احکام سمجھنے میں کسی غلط فہمی یا کسی شک میں مبتلا نہ رہ جائے۔ حکم خدا ان کے سامنے صاف صورت میں واضح ہو جائے۔ اس واسطے عملی نمونہ ہر ہادی نے پیش کیا ہے۔

لیکن بعض حضرات اس مقام پر اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام اپنی امت کو تعلیم دینے مثال پیش کرنے اور عملی نمونہ دینے کے لئے ان احکام پر عمل کرتے ہیں خود انہیں ان احکام کی پابندی کی ضرورت نہیں ان پر کوئی شے فرض نہیں۔ نماز روزہ اور دوسرے احکام شرعیہ ان کے لئے بذات خود ضروری نہیں وہ ان پابندیوں سے آزاد ہیں۔ صرف لوگوں کو دکھانے کے

لئے ان احکام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

احکام شرعیہ تکلیفیہ کا عینی وجوب بحیثیت ایک عاقل بالغ رشید مرد کے ہے عبد پر معبود کی اطاعت فرض ہے۔ اور اس میں انبیاء و ائمہ علیہم السلام بھی شامل ہیں۔ احکام شرعیہ کے واجب ہونے اور تکلیف الہٰی سے مکلف ہونے میں ان کی توہین نہیں ہے۔ ورنہ ان احکام کی بجا آوری کی جزا سے وہ محروم سمجھے جائیں گے۔ تکلیف و مشقت دنیا اجر آخرت کا سبب ہے۔ اگر امت کو دکھانے کے لئے یہ حضرات معصومین امور عبادت وغیرہا ادا کرتے تو رات کی تاریکی اور گوشہ تنہائی میں پہروں بھر مصروف عبادت نہ رہتے بلکہ امت کو دکھانے کے لئے تو یہ حضرات کم عبادت کرتے تھے امت سے پس پردہ ان کی عبادت طویل ہوتی تھی۔ امت محو خواب ہوتی اور یہ راتوں کو جاگ کر تقرب معبود کی لذت سے محظوظ ہوتے۔ اسی طرح عام لوگوں کی طرح صرف ماہ رمضان کے روزے رکھتے حالانکہ ان کے روزے سال کے اکثر دنوں میں رہتے۔

سکون کے عالم میں قلبی لگاؤ اور خصوصی توجہ کے ساتھ دنیا وما فیہا سے بے تعلق ہو کر رکوع و سجود کے ذریعہ قرب الہٰی کا شرف حاصل کرتے۔ حرم کی پاک سرزمین ان کی مقدس جبینوں کا استقبال کرتی اور خاموش فضا ان کی تکبیروں کا شمار کرتی۔

روایت میں ہے کہ ایک دفعہ کسی صحابی نے جناب امیر علیہ السلام کے طولانی سجدہ کو دیکھا اسے خیال گزرا کہ شاید ابوالحسن حالت سجدہ میں وفات پا گئے ہیں دوڑتا ہوا عصمت سرا میں آیا اور آ کر خبر وفات سنائی۔ گھر سے جواب ملا کہ تو نے حسنین کے بابا کا یہ سجدہ پہلی بار دیکھا ہے۔ گھر میں ایسے سجدے ہم نے کئی بار دیکھے ہیں۔ جناب امیر نے انتقال نہیں فرمایا۔ قرب معبود کے مزہ میں سجدہ کو طول دیا ہے۔ جب وہ صحابی واپس گیا تو اس وقت ابوالحسن سجدہ سے سر اٹھا چکے تھے۔

جس قدر عرفان اور قرب خدا ہوتا ہے اتنا ہی ذوقِ عبادت اور جتنا احساسِ عظمت اتنا ہی خوف ہوتا ہے۔ چونکہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام کو قرب خدا اور اس کی عظمت کا احساس اور لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس واسطے ان میں ذوقِ عبادت اور خدا کا خوف بھی دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی واسطے وضو کرتے وقت ان کا چہرہ زرد ہو جاتا تھا اور حالتِ نماز میں بدن خوف سے تھرتھراتا تھا دل میں خشیت اور آنکھوں میں رقت طاری ہو جاتی تھی۔

احکام الٰہی کی پابندی ہی ہر شخص کا اس کی نوعیت کے اعتبار سے مرتبہ بڑھاتی ہے۔ اور اسے مستوجب جزا قرار دیتی ہے۔ اسی طرح انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے مراتب کمال اور درجات علیا ان احکام شرعیہ اور عبادت و طاعت سے بڑھتے ہیں۔ آپ تاریخ و سیر کا مطالعہ کریں تو آپ کو ہماری باتوں کا یقین ہو جائے گا۔ مزید تسلی کے لئے جناب امیر علیہ السلام کا وہ وصیت نامہ ملاحظہ فرمائیں جو آپ نے وقت شہادت وصال سے قبل جناب امام حسن علیہ السلام کو دیا۔ اگر مزید اضافہ چاہتے تو قرآن مجید کی چند آیات پیش کئے دیتا ہوں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ : یَا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ نِصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۝

اے کملی اوڑھنے والے پیغمبر! رات کو عبادت کے لئے اٹھا کر، آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ اور قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھا کر۔ سورہ مزمل ابتدائی آیات۔

لَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (پ ۲۴۔ س زمر۔ آیت ۶۵)

بے شک تیری اور تجھ سے پہلے نبیوں کی طرف وحی کی گئی کہ اگر تو نے بھی شرک کیا تو تیرا عمل بھی ضائع و اکارت ہو جائے گا۔ اور یقیناً تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (سورہ طٰہٰ آیت ۱۳۲)

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ (س مریم آیت ۶۶)

پس اس کی عبادت کر اور پابندی کے ساتھ کر۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (س نحل آخر آیت)

موت آنے تک اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو۔

وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ (س ہود۔ آیت ۱۱۴)

اے رسول دن کے دونوں کناروں اور کچھ رات گئے نماز پڑھا کرو۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ (سورہ اعراف آیت ۲۰۵)

اپنے رب کو جی ہی جی میں گڑگڑا کے اور ڈر ڈر کے یاد کرو چیخ کے نہیں دھیمی آواز سے صبح و شام یاد کیا کرو اور غافلین میں سے نہ ہو جاؤ۔

قُلْ إِنِّيْ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (سورہ انعام آیت ۱۵)

اے پیغمبر! تم کہو کہ اگر میں نافرمانی کروں اپنے رب کی تو بڑے اور سخت دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

عمل کی اہمیت

اسلام میں دو چیزوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ دونوں چیزیں جب موجود ہوں تو اسلام عملی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اور ان کے بغیر اسلام صرف زبانی نعرہ رہ جاتا ہے۔

ایک تقویٰ اور دوسرا عمل صالح۔ یہ دونوں اسلام کے بنیادی حصے ہیں۔ تقویٰ کا اصل مادہ و ق ی وَقِيَ۔ اس کا معنی ہے اپنے آپ کو بچانا۔ ثلاثی مجرد کا یہ سہ حرفی مادہ جب ثلاثی مزید فیہ کے باب افتعال میں ڈھل جاتا ہے

تو لفظ اِذْتِقَائِیْ میں بدل جاتا ہے۔ حرفی قانون تعلیل کے مطابق اس کے حرفوں میں تبدیلیاں ہو جاتی ہیں اور لفظ "اِتِّقَاء" بن جاتا ہے۔ یہ باب افتعال کا مصدر ہے۔ جس کا معنی وہی ہے یعنی بچنا۔ ہاں مجرد میں تھا تو متعدی معنی رکھتا تھا اور مزید فیہ میں آیا لازم ہو گیا۔ خلاصہ یہ کہ اپنے آپ کو برائی سے بچانا یا خود برائی سے بچنا، اس کا معنی ہے۔ اسی سے حاصل مصدر آتا ہے: "تَقْوٰی" اس کا جامع مطلب ہے اپنی زبان اعضاء نیت اور خیال کو بُرائی سے محفوظ رکھنا۔ یہ اسلام کا سلبی پہلو ہے۔ اور ابتدائی امر ہے۔ اس مصدر اتقاء سے اسم فاعل آتا ہے۔ "مُتَّقِیْ" ہر ناپسندیدہ امر سے الگ رہنے والا۔ برائی سے دور رہنے والا۔ ناراضگیٔ خدا سے بچنے والا۔

۲۔ عمل صالح: نیک کام، پسندیدۂ خدا کام، ہر وہ کام جس میں مخلوق خدا کو فائدہ نوعِ انسانیت کو ترقی اور عمل کرنے والے کو آخرت میں اجر و ثواب ملے، عمل صالح ہے۔

یہ دونوں امر ایک عبدِ خدا کے لئے ضروری ہیں۔ ان میں سے ایک کا نفی اور سلب سے تعلق ہے وہ ہے "تقویٰ" دوسرے کا وجود اور اثبات سے وُہ ہے عمل صالح پہلا پہلو بیزاری اور اجتناب کا ہے۔ دوسرا ایجاد و اثبات کا۔

جس طرح اسلام کے بنیادی عقیدۂ توحید کے کلمہ میں نفی و اثبات کے دو پہلو مدنظر رکھے گئے ہیں۔ برائی سے نفرت و برأت اور نیکی سے محبت و تمسک۔

خدائے برحق کا اقرار اسی وقت فائدہ دے سکتا ہے۔ جب باطل معبودوں کا انکار پہلے کیا جا چکا ہو۔ ورنہ بتوں کی خدائی تسلیم کرنے سے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔

اسی طرح غصبی مال اور چوری کی رقم سے فی سبیل اللہ خیرات کا کوئی فائدہ نہیں۔ زانی شرابی اور لواطہ کرنے والے کو مجلس برپا کرنے یا ماتم سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان مستحبی امور کے ثواب سے امور بد کا عذاب ٹل نہیں سکتا

اور ارتکاب حرام کا عذاب اس مستحب کے ثواب سے بہت زیادہ ہے۔

مفید شے کا استعمال فائدہ مند ہو سکتا ہے جب مضر اشیا سے اجتناب ہو یعنی استعمال کے ساتھ اجتناب ہو۔ ایک مریض ازالۂ مرض کے لئے دوائیں استعمال کرتا ہے۔ ان دواؤں سے فائدہ جب حاصل ہو گا جب ڈاکٹر و حکیم کی ہدایت کے مطابق مضر صحت اشیاء سے اجتناب بھی کرے۔ پرہیز نہ کرنے کی صورت میں دوا کا استعمال بے کار ہے۔

اسی طرح تقویٰ نہ ہونے کی صورت میں "عمل صالح" کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ اسیر محن و جفا بیمار کربلا جناب زین العابدین علی ابن الحسین علیہما السلام کا زمانہ ہے۔ ایک شخص نے کسی نانبائی کی دکان سے کچھ روٹیاں چرائیں۔ اور ان میں سے کچھ خیرات کر دیں۔ اسے امام پاک کے پاس لایا گیا۔ جناب امام علیہ السلام نے دریافت فرمایا تو اس نے کہا کہ خدا ایک نیکی کے بدلے دس نیکیوں کی جزا دے گا۔ اور ایک برائی کے مقابلہ میں ایک برائی کی سزا تو اگر میں نے دس روٹیاں چرائی ہیں تو دس روٹیوں کی چوری کی سزا ملے گی۔ جن میں پانچ روٹیاں میں نے خیرات کر دی ہیں۔ پانچ کے عوض پچاس روٹیوں کی جزا بھی تو ملے گی جو پچاس روٹیوں کی جزا کی صورت میں ہو گی۔ ان میں سے دس روٹیوں کی سزا کاٹ لی جائے تو پھر بھی چالیس روٹیوں کی جزا تو باقی ہے۔ معاملہ پھر بھی نفع میں رہا۔

تو امام معصوم جناب سید سجاد علیہ السلام نے فرمایا کہ سزا تو چوری کی یقینی ہے کیونکہ تو نے چوری کی۔ باقی خیرات کا ثواب تجھے اس وقت ملتا جب حلال مال میں سے تو خیرات کرتا۔ حرام مال کی خیرات کا ثواب نہیں ہوتا کیونکہ خدا خود فرماتا ہے کہ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ۔ خدا نذر و نیاز خیرات وغیرہ متقیوں کی قبول فرماتا ہے۔

قرآن مجید میں تقویٰ اور عمل صالح کی اہمیت پر بکثرت آیات دلالت

کرتی ہیں۔ آپ قرآن کا مطالعہ کریں۔ خدا آپ کو اس کی تلاوت اور مطالعہ کرنے
و مفہوم سمجھنے کی توفیق دے۔ قرآن میں کہیں نہ ملے گا کہ جنت کا وعدہ مومنین کیساتھ
ہے۔ بلکہ صرف آیات ہیں کہ جنت کا وعدہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ لہٰذا جنت کا حقدار
بننے کے لئے تقویٰ اختیار کرنا لازم ہے۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى : (سورہ طٰہٰ آیت ۱۳۲) اور نیک انجام تو تقویٰ کا ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ : اے ایمان
والو! تقویٰ اختیار کرو اور صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ : نیک انجام تقویٰ اختیار کرنے والوں کیلئے ہے۔

خَیْرُ الزَّادِ التَّقْوٰى : بہترین سفرخرچ تقویٰ ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ : اس جنت کی مثال جس کا وعدہ
متقیوں کے لئے کیا گیا ہے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ : متقیوں کے واسطے ہی ان کے
رب کے پاس جنت نعیم ہے۔

وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ كَذٰلِكَ یَجْزِی اللّٰهُ الْمُتَّقِیْنَ : بہترین گھر
متقیوں کا ہے جو جنتِ عدن ہے۔ متقی اس میں داخل ہوں گے جن کے نیچے
نہریں بہتی ہیں ان کے لئے وہاں سب کچھ مہیا ہوگا جس کی وہ خواہش کریں
گے اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دے گا۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ فٰكِهِیْنَ بِمَا اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ
عَذَابَ الْجَحِیْمِ : متقی جنت اور نعمتوں میں ہوں گے۔ اپنے رب کے دیئے پر خوش
ہوں گے اور ان کو ان کا رب جحیم کے عذاب سے بچا لے گا۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ : بے شک متقی جنت اور چشموں میں
میں ہوں گے۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ : اور جان لو کہ یقیناً اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔

ان آیات سے بالکل واضح نتیجہ نکلتا ہے کہ جنت میں داخلہ اور جہنم سے نجات تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں اور تقویٰ کا معنی ہے برائیوں سے بچاؤ لہذا کوئی شخص برائیاں ساتھ لے جا کر جنت میں نہیں جا سکتا اور برائیوں کی معافی توبہ کے ساتھ مشروط ہے اور تلافی حقوق لازمی ہے۔ ایک اور جگہ کامیابی مومنین کی مشروط ہے اعمال صالحہ کے ساتھ جیسا کہ اٹھارویں پارہ کی ابتدائی آیات میں مذکور ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ o وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ o وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ o اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ o فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ o وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ o وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ اَلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o

(پ ۱۸ ابتدائی آیات)

مومن کامیاب ہو گئے۔ وہ مومن جو اپنی نمازیں خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتے ہیں جو بیہودگی سے منہ پھیرے رہتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھتے ہیں سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے۔ اور جو لوگ ان کے خواہش کرے وہ حد سے تجاوز کرتے ہیں وہ مومن جو نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں۔ وہی وارث ہیں جو جنت الفردوس کے وارث بنیں گے۔ اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ایک مقام پر متقیوں اور اہل جنت کے یہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَابْنَ السَّبِيْلِ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ

وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔

صرف مشرق اور مغرب کی سمت منہ پھیر لینا نیکی نہیں نیکی یہ ہے۔ اللہ کے ساتھ ایمان۔ روز قیامت پر۔ فرشتوں کے ساتھ۔ آسمانی کتابوں کے ساتھ۔ انبیاء کے ساتھ۔ مال کی تقسیم غریبوں پر یتیموں پر۔ مسکینوں اور مسافروں پر۔ بنی نوع انسان کی خلاصی اور غلامی سے آزادی پر۔ نماز قائم کرنا۔ زکوٰۃ کی ادائیگی وعدہ کرنے پر وعدہ کی پابندی۔ سختی اور مشکلات اور جہاد میں صبر کرنا۔ یہ دس امور ہیں جن پر عمل کرنے والے صادق ہیں اور وہی متقی ہیں۔

حضرات مومنین! ہم نے قرآن مجید کی مذکورہ متعدد آیات سے یہ ثابت کیا ہے کہ جنتی کے لئے ضروری ہے تقویٰ اور عمل صالح ان دونوں سے محروم آدمی کے لئے جنت میں جانا بغیر بدعملی کی سزا بھگتے از روئے قرآن ناممکن ہے۔ لہٰذا مومنین حضرات: تقویٰ اور عمل صالح کو اپنائیں۔

عمل صالح کی اہمیت اور ضرورت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا پیارا فرزند عمل صالح سے محرومی کی وجہ سے طوفان عذاب کی لہروں کی نظر ہوجاتا ہے۔ باپ بھی وہ مبلغ جس نے توحید کے پرچار میں سینکڑوں برس پتھر کھائے اور اس کی تبلیغ سے پھر بھی باز نہ آئے۔ اس پدر مہربان کا یہ نافرمان بیٹا باپ کی آنکھوں کے سامنے طوفانی لہروں کا لقمہ بن گیا۔

باپ اور بیٹے کا مکالمہ قرآن مجید میں مذکور ہے جسے ہم قارئین کی بصیرت وعبرت کے لئے درج کرتے ہیں:

نوح: وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ فِىْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَىَّ ارْكَبْ مَّعَنَا: نوح نے اپنے فرزند کو بلایا جب کہ وہ ان سے الگ تھلگ تھا۔ ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہوجا۔

کنعان: قَالَ سَآوِیْ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ: بابا! میں ایک ایسے پہاڑ پر چڑھ کر پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچالے گا۔

نوح: اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ: پروردگارا! میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے۔

اللہ تعالیٰ: اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ: اے نوح! وہ تیرے اہل سے نہیں کیونکہ اس کا عمل صالح نہیں۔

عمل صالح کے فقدان اور پیغمبر سے نافرمانی نے فرزند کے رشتے کو بے اعتبار کر دیا۔ جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاندانِ عبدالمطلب کے افراد جو کہ حضور پاک کے عزیز رشتہ دار تھے کو جمع کیا اور عمل کی اہمیت جتاتے ہوئے فرمایا: یَا بَنِیْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اِنِّیْ لَآ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا: سنو اے میرے خاص رشتہ دار عزیزو! میں خدا کے مقابلہ میں یعنی تمہاری خدا کی نافرمانی کی صورت میں تمہاری کوئی طرف داری نہ کر سکوں گا۔ یہ نہ خیال کرنا کہ بدعملی اور نافرمانی کی صورت میں پیغمبر کی رشتہ داری کی وجہ سے عذاب خدا سے بچ جائیں گے۔

ایک پیغمبر کے فرزند کا حال آپ نے پڑھ لیا۔ پھر آخری پیغمبر کا اپنے رشتہ داروں سے خطاب بھی آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ اب پیغمبر کی بیویوں کے متعلق ارشادِ قادر پڑھیے، مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ: اے پیغمبر کی بیویو! اگر تم میں سے کوئی بھی گناہ کرے گی، تو اسے دوسروں سے دوگنا سزا دی جائے گی۔

جناب امیرالمومنین علیہ السلام نے جناب عبداللہ ابن عباس گورنر بصرہ کو جو وعید پر مشتمل خط تحریر فرمایا جس میں ذیل کے جملے خاص طور پر قابلِ دید ہیں: لَوْ اَنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ فَعَلَا مِثْلَ الَّذِیْ فَعَلْتَ مَا كَانَ لَهُمَا الَّذِیْ هَوَادَةٌ وَّلَا ظَفِرَا مِنِّیْ بِاِرَادَةٍ حَتّٰی اٰخُذَ الْحَقَّ مِنْهُمَا۔ اگر حسن اور حسین

سے بھی یہ طرز عمل صادر ہوتا جو تم سے ہوا تو میں ان کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہ کرتا یہاں تک کہ ان سے حق کو ضرور حاصل کرتا۔

عمل کے بغیر انتساب بیکار ہے

کسی قسم کا انتساب عمل کے مقابلہ میں قابل فخر نہیں سمجھا جائے گا یہ انتساب وہ ہیں جو ظاہری حیثیت سے انتہائی قوت سحر رکھتے ہیں۔ یعنی کسی کی اولاد ہونا اس کے بعد کسی کا عزیز ہونا، اس کے بعد کسی کا دوست ہونا۔

پہلا درجہ ہے اولاد ہونا، اس کے بعد عزیزوں کا پھر دوستوں کا۔ مقام انتساب یعنی تعلق میں فرزندی کا انتساب یعنی تعلق۔ نظر اعتبار سے گرا دیا گیا۔ عمل کے مقابلہ میں اور رشتہ داری کا انتساب بھی عمل کے مقابلہ میں بیکار ہو گیا۔ تو وہ تعلق اور انتساب جو دوستی کے دعویٰ کی بنا پر ہو وہ کیا وزن رکھتا ہے۔

جناب خالق کریم نے قرآن میں جناب رسول پاک کی زبانی محبت کا معیار بتلا دیا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ: (پ ۳۔ س آل عمران) اے پیغمبر! کہہ دو کہ اگر تم خدا سے محبت کرنا چاہتے ہو، تو میری اتباع کرو، اللہ خود تم سے محبت کرے گا۔ اس جگہ معیار محبت اطاعت اور اتباع کو قرار دیا گیا ہے۔ اگر عمل طاعت ہے تو محبت ہے ورنہ زبانی گپیں ہیں، جو بے سود ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے اصحاب کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: مَنْ اَطَاعَ اللّٰهَ فَهُوَ لَنَا مُحِبٌّ وَمَنْ عَصَى اللّٰهَ فَهُوَ لَنَا عَدُوٌّ جو شخص خدا کی اطاعت کرے وہ ہمارا دوست اور جو خدا کی نافرمانی کرے وہ ہمارا دشمن ہے۔

ایک اور مقام پر معصوم علیہ السلام فرماتے ہیں: شِيْعَتَنَا! كُوْنُوْا لَنَا زَيْنًا وَلَا تَكُوْنُوْا عَلَيْنَا شَيْنًا: ہمارے شیعو! ہمارے لئے باعث نازش بنو

ہمارے لئے سبب ننگ و عار نہ ہو۔

جنگِ صفین میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہے۔ امیرالمومنین درمیان میں مصلیٰ بچھا دیتے ہیں۔ جناب عبداللہ ابن عباس عرض کرتے ہیں کہ یہ تو جنگ کا موقع ہے۔ نماز کا موقع کہاں ہے؟ فرماتے ہیں "اسی نماز کے لئے تو ہم جنگ کر رہے ہیں۔

بیمار کربلا اسیر محن و بلا کثیر البکاء پیکر صبر و رضا امام زین العابدین علیہ السلام کے انتقال کا عالم۔ وفات سے پہلے تمام اعزّا اور احباب کو جمع کیا آخری بات جو زبان سے نکلی تین مرتبہ الصّلوٰۃ۔ الصّلوٰۃ۔ الصّلوٰۃ: یہ ہمارے خاموش امام عبادت گزاروں کی زینت کے وقت وفات آخری الفاظ تھے۔

امام حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا میں اعداء دین اور لشکرِ اشقیا سے صرف ایک رات کی مہلت اس غرض کے لئے طلب کی تھی کہ زندگی کی آخری رات میں، میں اور میرے اصحاب و اہل بیت جی بھر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کر لیں۔ اس سے بڑھ کر عبادت کی اہمیت اور ضرورت کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ اور پھر عزاداروں اور اپنے شیعوں کے لئے کس قدر عبرت کی بات ہے کہ اُن کی محبت کا دم بھریں۔ عزاداری کو قائم کریں لیکن ائمہ علیہم السلام کے مقصد کو بد عملی اور بے عملی سے پائمال کرنے کی کوشش کریں۔

ہمارے نامہ ہائے اعمال حضرت حجت صاحب الزمان عجل اللہ ظہورہٗ کے سامنے پیش ہُوا کرتے ہیں۔ حضرت اس پر نظر فرماتے ہیں۔ اگر اچھے اعمال نظر آئیں تو چہرہ مبارک پر بشاشت ظاہر ہوتی ہے اور اگر بُرے اعمال سامنے آئیں تو معصوم کا چہرہ مبارک پر آنسو ڈھلک آتے اور رنج و ملال کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ ہم اپنے امام کے لئے سبب گریہ و ملال بنیں اور پھر ان کے دوست کہے جائیں؟

عمل صالح پر بقدر ضرورت آیات و احادیث نقل کرنے کے بعد ہم سادات

کرام و مومنین ذوی الاحترام سے یہ گذارش کریں گے کہ وہ نسل رسول پاک ہونے اور محبت کا دعویٰ کرنے کے گھمنڈ میں عمل صالح سے غفلت نہ کریں اور فرائض و سنن کی ادائیگی میں کوتاہی نہ برتیں۔ ورنہ روز محشر آپ مواخذۂ حاکم جبار سے نہ بچ سکیں گے۔ احکام اسلام کے سلسلہ میں آپ سے بازپرس ضرور ہوگی۔ احکم الحاکمین کے سامنے حساب کتاب ضرور ہوگا۔

اگر کوئی واعظ یا ذاکر یا جاہل پیر آپ کو خوش کرنے کے لئے بغیر عمل کے جنت کی بشارت اور دوزخ سے نجات کی خبر سناتا ہے تو وہ آپ کو فریب دیتا ہے۔ فرمان خدائے تعالیٰ اور فرامین معصومین علیہم السلام کے مقابلہ میں ایسے شخص کی خوش گپیوں کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ اپنی دنیا سنوارتا ہے اور آپ کی عاقبت خراب کرتا ہے چونکہ لوگ عموماً سہولت اور تن آسانی کو پسند کرتے ہیں۔ تکلیف اور محنت سے جی چراتے ہیں اس واسطے اس دوست نما دشمن کی چکنی چپڑی باتوں کو قبول کر لیتے اور ایک مخلص اور سچے ہمدرد کی ناصحانہ اور نیک انجام باتوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ آپ عقل و ہوش سے کام لیتے ہوئے ظاہر پر نہ جائیں۔ انجام کو سوچیں اور دوست و دشمن میں تمیز کریں۔ سادات کرام کو عملی ذمہ داری کا احساس زیادہ کرنا چاہیئے۔ غیر سید کی نسبت سید سے گناہوں کا صدور زیادہ قابل اعتراض ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ معصیت الٰہی کا ارتکاب ہے۔ دوسرے اس رشتہ کی توہین ہے جو رسول پاک سے ہے۔ رسول پاک سے نسبت و تعلق رکھنے والا اگر گناہ کرتا ہے تو اس سے گناہ کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ جس طرح گھر میں گناہ کرنے سے اسی گناہ کا وزن بڑھ جاتا ہے جو مسجد میں کیا جائے۔

اگر سید نیک اعمال کی پابندی کرتا ہے تو بے شک اس کا شرف بھی بڑھ جاتا ہے۔

ذاتی عمل

اللہ سبحانہٗ نے ہر انسان کو زندگی کے ساتھ عقل و شعور بخشا اور اختیار کے ساتھ قوت عمل عطا فرمائی ہے۔ نیک و بد، مفید و مضر اسے سمجھا دیا۔ دنیا اور آخرت سے بھی اُسے آگاہ کر دیا ہے۔ انبیاؑ و اوصیاؑ اور اولیاء و علماء کے ذریعہ اپنے احکام اوامر و نواہی اُسے پہنچا دیئے ہیں۔ استطاعت و طاقت بھی مہیا فرما دی اور انسان کو خود عمل کرنے کی تاکید کی۔ عمل وہ انسان کو فائدہ پہنچا سکتا ہے جو اس نے خود کیا ہو۔ استطاعت ہوتے ہوئے خود عمل نہ کرنا اور دوسروں سے کرانا اسلام و شریعت کے ساتھ استہزا ہے۔

بعض لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ استطاعت اور موقع میسر ہوتے ہوئے اختیار و قدرت کے باوجود عمداً احکام خداوندی کو حقیر جانتے ہوئے ٹھکرا دیا جائے۔ اور مرنے کے بعد روپیہ خرچ کر کے اس کے ورثاء نمازیں پڑھوا دیں۔ قیمت دیکر روزے رکھوا لیں اور دو چار ذاکر و واعظ بلوا کر ایصالِ ثواب کی مجلس کروا دیں تو چلو بدعملی و بدکرداری معاف ہو جائے گی اور نماز و روزہ کی باز پرس نہ ہو گی۔ زندگی میں عمل صالح کرنے اور بدکاری سے بچنے کی کیا ضرورت ہے۔ دولت کافی موجود ہے۔ مرنے کے بعد بھی دولت چند حافظوں اور ٹھیکہ داری اور مزدوری پر احکام تکلیفیہ شرعیہ ادا کرنے والوں کو دیدی جائے گی۔ دوزخ سے نجات اور جنت کا پروانہ مل جائے گا۔ گویا کہ دولت مند کو باوجود بدعمل سیاہ کرداری احکام شرعیہ کے ساتھ استہزاء کے اس کی دولت جہنم میں نہ جانے دے گی اور جنت کے باغوں فردوس کے محلوں نعیم کے چشموں ریشمی بستروں اور نکیلوں حوروں کے جھرمٹوں میں پہنچا دے گی۔ اس قسم کی کھلی چھٹی لوگوں کو بدعمل بنا دے گی کہ ان کی دولت ان کی نجات اخروی کی ضمانت دے دیتی ہے۔

لیکن مومنین کرام کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ اس صورت میں کسی غیر کا

عمل خواہ بلا معاوضہ ہو یا با معاوضہ مرنے والے کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ جس نے زندگی بھر باوجود قدرت واختیار اور استطاعت کے خود نیک عمل نہیں کیا۔ فرائض وواجبات ادا نہیں کئے۔ مرنے کے بعد وہی عمل اگر غیر کر کے اس کو بخش دے تو ہرگز قابل قبول اور مفید نہ ہوگا۔ یہ ایک خوش فہمی غلط فہمی اور توہم پرستی ہے۔ عمل وہی اس کو فائدہ پہنچائے گا جو زندگی میں اس نے خود کیا ہو۔ غیر کا عمل کام نہ آئے گا نہ زندگی اور نہ موت کے بعد۔ ہاں چند ایک صورتیں اس سے علیحدہ ہیں۔ مثلاً کوئی شخص خود اعمال صالحہ پر کاربند رہا۔ لیکن بعض مجبوریوں کی بنا پر اس سے فرائض وسنن یا مستحبات ترک ہوگئے ہوں اور ان کے ادا کرنے کی حسرت اور تمنا اس کو رہی ہو جس کا مرنے والے کو احساس اور رنج بھی ہو ان کی ادائیگی کوئی غیر معاوضہ لے کر یا بلا معاوضہ کردے تو اس کا ثواب متوفی کو پہنچ سکتا ہے۔ لیکن خالق رحیم اور مالک کریم نیتوں پر بھی نیک جزا دے دیتا ہے۔ مالدار کو اپنے مال سے تمنا پوری کرائے گا۔ لیکن غریب ومسکین مومن کے رہے ہوئے اعمال کی اس کی نیک نیتی کی بنا پر اپنے عفو وکرم سے کمی پوری کردے گا۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات : اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

درج ذیل آیات اس مدعا کو ثابت کرتی ہیں:-

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَاِنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی : انسان کے لئے کوئی شے مفید نہیں مگر اس کی ذاتی کوشش۔ اور اس کی کوشش و کارگزاری دیکھی جائے گی۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ : اسی کے فائدہ کے لئے جو اس نے خود کمایا اور وہی اس کے خلاف پڑے گا جو اس نے خود کیا۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ : ہر نفس اپنی ہی کوشش کا مرہون منت ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کسی مرنے والے کو اس کی موت کے بعد اس کے ورثاء

کا یا کسی غیر کا کوئی عمل فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اللہ کی رحمت سے یہ بات بعید نہیں لیکن واجبات کی کمی مستحبات سے پوری نہیں ہوتی اور مرنے والے کے پاس کچھ اپنا ذاتی سرمایہ بھی ہونا چاہیئے بالکل تہی دامن انسان اللہ تعالیٰ اور معصومین علیہم السلام کو کیا منہ دکھائے گا اور غیروں سے کیا کچھ پائے گا۔ غیروں کا سہارا چھوڑ دو، بیگانوں کی آس توڑ دو، خود آپ خالق سے رابطہ جوڑ دو، ذاتی سرمایہ اکٹھا کر کے سفر آخرت کے لئے تیاری کرو۔ پرائے عملوں کو نہ دیکھو۔ خود عمل کرو، خود عمل کرو، خود عمل کرو۔

ذکر اللہ

اللہ جل شانہ کا ذکر

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بار بار قرآن میں اپنے بندوں کو اپنے ذکر کا تاکیدی حکم دیا۔ اگر آپ قرآن مجید کا مطالعہ اور تلاوت کریں تو اکثر مقام پر آپ "فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا" "فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ" "يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ" "وَالذَّاكِرِيْنَ لِلّٰهِ" وغیرہ کے جملے ملیں گے۔ جن میں ذکر اللہ کی اور ذکر کرنے والوں کی فضیلت بیان کی گئی۔ بندوں کو ذکر خدا کی ترغیب اور اس سے غفلت پر تہدید کی گئی ہے۔ اور اس ذکر سے بلا واسطہ ذکر مراد لیا گیا ہے ذکر بالواسطہ۔

بالواسطہ و بلا واسطہ: ایک ہے ذکر خدا بلا واسطہ یعنی ڈائرکٹ خدا کا ذکر کرنا۔ جیسے سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اور اس قسم کے وہ تمام جملے جن میں اس کی تسبیح و تقدیس، اس کی بزرگی کبریائی وحدانیت یا اس کے جمال، جلال و کمال ربوبیت الوہیت بلندئ شان وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ نماز میں اور نماز کے بعد تعقیبات

نماز میں اس قسم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور قرآن میں "وَاذْكُرُوا اللّٰهَ" "وَيَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ" سے مراد یہی بلا واسطہ ذکر ہے۔ "اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ" میرے ذکر کے لئے نماز قائم کر۔

بالواسطہ ذکر: بالواسطہ ذکر سے مراد ہے۔ خدائے تعالیٰ کی نشانیوں، مخلوق اس کے خاص بندوں، شعائر اللہ، آیاتِ خداوندی، حسن و جمال مخلوق اور قوت و کمال صنائع قدرت، انبیاء و ائمہ علیہم السلام وغیرہم کا ذکر بالواسطہ طور پر ذکر خدا ہے۔ علوم دینیہ کا پڑھنا پڑھانا۔ مخلوق کے وجود سے خالق کی ہستی کا استدلال اوامر و نواہی تبلیغ و ہدایت وغیرہ نیز ہر وہ چیز جس سے خدا کا وجود ثابت کیا جائے۔ یا خدا کی طرف اس کی نسبت دی جائے۔ وہ بالواسطہ ذکر خدا ہے مگر فوقیت اس ذکر کو ہے جو بلا واسطہ ہے اور وہی افضل عبادت ہے۔ اور نماز دعاؤں اور تعقیبات میں وہی ذکر کیا جاتا ہے۔ اور یہی ذکر انبیاء و اوصیاء، ائمہ و اولیاء عباد صالحین و مخلصین کا معمول رہا۔

گو بالواسطہ ذکر خدا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس سے بلا واسطہ ذکر کی اہمیت ختم نہیں ہو جاتی۔ اور نہ اس کا وجوب اور فرض ہونا ساقط ہو جاتا ہے۔ اس کی اہمیت اور رفعت شان اسے ایک خاص شکل میں وضع کیا گیا ہے۔ اور اس کے لئے طہارت اور وضو لازم قرار دیا گیا ہے، جس کا نام نماز ہے۔ نماز کے لئے تو طہارت بدن و لباس کے علاوہ وضو بھی ضروری ہے۔ لیکن بغیر نماز بلا واسطہ ذکر کے لئے وضو لازم نہیں البتہ بہتر و مستحب ہے۔

اسی طرح عبادت بلا واسطہ بھی ہے اور بالواسطہ بھی یعنی بلا واسطہ ذکر، بلا واسطہ عبادت خدا ہے اور بالواسطہ ذکر بالواسطہ عبادت خدا ہے۔ جو پہلی عبادت سے کم تر عبادت ہے اور جہاں قرآن مجید میں "اُعْبُدُوْا" عبادت کرو "يَعْبُدُوْنَ" عبادت کرتے ہیں۔ وغیرہ۔ عبادت پر مشتمل الفاظ آئے ہیں اُن سے مراد بلا واسطہ عبادت ہے۔

مقام ذکر: اس میں کوئی شک نہیں کہ چہاردہ معصومین علیہم السلام کا ذکر محبت وعقیدت کا تقاضا اور ثبوت ہے بالواسطہ ذکر اور بالواسطہ عبادت بھی ہے۔ لیکن جو مقام بلاواسطہ ذکر کا ہے۔ اگر اس میں بلاواسطہ ذکر خدا کو چھوڑ کر بالواسطہ ذکر کیا جائے تو اس سے عبادت کی مخصوص شکلوں میں تبدیلی ہو جائے گی اور شریعت کی مقررہ کردہ عبادات کی وہ ہیئت اور حد قائم نہ رہ سکے گی۔

جس طرح کہ نماز میں، کوئی شخص اگر اہل بیت علیہم السلام کی مدح کے اشعار اور ان کے ناموں کے اذکار کرتا رہے۔ ان کے تذکرہ اور ان کی فضیلت کی حدیثیں بیان کرنے لگے تو نماز باطل ہو جائے گی اور ذکر اہل بیت علیہم السلام کا ثواب بھی نہ ملے گا۔ شریعت کی حدود شکنی اور احکام خداوندی میں رد و بدل کا گناہ سر پر ہوگا۔

ہر ایک کا اپنا اپنا مقام ہے۔ مقام توحید الگ ہے، مقام نبوت الگ اور مقام امامت و ولایت الگ۔ جو مقام توحید ہے وہ مقام نبوت کو اور جو مقام نبوت ہے وہ مقام خلافت و امامت کو نہیں دیا جا سکتا۔

مقام توحید: نماز یں تمام کی تمام توحیدی مقام ہیں۔ اسی طرح اٹھتے بیٹھتے پہلو بدلتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے کیونکہ یہ مقام ذکر توحید ہے۔ جیسا کہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ: (پ ۴۔ س نساء آیت ۱۰۴) پس جب تم نماز ادا کر چکو تو اٹھتے بیٹھتے اور پہلوؤں پر خدا کا ذکر کرو۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: (پ ۴۔ س آل عمران آیت ۱۹۰) بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں جو کھڑے ہوتے بیٹھتے اور پہلوؤں پر خدا کا ذکر کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بارے غور و فکر کرتے ہیں۔

جس طرح کہ نماز مقام ذکر توحید ہے یہ بنیادی طور پر اور بکثرت ذکر خدا وندی ہے۔ ضمناً اس میں جناب رسالت مآب اور ان کے اوصیاء و اہل بیت علیہم الصلوٰۃ والسلام پر درود وسلام کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ تو اس سے مقام توحید کی توہین نہیں ہوتی اور نہ ذکر خدا کی نفی ہوتی ہے۔

اس طرح اگر اٹھتے بیٹھتے پہلو بدلتے بعد ذکر خدا کے اگر پنجتن پاک علیہم السلام کا نام لیا جائے یا ان کا ذکر کیا جائے تو کوئی حرج نہیں بلکہ ثواب ہے۔ لیکن ذکر خدا کو بالکل چھوڑ کے اور اس سے غافل ہو کر صرف معصومین علیہم السلام کا نام لیا جائے تو یہ مقام توحید کی حق تلفی اور درود وسلام سے تجاوز اور ذکر خدا سے روگردانی ہے۔

بے جا اعتراض اور بجا جواب

ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا رہتا ہے کہ اس موقعہ پر ضرورت سے زیادہ محب اور عام سٹیج کے تربیت یافتہ شیعہ جو بغیر سوچ کے بولنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اور مصلحانِ قوم کو دشمنانِ اہل بیت کے لفظوں سے یاد فرماتے ہیں کہ اٹھیں کہ لو اب نام علی پر پابندی لگ گئی۔ ذکر علی سے روک دیا گیا۔ یہ لوگ دراصل چھپے وہابی ہیں۔ اہل بیت علیہم السلام کے دشمن ہیں ان کا نام لینا سننا گوارا نہیں کرتے۔ اس قسم کے بلکہ اس سے زیادہ بُرے لفظوں سے یاد فرمائیں گے۔ اُن کی خدمت میں گذارش ہے کہ حفظ مقام توحید اور تقدم ذکر خدا کرنا مطابق حکم خدا اور ذکر خدا کی حقیقت بیان کرنے سے اہلِ بیت علیہم السلام کی دشمنی کہاں ثابت ہوتی ہے؟ کیا اہل بیت علیہم السلام توحید کے دشمن ہیں؟ ان کو توحید گوارا نہیں؟ مقام ذکر توحید اہل بیت کی دشمنی کا سبب ہے؟

ان بے چارے سادہ بھولے بھالے شیعوں کو معلوم نہیں کہ توحید تو ہم نے سیکھی ہی اہل بیت علیہم السلام سے ہے۔ انہوں نے ہی توحید پھیلائی ہے دُبی

تو مقام توحید کے رکھوالے اور حب توحید کے متوالے ہیں۔

برادرانِ ملت! دشمنی جب ہوتی جب کلی طور پر ان کے ذکر سے روکا جاتا مطلقاً ان کے نام لینے اور ان کے ذکر پر پابندی لگائی جاتی۔ یہاں تو صرف یہ ذکر ہے کہ اٹھتے بیٹھتے پہلو بدلتے وقت پہلے ذکر توحید کرو اسکے بعد ذکر اہلبیت علیہم السلام کیونکہ توحید کو نبوت اور امامت پر تقدم حاصل ہے۔ اور یہی فرمانِ قرآن ہے۔ اور مسلک و معمول محمد و آلِ محمد علیہم السلام ہے۔ مؤلف کتاب کے نزدیک ذکر اہل بیت علیہم السلام عین عبادت ہے۔ محبت کا نشان ہے۔ تسکین قلب اور راحتِ جان ہے۔ عصائے پیر ہے تیغ جواں ہے حرز طفلاں ہے۔

۲۲ رجب کی نیاز

کسی امام علیہ السلام کی نیاز دینا اور مومنین کو کھلانا ثواب ہے۔ بایں معنی کہ اس امام معصوم کی طرف سے وکیل ہو کر اس کا ثواب ہدیہ امام معصوم کر دیا جائے۔ اور یہ نیاز کسی وقت اور کسی مقام پر دی جا سکتی ہے۔ نہ اس کی مقدار مقرر ہے اور نہ وقت معین البتہ ایام عزا میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے یا مجالس کے بعد جیسا کہ مومنین کرام میں معمول ہے یا اس امام کی ولادت و شہادت کے روز۔

اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام کی نیاز بھی ہر وقت پکائی جا سکتی ہے بائیس رجب کو جو کونڈوں کا اہتمام ہوتا ہے یا خاص مقدار میں پکائی جاتی ہے اور کوئی خاص واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس کی سند اور اس کا حوالہ کسی معتبر کتاب میں مذکور نہیں۔ مطلقاً نیاز امام علیہ السلام کی نیت سے پکا کر کھلائی جائے تاریخ و مکان کی پابندی کسی خاص واقعہ کی یاد میں پکانا اور خاص معجزہ بیان کرنا۔ ایک خود ساختہ مسئلہ ہے۔ نہ کسی امام سے منقول ہے اور نہ تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے۔ البتہ رسم اچھی ہے کہ ہر مومن کو پیٹ بھر کر حلوہ کھانے کا ایک موقع میسر آتا ہے۔ کسی ماہر نفسیات نے یہ رسم اچھی ایجاد کی ہے۔

نیز ۲۲ رجب کو یوم مرگ معاویہ قرار دینا تاریخی تحقیق کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر ۲۲ رجب کو یوم مرگ معاویہ تسلیم کیا جائے تو ۲۸ رجب کو امام حسین علیہ السلام کا مدینہ سے سفر کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ بالفرض ۲۲ رجب کو معاویہ نے انتقال کیا۔ ۲۳ رجب کو یزید نے بیعت کے لئے قاصد مدینہ روانہ کیا۔ تو شام سے مدینہ پہنچنے کے لئے قاصد کو کتنے دن درکار ہوں گے۔ اس زمانہ میں سوائے تیز رو اونٹوں کے اور کوئی ذریعہ قطع مسافت کا نہ تھا۔ ہفتہ عشرہ سے کم دن نہ لگے ہوں گے پھر ولید کا امام حسین علیہ السلام کو بیعت کے لئے طلب کرنا اور امام پاک کا انکار کرکے سفر کا ارادہ کرنا اور تیاری میں کئی دن صرف کرنا کم از کم تین دن تو ضرور ہیں اس لحاظ سے قاصد کو ۲۴ یا ۲۵ رجب کو مدینہ پہنچنا ضروری ہے۔ ۲۳ رجب کو چلا ہوا قاصد دمشق سے ۲۴ رجب کو اونٹ کے ذریعہ مدینہ نہیں پہنچ سکتا۔ تاریخیں ۱۵ رجب کو یوم مرگ معاویہ بتاتی ہیں اور یہ قرین قیاس بھی ہے۔

گرمی کا سفر

(۱۸ جیٹھ کی مخصوصی)

واعظ و ذاکر امام حسین علیہ السلام کی مدینہ سے روانگی گرمیوں میں بیان کرتے ہیں۔ پھر کربلا تک سفر بھی گرمیوں میں جاری رکھتے ہیں۔ پھر کربلا میں قیام اور شہادت بھی گرمی میں پھر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام کا سفر بھی گرمی میں پھر زندان شام میں قیام بھی گرمی اور دھوپ میں۔ کیا اس سارے طویل سفر میں گرمی ہی گرمی رہی۔ کیا حجاز و عراق و شام میں سردی نہیں پڑتی۔ گرمی کا شکوہ تو جا بجا ہے۔ سردی کی تکلیف کا کہیں ذکر نہیں ان ممالک میں سردی کا کبھی موسم نہیں آتا؟

شام کے زندان کے متعلق صرف اتنا ذکر آیا ہے کہ ایسا زندان تھا جو سقف سے خالی تھا۔ دن کو دھوپ اور رات کو اوس ستاتی تھی۔ رات کی اوس

کا تذکرہ کتب میں پایا جاتا ہے۔

جب ہم اس سفر کی مدت شمار کرتے ہیں تو کم از کم آٹھ تو مہینے بنتے ہیں۔ مثلاً ۲۸ رجب کو سفر کا آغاز کیا۔ اور دس محرم کو شہادت پائی۔ تو ۲۸ رجب سے دس محرم تک ۵ ماہ اور کچھ دن بنتے ہیں (دس بارہ دن) تقریباً ساڑھے پانچ ماہ اگر ۱۸ جلیٹھ یا ۱۰ ہاڑ کو شمسی مہینوں کے حساب سے یوم شہادت قرار دیا جائے تو سفر کا آغاز پوہ ماگھ میں ہونا چاہیئے اور یہ ایسے مہینے ہیں کہ عرب ممالک میں بھی ان دنوں شدید سردی پڑتی ہے۔ لہذا سفر کا آغاز شدید سردیوں میں ہوتا ہے۔ لہذا روانگی از مدینہ کے وقت گرمی کا ذکر غلط ہے۔

اور اگر آغاز سفر گرمی کے موسم سے خواہ ابتداء گرمی میں فرض کیا جائے اور ۲۸ رجب سے گرمی کا پہلا مہینہ چیت بیساکھ بھی تصور کیا جائے تو دس محرم تک تقریباً ساڑھے پانچ ماہ بنتے ہیں۔ اس لحاظ سے ۱۰ محرم بھادروں کے مہینے میں آتی ہے۔ جیٹھ اور ہاڑ میں ۱۰ محرم کا آنا بالکل ناممکن ہے۔ لہذا ۱۸ جیٹھ یا دس ہاڑ کو شمسی سال کے حساب سے ۱۰ محرم الحرام قمری مہینے کے مطابق کر کے یوم شہادت امام پاک قرار دینا بالکل غلط ہے۔ عقل و نقل کی تصدیق سے محروم ہے۔ یہ تقوم کا مسئلہ ہے۔ ریاضی دان اسے حل کر سکتے ہیں اور اس فن میں انہی کا قول حجت ہے۔

بعض رسالوں میں میں نے پڑھا ہے ریاضی دانوں نے فن تقویم کی بنا پر ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کی جو تقویم نکالی تو ان کے قول کے مطابق ۶۱ھ کا محرم شمسی مہینے کے حساب سے اکتوبر کا مہینہ بنتا ہے۔ اس لحاظ سے مدینہ سے سفر مئی کے آخر میں ہوتا ہے۔ عرب میں اکتوبر کے مہینہ میں بھی گرمی شدید ہوتی ہے:

واللہ اعلم۔

سنت و بدعت

کڑا و قلابہ

سنت وہ امر ہے جو نبی و امام اپنی خوشی و رضا سے بغیر جبر و اکراہ خود کرے اور کرنے کا حکم دے۔ جو طریقہ خود نبی و امام نے اپنی مرضی سے اپنایا ہے وہی سنت ہے اور امر دین میں داخل ہے اس پر عمل کرنے میں اجر و ثواب ہے لیکن جو کام نبی و امام نے خود نہیں کیا اور نہ کرنے کا حکم دیا اس کام کو سنت سمجھ کے کرنا یا دین کا حکم سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہونا بدعت ہے۔

یہی حال اس کڑے و قلابے کا ہے جو دین و عقل سے محروم شیعہ سنت سجاد علیہ السلام سمجھ کر پہنتے ہیں۔ سنت سجاد جب قرار پاتی جب امام سجاد علیہ السلام اپنی مرضی و رغبت سے خوشنودی خدا اور قربت الی اللہ ثواب سمجھ کر پہنتے یا اپنے شیعوں کو پہننے کا حکم دیتے۔ یہ طوق و بیڑیاں اور ہتھکڑیاں تو ظالموں نے جبر و اکراہ سے زبردستی پہنوائی تھیں۔ اور قید سے رہائی کے بعد نہ امام سجاد نے خود پہنیں اور نہ شیعوں کو حکم دیا اور نہ شیعوں میں ائمہ علیہم السلام کی زندگیوں میں ان کے پہننے کا معمول رہا۔ لہٰذا کڑا قلابہ اور اس قسم کی دوسری چیزیں سنت نہیں بدعت ہیں۔ اور ان کا اس قصد سے پہننا حرام ہے۔

اور اگر آپ لوگ مصر ہیں کہ نبی و امام کا ہر مجبوری فعل جو ظالموں کے تشدد و ستم کے تحت سرزد ہوا ہو سنت قرار پاتا ہے تو انگوروں و کھجوروں میں زہر ملا کر کھا لینا اور مر جانا بھی سنت اور مستورات اہل پردہ کو بازاروں میں برہنہ سر بلا پردہ پھرانا بھی سنت قرار پائے گا۔ مگر سوائے فیشن ایبل اور بے دین لوگوں کے کوئی شریف و غیور شیعہ اسے سنت نہ قرار دے گا اور نہ اس پر عمل کرے گا۔

معصوم صرف چودہ ہیں

اصطلاحِ اسلام میں خصوصاً مذہب شیعہ میں اس شخص کو معصوم کہا جاتا ہے جس کی خلقت میں مشروب عرشی اور اس کے اجزاء ترکیبی میں خاص جوہر شامل ہو تاکہ اسے ہر قسم کے گناہ سے محفوظ اور ہر قسم کی طاعت پر آمادہ رکھے یہ عصمت عطیۂ الٰہیہ ہے جو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اپنے ان بندوں کو بخشتا ہے جنہیں اپنی حجت بنا کر زمین میں بندوں کی ہدایت کے لئے مقرر فرماتا ہے۔ یہ عصمت لازمۂ نبوت و امامت ہے۔ ایسا معصوم نبی و مرسل ہوتا ہے یا امام و حجت خدا ہوتا ہے اس معیار کے معصوم مذہب شیعہ کے مطابق صرف چودہ ہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی کو اس معیار کی عصمت عطا ہو اور وہ امام نہ بنے۔ لہٰذا مذہب شیعہ میں چودہ معصوموں کی جو بندی ہے بالکل صحیح ہے۔ اس کے خلاف جو بھی بولے وہ جاہل مطلق اور مذہب کی اصطلاحات سے ناواقف ہے۔

باقی اہل بیت علیہم السلام میں جتنے صالحین و مخلصین افراد ہیں وہ اس معیار کے معصوم نہیں اگر اس معیار کے برابر کے معصوم ہوتے تو وہ بھی امام ہوتے کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ سبحانہٗ کسی فرد کو اس قسم کی عصمت عطا فرمائے اور نبوت و امامت نہ بخشے بلکہ وہ محفوظ ہیں وہ بھی گناہوں سے محفوظ ہیں۔ انہوں نے زندگی بھر کوئی گناہ نہیں کیا نہ اللہ و رسول کی نافرمانی کی ہے۔ وہ ہر برائی سے محفوظ اور ہر نیک عمل کے پابند رہے۔ مثلاً حضرت عباس، حضرت علی اکبر، حضرت قاسم، حضرت حسن مثنیٰ علیہم السلام وغیرہم۔ حضرت عباس علیہم السلام باوجود قوت جذبات اور رعب و جلال کے حضرت امام حسین علیہ السلام کے مکمل تابع فرمان تھے ان کے فرمان کی فوراً تعمیل کرتے اور اپنے جذبات پر حکم امام سنتے ہی فوراً قابو پالیتے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ امام حسین علیہ السلام کو جناب عباس سے اپنی بات منوانے کے لئے منت سماجت کرنا پڑے۔ یا جناب معصومہ

سکینہ کی سفارش کرانا پڑے۔ یا بازو پکڑ کر روکنے کی کوشش کریں اور زورِ امامت خرچ کرنے کے باوجود حضرت عباس گھسیٹے ہوئے کئی قدم چلے چلیں۔ یہ جناب عباس علیہ السلام کی شانِ اطاعت کے خلاف ہے۔

خمسۂ نجباء پنجتن پاک علیہم السلام

آیتِ تطہیر جن کے حق میں اُتری اور جو چادرِ تطہیر کے نیچے جمع ہوئے تھے وہ ہیں محمد مصطفیٰ، علی مرتضیٰ، فاطمۃ الزہرا، حسن مجتبیٰ، حسین سید الشہداء۔ علیہم التحیۃ والثنار۔ چونکہ یہ پانچ افراد زیرِ کسا تھے اس واسطے انہی کو اردو اور فارسی زبان میں پنجتن پاک اور عربی میں خمسۂ نجبا اور اصحاب کسار کہتے ہیں۔ لہذا یہ اصطلاح بھی صحیح ہے۔

بتول صرف دو ہیں

جو عصمتِ لازمۂ نبوت و امامت ہے وہ اگر کسی عورت کو عطا ہو تو وہ عورت معصومہ بتول اور حجت خدا ہوتی ہے۔ اس کا قول اور عمل زنانِ عالم کے لئے حجت اور سند ہوتا ہے اس کی اطاعت ان کے زمانہ کی عورتوں پر فرض ہوتی ہے اور وہ صرف دو ہیں: جناب مریم سلام اللہ، مادر عیسیٰ علیہ السلام۔ اور جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا۔ اس کے علاوہ کسی اور عورت کو بتول یا حجت خدا کہنے کی شرعاً اجازت نہیں۔ جناب زینب، جناب ام کلثوم، جناب رباب، جناب رقیہ سلام اللہ علیہن و دیگر مستورات شریکۃ الحسین

اہل بیت سلام اللہ علیہم اگرچہ زہد و تقویٰ، صلاح و رشد، اخلاص اور اعمال صالحہ کی پابندی کی بنا پر اس عالی مرتبہ اور رفیع درجہ پر جائز تھیں کہ انہوں نے تمام زندگی میں کوئی گناہ نہیں کیا۔ عبادت و طاعت، نہ کبھی غفلت

نہیں کی۔ کسی نیک عمل کو ترک نہیں کیا اور کسی ناپسندیدہ فعل کا ارتکاب نہیں کیا۔ اللہ، رسول اور امام کی مکمل تابع فرمان تھیں۔ خصوصاً ان مستورات ہاشمیہ سلام اللہ علیہن کے وہ کارنامے جو انہوں نے میدانِ کربلا اور کوفہ و شام صبر و رضا کا پیکر اور ایثار و قربانی کا مجسمہ بن کر انجام دیئے۔ مستورات عالم میں ان کی مثال نہیں اور زنانِ ہر زمانہ ان کی قربانیوں کی مرہونِ منت ہیں۔

تاہم درجہ عصمت میں جناب سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء کے برابر نہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی بتول نہیں تاہم ان کی طہارت و تقویٰ اور عظمتِ کردار میں کوئی شک نہیں۔

حضرت ابوطالب علیہ السلام

جناب والد ماجد حضرت امیر علیہ السلام حضرت ابوطالب پکے مومن، متقی، صالح حامی دین مبین اور ناصر رسول صادق امین ہیں۔ بعض لوگوں نے جناب امیر علیہ السلام سے بغض و عناد کی بناء پر ان کے ایمان سے انکار کیا ہے۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔ وہ پکے مومن ہیں۔ ان کی حفاظت و نصرت اسلام تمام معتبر کتابوں میں مذکور ہے۔ مگر وہ نبی نہیں امام نہیں اور معصوم نہیں۔ اندیشہ ہے کہ بعض محب افراطِ محبت میں حد سے تجاوز نہ کر جائیں۔

تبرا و لعن طعن

تبرا برائت سے نکلا ہے: جس کا مطلب ہے بری ہونا، بیزار ہونا، الگ ہونا
تبرا ایک فطری، عادی اور مذہبی عمل ہے جو ہر زمانہ میں معمول بہ رہا۔ انسان فطرتاً
ہر اس شخص سے الگ رہتا ہے جو اس کے مزاج اور عادات کے خلاف ہے۔ اور
ہر دشمن سے بیزار رہتا ہے اور ہر مخالف سے نفرت کرتا ہے۔

مذہب شیعہ میں ہر اس شخص سے نفرت و بیزاری واجب ہے جو اللہ اس
کے رسول اور رسول اہل بیت و ائمہ علیہم السلام کا دشمن ہے۔ انہیں اچھا نہیں سمجھتا
نظریاتی طور پر ان کے خلاف ہے اور ان کو برحق نہیں تسلیم کرتا یا اہل بیت علیہم
السلام کو اذیت پہنچاتا رہا۔

اسی طرح باطل ائمہ جو دین حق کے خلاف اور صراط مستقیم سے ہٹا کر لوگوں
کو غلط راہ پر چلاتے ہیں۔ ان سے بیزاری واجب ہے۔

شیعوں کا معمول اور نظریہ یہ ہے کہ جو لوگ اہل بیت علیہم السلام کے خلاف
رہے خواہ وہ عام مسلمانوں کی نظروں میں اصحاب قرار دیئے جائیں یا تابعین تصور
کئے جائیں۔ ان سے اسلامی تعلیمات اور مذہبی ہدایات نہیں حاصل کرتے۔ اسی
طرح وہ محدثین جنہوں نے احادیث کی بہت بڑی ضخیم کتابیں تالیف کیں۔ لیکن ائمہ
اہل بیت علیہم السلام سے ان کو خصوصی واسطہ و تعلق نہیں اور ان کی محبت اور
دینی عظمت ان کے دلوں میں نہیں رہی۔ شیعہ ان سے احادیث بھی نہیں اخذ کرتے
اور نہ ان کی مرویات پر اعتماد کرتے ہیں۔ کیونکہ بعد جناب رسالتمآب صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم اسلامی مرکزی حیثیت اور دینی مرجعیت اہل بیت علیہم السلام کو حاصل
ہے۔ اور بعد از رسول کریم وہی سند اور حجت ہیں لہٰذا ان کے خلاف چلنے والا

خواہ صحابی یا تابعی محدث ہو یا فقیہ اہل بیت علیہم السلام کی مرکزیت اور مرجعیت کا قائل نہیں تو وہ راہِ راست سے دُور ہے۔ اس واسطے اس سے علیحدگی ضرور ہے۔

اسی طرح ہر وہ فقیہ اور امام فقہ جس کا مسلک جناب امام جعفر صادق علیہ السلام کے خلاف رہا اور اہل بیت علیہم السلام کے مطابق نہیں ان سے بھی علیحدگی ضروری ہے اور مسائل فقہ میں ان سے پرہیز واجب ہے۔ کیونکہ اسلام میں جناب امام صادق علیہ السلام سند اور حجت ہیں اور ان کے خلاف چلنے والے ان کی مخالفت کرنے والے غیر مستند اور غیر معتبر ہیں۔ لہذا ان کے مسائل سے بھی احتراز اور اجتناب لازم ہے۔

یہ اصول و معمول شیعہ ہے اور یہ عقلاً صحیح و درست ہے۔ کیونکہ کسی ایک مسلک اور مذہب سے وابستہ شخص دوسرے مذہب سے لازماً اجتناب کرتا ہے۔ ورنہ اس کی وابستگی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کسی پارٹی و جماعت سے منسلک آدمی دوسری اس کے خلاف پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا۔ اور اپنی پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹیوں سے وفاداری ظاہر نہیں کر سکتا۔ نہ ان کی حمایت کر سکتا ہے ورنہ پارٹی سے خارج کر دیا جائے گا۔

حضرات! یہ ہے تبرا کا مقصد جو میں نے بیان کیا ہے اور یہی معمول شیعہ ہے۔ لیکن سب و شتم اور دشنام طرازی یہ مذہب شیعہ میں جائز نہیں، نہ اسلام میں اس کی اجازت ہے۔ قرآنی تعلیمات میں دشنام حرام ہے۔ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ سورہ انعام۔ آیت ۱۰۸۔ ان لوگوں کو گالیاں نہ دو جن کی کفار و مشرکین پرستش کرتے ہیں ورنہ وہ مشرک لوگ تمہارے سچے خدا کو بے سوچے سمجھے گالیاں دینے لگیں گے۔

جنگ صفین کے موقع پر جناب امیر علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو اہل شام کو دشنام دہی سے منع فرمایا، آپ کا ارشاد ہے:۔ اِنِّيْ اَكْرَهُ لَكُمْ اَنْ تَكُوْنُوْا سَبَّابِيْنَ۔ میں ناپسند کرتا ہوں کہ آپ گالیاں دینے لگیں وَ لٰكِنَّكُمْ مَكَانَ سَبِّكُمْ

اِیَّاھُمْ اَللّٰھُمَّ احْقِنْ دِمَاءَ نَا وَ دِمَاءَ ھُمْ وَ اَصْلِحْ ذَاتَ بَیْنِنَا وَ بَیْنِھِمْ وَاھْدِھِمْ مِنْ ضَلَالَتِھِمْ حَتّٰی یَعْرِفَ الْحَقَّ مَنْ جَھِلَہٗ اہ۔

لیکن تم سب وشتم کی جگہ یہ جملے کہو اے اللہ ہمارے اور ان کے خون محفوظ رکھ ہمیں خون ریزی سے بچا ہمارے اور ان کے درمیان حق کے ساتھ مصالحت کر اور ان کو گمراہی سے نکال کر راہ حق پر چلا تاکہ وہ شخص جو حق سے جاہل ہے معرفت حق حاصل کرلے اور وہ لوگ گمراہی اور عداوت سے باز آئیں۔

یہ تو ہے سب وشتم کا معاملہ جسے ہم "گالی" کہتے ہیں اسلامی اخلاق اس کی اجازت نہیں دیتے۔

لعنت کا جواز: لیکن جہاں تک لعنت کا تعلق ہے۔ یہ سب وشتم نہیں یہ گالی نہیں۔ یہ ایک بددعا ہے جو ستائے ہوئے درور سیدہ اور مظلوم انسان کے دل کی آہ ہوتی ہے اور لعنت کے بددعائیہ کلمات کی صورت میں زبان سے نکلتی ہے۔ یہ ایک غبار خاطر ہوتا ہے جو مظلوم بے قرار ہو کر تشفی کے لئے نکالتا ہے۔ لَا یُحِبُّ الْجَھْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ اللہ تعالٰی بلند آواز اور اونچی صدا سے برائی بیان کرنے کو پسند نہیں کرتا سوائے مظلوم کے کہ مظلوم بلند آواز سے ظالم کی شکایت کر سکتا ہے اور اسے ہانک پکار کر بددعا دے سکتا ہے۔ پارہ ۴ آیت اول۔

لعنت ایک بددعا ہے جس کا معنی ہے رحمت سے دور کرنا۔ کمزور مظلوم اور ناتواں شخص ظالم جابر اور توانا جائر سے انتقام تو لے نہیں سکتا۔ صرف بددعا کی صورت میں وہ دل کی بھڑاس نکال سکتا ہے۔ اور یہ اس کی صحت جسمانی اور تندرستی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ورنہ دل کی گھٹن اور اندر ہی اندر اس کا غم و غصہ اس کی بیماری کا سبب بن سکتا ہے۔ اسی واسطے خالق علیم اور مالک حکیم نے مظلوم کو بددعا کی اجازت دی ہے۔

لعنت ایک ایسا فعل ہے جس کا فاعل خود خدا ہے اور اپنے ساتھ اس نے

ملائکہ اور برگزیدہ انسانوں کو بھی شامل کیا ہے۔ لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ، لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ کے جملے جا بجا قرآن میں مذکور ہیں۔ مزید برآں اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَةُ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ہ سورہ بقرہ۔ پارہ ۲۔ آیت ۱۵۶۔ بے شک وہ لوگ جو کافر ہوئے اور کفر کی حالت میں مرے اُن پر خدا کی لعنت اور فرشتوں کی لعنت اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔

لیکن شیعوں کو لعنت کرتے وقت یہ سوچ سمجھ لینا چاہیئے کہ جس پر ہم لعنت کر رہے ہیں واقعی وہ لعنت کا مستحق بھی ہے؟ بے شک دشمنانِ خدا و رسول و دشمنانِ اہلِ بیت و ائمہ علیہم السلام دشمنانِ دین دشمنانِ مقصدِ شہادت حسین علیہ السلام مستحقین لعنت ہیں۔ لیکن اکثر لعنت کے وقت حضراتِ شیعہ کی زبانیں بے لگام ہو جاتی ہیں اور عقل و فہم سے عاری ہو جاتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ کس پر لعنت کر رہے ہیں اور الفاظ کا ہیر پھیر کر کے محبت اہلِ بیت کا مکر و فریب کا ساتھ چکر دے کر کون مداری لعنت کرا رہا ہے۔ لعنت کا رُخ بجائے دشمنانِ اہلِ بیت و دشمنانِ دین کے بعض اوقات حقیقی محبان اہلِ بیت اور سچے دینداروں کی طرف بھی پھیر لیتے ہیں اور اپنے ناقص گمان باطل خیال اور جاہلانہ اعتقاد کے مطابق ان مقدس شخصیتوں پر بھی بے تحاشا لعنت کے تحفے بھیجتے ہیں جو دین کے سچے خادم علوم آلِ محمد کے ناشر ہدایات دین کے محافظ اور حق گو، حق بین اور حق شناس صاحبان علم و معرفت ہیں۔

اور سٹیج پر ایک ذاکر و واعظ کے روپ میں جہالت کے ماحول میں پلا ہوا رضاء خالق کو ٹھکرا کر رضائے مخلوق کا طلب گار آخرت کو چھوڑ کر دنیا کا دلدادہ حقائق سے بے بہرہ واقعات سے کورا بے دھڑک اور نڈر ہو کر اپنے ہی مذہب کے علماء کرام، ائمہ مساجد، مدرسین مدارس دینیہ اور صالح اور اہل تقویٰ اہلِ حق پر سادہ لوح عوام شیعہ اور سامعین مجالس سے بھرپور لعنت کراتا ہے۔

اور جو سیدھے سادے عوام شیعہ ثواب حاصل کرنے کے لئے شریک مجالس ہوتے ان کے گلے میں بجائے ثواب کے وہ لعنت کا طوق ڈالتا ہے۔

شیعو! ایسا مداری قسم کا واعظ و ذاکر آپ کی سادگی و کم علمی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سنگین جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ دشمن دین آپ کو غلط استعمال کرتا ہے۔ اپنے آپ کو سچا محب بلند اعتقاد اور اونچی باتیں بیان کرنے والا ظاہر کرکے آپ کے ایمان کو خراب کرتا ہے۔

شیعو! ایسے لوگوں سے جو خوشنودیٔ خدا کی بجائے خوشنودیٔ مخلوق چاہتے ہیں، حق کو چھپاتے ہیں، دنیا کے پجاری اور دین کے بیوپاری ہیں ہوشیار رہیں۔ اور ان کے پھندے میں نہ پھنسیں۔ یاد رکھو کہ ولاء علی اور سچی محبت اہلِ بیتِ رسول علیہم السلام رکھنے والا مستحق لعنت نہیں وہ تو مستوجب رحمت ہے۔

لعنت بھیجنے کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھیں۔

- یہ تسلی کرلیں کہ جس پر لعنت کر رہے ہیں وہ واقعی دشمن خدا اور دشمن رسول دشمن اہلِ بیت اور دشمن دین ہے۔
- جنہوں نے اہلِ بیت رسول علیہم السلام پر ظلم کیا ان کو قتل کیا ان کو قید کیا ان کا حق چھینا ان کو اذیتیں پہنچائیں۔ ان کا مقابلہ کیا، ان سے لڑائی کی بغاوت رکھی، ان کا مرتبہ و مقام چھینا یا چھیننے کی کوشش کی بے شک شیعہ مذہب کے نزدیک وہ مستحق لعنت ہیں اور ان سے نفرت و بیزاری ضروری ہے۔
- ان کے علاوہ اگر کسی شخص پر آپ لعنت کریں گے خصوصاً جب وہ جناب امیر علیہ السلام کو خلیفہ بلا فصل ولی اللہ ماننے والا ہو اور ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کی امامت وعصمت کا قائل ہو۔ اصولِ دین و فروعِ دین شیعہ مسلک کے مطابق مانتا ہو تو کسی مداری کے کہنے پر آپ لعنت کریں گے تو وہ اس پر نہیں جائے گی۔ بلکہ وہاں سے لوٹ کر خود لعنت کرنے والے کے منہ پر پڑے گی۔ اس واسطے سوچ سمجھ کر لعنت کیا کریں۔ کیونکہ جس کو آپ لعنت کا تحفہ بھیج رہے ہیں اگر وہ لعنت کا مستحق نہ ہوا

وہ تحفہ اُسے مل جائے گا اور اگر وہ مستحق نہ ہُوا تو وُہ تحفہ پلٹ کر آپ کے پاس پہنچے گا۔ لہٰذا غیر مستحق پر آپ جس قدر لعنت کریں گے وہ آپ ہی پر آئے گی۔

آپ اپنے نفسوں کا جائزہ لیں اپنی آپ پڑتال کریں کہ آپ میں کوئی ایسی برائی تو نہیں جو لعنت کو آپ کی طرف کھینچے۔ اور لعنت کرتے وقت خود آپ بھی حصہ دار بن جائیں اس بدی کی وجہ سے خود آپ بھی مستحقین لعنت میں شامل ہوں۔

یاد رکھو کہ خدا کو تو لعنت بھیجنے کا حق ہے۔ کیونکہ وہ ہر عیب و نقص اور ہر بدی و خرابی سے پاک و منزہ ہے۔ اسے حق ہے کہ کاذب پر لعنت بھیجے کیونکہ وہ خود کذب سے پاک ہے۔ اسے حق ہے کہ وہ ظالم پر لعنت بھیجے کیونکہ وُہ خود ظلم سے پاک ہے، لیکن آپ جب کاذب پر لعنت بھیجیں گے تو یہ خیال کرلیں کہ آپ میں کذب تو نہیں اگر خود آپ میں بھی کذب پایا گیا ہے۔ تو لعنت کے حصہ دار بن جائیں گے اسی طرح آپ ظالم پر اور غاصب پر لعنت کریں گے تو اگر آپ خود ظلم اور غصب ایسے گناہ سے پاک ہیں تو آپ کو حق ہے ان پر لعنت کرنے کا۔ لیکن اگر خود آپ کے اندر ظلم و غصب ایسے گناہ موجود ہوں تو آپ خود اپنی لعنت کے حق دار بن جائیں گے اور کاذبین، ظالمین، غاصبین میں شامل ہو کر اپنی و غیروں کی لعنت وصول کریں گے۔ پھر جتنی ہی زیادہ لعنت کریں گے اتنا ہی زیادہ حصہ پائیں گے۔

• اگر آپ نام لے کر لعنت کریں گے تو اگر وہ آپ کی لعنت کا مستحق ہوا تو وہیں رہ جائے گی ورنہ لوٹ کر لعنت کرنے والے کے منہ پر پڑے گی اور اس کی گردن کا طوق بنے گی اور اگر اوصاف کے ساتھ لعنت کریں گے نام نہیں لیں گے۔

مثلاً کاذب غاصب ظالم فاسق تو اگر آپ ان بُری صفات اور مذموم اوصاف سے پاک ہیں تو آپ لعنت کرسکتے ہیں اور خود اس لعنت سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن اگر آپ خود بھی ان برائیوں سے موصوف ہیں تو بقدر برائی آپ کو لعنت کا حصہ بھی نصیب ہو گا۔ لہٰذا لعنت کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیں شعبدہ باز واعظوں اور بازی گر ذاکروں کے فریب میں نہ آئیں۔ روز قیامت وہ لوگ

آپ کو چھوڑ جائیں گے آپ کے ذمہ دار نہ بنیں گے۔

- کچھ آداب شہریت اور قواعد معاشرہ بھی ہوتے ہیں جو باہم رواداری آپس میں میل جول اور حقوق تمدن کی پاسداری کی تلقین کرتے ہیں مذہب کا مقام اپنا اور معاشرہ کا مقام اپنا ہے۔ جس ملک میں مختلف قومیں آباد ہوں اور مختلف و متعدد مذاہب کے اشخاص بستے ہوں اگر ایک دوسرے کا احترام نہ کریں اور باہمی رواداری کے روابط قائم نہ کریں تو وہ ملک فساد و فتنہ کی آماجگاہ بن جائے گا۔

اور جنگ وجدال کی آگ سارے ملک اور تمام قوموں کو بھسم کرکے رکھ دے گی اور پھر اس کا ذمہ دار مذہب ٹھیرایا جائے گا۔ جس طرح کہ اکثر ملکوں میں اس قسم کے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ اختلاف مذہب کی چنگاری نے جس طرح خرمن اتحاد کو جلایا اور آبادیوں کو ویرانیوں میں تبدیل کیا تاریخ بغداد شاہد ہے۔ اور آج لبنان اس کی بھینٹ چڑھا ہوا ہے۔

مذہب اخلاق عالیہ کا معلم اور اقدار انسانیت کا محافظ ہے۔ یہ امن و سلامتی کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن اس مذہب کو تباہی و بربادی اور فتنہ و فساد کا ذریعہ بنایا گیا اور بنایا جاتا ہے اور بنایا جا رہا ہے۔

مذہب کو اہلِ مذہب نے مجموعی مفاد اور قومی تحفظ کے لئے بہت کم استعمال کیا ہے۔ ذاتی اغراض اور ذاتی مفاد کے لئے زیادہ تر استعمال کیا۔ آج ہر فرقہ میں وہ مقرر و واعظ زیادہ مقبول ہے جو ہر وعظ اور ہر مجلس میں دوسرے فرقہ کے خلاف سامعین کو ابھارتا اور اشتعال دلاتا ہے۔ اور اس فرقہ کے رہنماؤں کے خلاف غیر مہذب اور ناشائستہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔

دلائل اور ثبوت کے ساتھ اپنے مدعا کو ثابت کرنا اپنے مسلک کی حقانیت کو شائستہ انداز میں بیان کرنا اور مخالف فریق کے دلائل کو اپنے صداقت بھرے دلائل سے توڑنا حدود احترام کے اندر رہتے ہوئے تو حق خوبی ہے اور ہر فرقہ کا بنیادی حق ہے۔ آخر [illegible] تبلیغ پر پابندی تو نہیں ہے۔ لیکن کسی فرقہ کے

خلاف گندی زبان استعمال کرنا۔ طنز و تشنیع اور لعن و طعن کا بے جا استعمال کرنا نفرت کے جذبات ابھارنا کسی صورت میں مستحسن نہیں بلکہ یہ ایک مذموم عمل ہے جو تبلیغ کی تاثیر میں حائل ہو کر موجب فتنہ و فساد ہوتا ہے اور ایک نیک مذہب اپنے مقصد میں ناکام ہو کر بدنام ہو جاتا ہے۔

فرقہ حقہ اور مسلک صادق کے پیرو شیعوں کو خصوصی طور پر اس امر کی پابندی کرنا چاہیئے کیونکہ جن ائمہ علیہم السلام کی اتباع کا یہ ادعا کرتے ہیں۔ ان کے مکارم اخلاق حسن معاشرہ اور اقدار انسانیت کے تحفظ کی شہادت خود ان کے دشمن محارب اور قاتل بھی دیتے رہے۔

اپنے مذہب کے ائمہ علیہم السلام کی سیرت اور نمونۂ عمل کو سامنے رکھیں ان کی تاریخ پڑھیں ان کی سیرت پڑھیں، اپنے مخالفین کے ساتھ ان کا کیا سلوک رہا اور آداب معاشرہ کس قسم کے رہے۔ کوئی شخص اپنے مذہب اور خیالات کو غلط نہیں سمجھتا ان کے تحفظ اور اشاعت کا خواہشمند بھی ہوتا ہے لیکن جس طرح کہ ایک فریق اپنے لئے دوسرے فریق کی گندی زبان اور لعن و طعن کو گوارا نہیں کرتا اسی طرح اسے چاہیئے کہ خود بھی ایسی مذموم حرکت نہ کرے۔

مساجد اور امام بارگاہوں کو لغویات و بیہودہ گالیوں طعن و تشنیع کا اکھاڑہ نہ بنانا چاہیئے۔ خود شیعوں کو صبر و تحمل کا عادی بن کر حسن اخلاق کا نمونہ پیش کرنا چاہیئے۔

کم علم مولویوں اور جاہل ذاکروں کے پاس علمی تحقیقی، تبلیغی، صحیح تاریخی مواد کم ہوتا ہے۔ اور غلو اور طعن و تشنیع سے وہ مواعظ و مجالس کا وقت پورا کرتے ہیں۔

کسی مسلک کے پیشوا اور کسی مذہب کے راہنما کو علی الاعلان خصوصاً ان کے ماننے والوں کے سامنے برا کہنا۔ خواہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہوں۔ رواداری، حسن معاشرہ اور اخلاق کریمانہ کے سخت خلاف ہے۔ یونہی سمجھ لینا چاہیئے کہ کہ اگر وہ آپ کے ائمہ کے خلاف کوئی غیر مہذب اور ناشائستہ کلمہ استعمال کریں

تو آپ کو کس قدر ناگوار گزرے گا ہاں آپ اس آیت کریمہ پر عمل کریں۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ
هِیَ اَحْسَنُ۔ اِنَّ رَبَّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝

بعض اوقات ان آداب زندگی اور اُن کے ان افعال پر طعن وطنز کیا جاتا ہے
جو خود ہمارے مذہب میں مستحسن اور ہمارے ائمہ علیہم السلام کی سیرت طیبہ کا جزو اور
نمونہ ہیں۔ مثلاً ڈاڑھی۔ ہمارے جاہل شیعہ اور جاہل ذاکر و واعظ اغیار کے مولویوں کی
ڈاڑھی کو اپنے مطاعن کا نشانہ بناتے ہیں۔ کیا وہ ڈاڑھی اسلام میں سنت نہیں؟
انبیاء علیہم السلام اور ائمہ طاہرین سلام اللہ علیہم ڈاڑھی نہیں رکھتے تھے؟ آپ کے
علماء عراق و ایران رضوان اللہ علیہم کی ریشیں دراز نہیں کیا اسلام کا حکم نہیں؟ تو
پھر طعن اور طنز یہ کیوں؟ کیا اگر ایک اسلامی خوبی غیر اپنا لیں اور آپ بدقسمتی
سے محروم رہ جائیں تو کیا وہ اسلامی خوبی آپ کے طعنوں کا ہدف بن جائے گی؟
آپ اغیار کے ان افعال و آداب کا مذاق اڑائیں جو قرآن وحدیث کے
خلاف اور ائمہ علیہم السلام کی سیرت کے برعکس ہوں۔

اسی طرح ان اعمال حسنہ پر بھی زبان درازی کی جاتی ہے جو خود مذہب شیعہ
میں مستحب و سنت ہیں، لیکن علماء اہل سنت کا معمول بھی ہیں۔ مثلاً پنجابی زبان
میں ستھن (شلوار) چھوٹی۔ ستھن وچ سوٹی۔ گردن موٹی۔ کیا شلوار کا کوتاہ اور ہاتھ
میں عصا ہونا، حرام و مکروہ ہے؟ مکروہ نہیں بلکہ مستحب ہے اور سنت سے آپ
اپنے مذہب کا مطالعہ کریں، سیرت طیبہ پڑھیں۔ اسلامی زندگی کے آ[illegible] ملاحظہ
کریں۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ شلوار اور تہبند وغیرہ کا ٹخنوں سے او[illegible] ہونا
اور ہاتھ میں عصا کا ہونا خود آپ کے ہاں مستحب اور سنت ہے۔ جو چیز آپ
کے مذہب میں مستحب ہے اگر غیر اس پر عمل کرے تو آپ کو [illegible] دھ ہے؟

دراصل ایسی سنت و مستحب چیزوں کا مذاق اڑانا اُن مولویوں کی توہین اور اسلامی زندگی کے آداب کا مذاق اڑانا ہے۔

نعرۂ حیدری

جناب امیر علیہ السلام کا اسم مبارک باعثِ برکت اور عجیب و غریب اثرات رکھتا ہے۔ اس نام کا نعرہ بلند کرنا علامت ایمان، دل کی پاکیزگی اور ثواب دنیا و آخرت کا ثواب ہے۔ لیکن زمانۂ حال میں ایک خود ساختہ روایت بنائی گئی ہے۔ کہ جناب امیر علیہ السلام کا نعرہ یعنی "یا علی" بلند آواز سے کہنا "ختم قرآن کے برابر ثواب رکھتا ہے۔ ثواب تو ہے لیکن ختم قرآن کے برابر اس تول ماپ اور وزن کے متعلق کوئی ثبوت اور دلیل نہیں۔ کوئی بات بغیر دلیل و ثبوت کے یقینی نہیں ہوتی بعض لوگ جناب رسالت مآب کی طرف یہ بات منسوب کرتے ہیں مگر کسی شیعہ کی معتبر کتاب تفسیر حدیث، تاریخ، اخلاق کی کتابوں میں یہ روایت نہیں۔ ان کی طرف یہ نسبت دروغ ہے۔ اور بات کرنے والا کاذب اور مفتری ہے۔

یہ مثل اکاذیب" کی ریاکاری کی پیداوار ہے کہ ذاکر و واعظ صرف سامعین کو خوش کرنے کے لئے غلو کرتے ہیں اور سامعین کے جذبۂ محبت، بے مروت، دلیری اور بے جا خاموشی سے ناجائز مفاد حاصل کرتے ہیں۔ اگر سامعین یہ جرأت کر کے پوچھیں مجلس کے فوراً بعد پوچھیں اور ہر جگہ پوچھیں کہ یہ روایت کس معتبر کتاب میں ہے تو کاروباری واعظ و ذاکر ایسی ضعیف خود ساختہ اور غلط روایات کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔

اوصاف شیعہ

شیعہ گروہ اور تابعین کو کہتے ہیں۔ کوئی گروہ اور جماعت جس، امام، قائد اور لیڈر کی طرف منسوب ہو اس کی ہدایات سنتی اور اس پر عمل کرنے کی کوشش

کرتی ہے اور اپنے اقوال و اعمال سے ثابت کرتی ہے کہ ہم فلاں رہنما کی جماعت ہیں اور ان کے پیروکار ہیں۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ سیاسی جماعتوں میں اگر کوئی شخص اپنے سیاسی رہنما کی ہدایات کو ٹھکرا دیتا ہے۔ اس کی ہدایات پر عمل نہیں کرتا اس جماعت کے منشور کی پابندی نہیں کرتا اس کے نصب العین کے خلاف چلتا ہے تو اس کو جماعت سے نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح آپ سمجھ لیں کہ آپ جناب امیرالمومنین علیہ السلام اور ان کی معصوم اولاد ائمہ طاہرین علیہم السلام کے شیعہ ہیں۔ ان کے پیروکار ہیں ان کی جماعت اور ان کے گروہ میں شامل ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ پس سوچ لیں اپنے آپ کا بغور مطالعہ کریں۔ کہ آپ کہاں تک ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں ان کے نصب العین کی کتنی پابندی کرتے ہیں اور اپنے عمل سے کہاں تک ثابت کرتے ہیں کہ ہم ان کے شیعہ ہیں اور ان کے ماننے والے ہیں؟ یاد رکھیں کہ روزِ قیامت اقوال کا دفتر پیش نہیں ہوگا اعمال پیش ہوں گے زبانی باتیں کوئی وزن نہیں رکھتیں قابل وزن اعمال ہیں۔

مومن اور شیعہ بننے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں: ۱۔ برائیوں سے بچنا، گناہ کی میل سے صفائی اور نیک اعمال کے ساتھ اپنے آپ کو آراستہ کرنا۔ برائیوں سے دور رہنے کا نام تقویٰ ہے۔ اور تقویٰ کی صفت سے موصوف ہونے والے کو متقی کہا جاتا ہے۔ نیک عمل کا نام ہے عمل صالح اور اس وصف سے متصف شخص کو صالح کہتے ہیں۔ خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں ان لوگوں کی تعریف کی ہے۔ جو متقین صالحین ہیں۔

مومن کون ہے مومن کی کیا صفات ہیں۔ ہم قرآن مجید سے مومنین کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔ آپ پڑھیں اور غور کریں کہ یہ اوصاف آپ میں موجود ہیں؟ اگر موجود نہیں تو انہیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں تاکہ روزِ قیامت آپ فلاح نجات پا جائیں۔ اوصاف مومنین ملاحظہ فرمائیں، ارشاد ہوتا ہے:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ اَلَّذِيْنَ هُمْ

فِی صَلوٰتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکوٰةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ سورہ مومنون۔ آیت ۱ تا ۱۱

ترجمہ: وہ مومنین کامیاب ہو گئے اور نجات پا گئے جو اپنی نمازوں میں عاجزی وانکساری کرتے ہیں وہ لوگ جو بیہودہ کاموں سے منہ پھیر لیتے ہیں اور وہ لوگ جو باقاعدگی سے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حرام سے حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے کہ وہ ان کے لئے اس کام کے لئے حلال ہیں اور اس بارے میں وہ قابل ملامت نہیں اور جو شخص ان کے علاوہ شہوت پرستی کرے، وہ حدود شریعت سے تجاوز کرنے والا ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد کا لحاظ کرتے ہیں اور وہ لوگ جو نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو بہشت بریں کا حصہ پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔